فہرستِ مضامینِ زندگانیِ بے نظیر

صفحہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچۂ سوانح عمریِ نظیر

اللہ اللہ! وہ بھی کیا دن تھے۔ میری صبحِ زندگانی تھی اور مہرِ پدری کا آغازِ طلوع۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور دھیمی دھیمی شعاعیں پھیل رہی تھیں۔ تفہیم کے جھکولوں سے شاخ و برگ پڑے جھوم رہے تھے۔ تعلیم کے دریچے سے میں گلستاں بوستاں کی سیر کر رہا تھا۔ بیل بوٹوں سے آنکھوں کو تازگی حاصل ہوتی تھی اور پھول تمپیوں سے دماغ معطر ہوتا تھا۔ اِسی عالم میں جنابِ والد ماجد کے گلبنِ حافظہ پر کسی روز نظیر کا بلبلِ طبع چہکا۔ نغمہ یہ تھا۔

گر شال اُڑھائی تو اُسی شال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

میٹھے سُر اور پیارے بول۔ وجد ایک امرِ ضروری تھا۔ کچھ کہہ نہیں سکتا کہ اِس نغمے نے کیا مزہ دیا۔ وہ صدا آج تک کانوں میں گونج رہی ہے اور خالی از لطف نہیں۔ بلبل تو چہک کر اُڑ گیا مگر بول اب تک دل میں گڑی ہوئی ہے۔

یاد پڑتا ہے اُنھیں دنوں میں یہ زمزمہ بھی سُننے میں آیا تھا۔

* غالباً یہ ۱۸۶۵ء یا ۱۸۶۶ء کا واقعہ ہے۔

عاشق ہی تو مولیٰ کو ہر اک رنگ میں پہچان

اور شاید یہ برڈن آ وسونگ بھی :-

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ایک گلابی ورق پر نستعلیق ترکیبوں سے یہ خط و خال بھی سُرمہ کشِ نظر ہوئے تھے۔

خدا اگر مجھ گدا کو سلطنت بخشے تو ای یارو
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را
نظیر اِس طرح سے تضمین کر تو مصرعِ حافظ
کہ بر نظمِ تو افشاند فلک عقدِ ثریا را

مقبولیت نے جو تخم مزرعِ دل میں نصب کیا تھا مدتوں نسیان اور تغافل کے تپھر کے نیچے دبا رہا۔ جب ایڈیٹری نے میرے لیے کرسی خالی کی تو وہاں بعض عنایت گستر ہاتھوں نے اُس تپھر کو ہٹایا اور اُس تخم کو از سرِ نو پھولنے کا موقع ہاتھ آیا۔

اخبار جس کا میں اڈیٹر تھا ہوں کہ ہندوستان کے انگریزی دارالسلطنۃ سے نکلتا تھا اور بادشاہ کمپنی کے عہد میں لہذا دارالسلطنۃ کہلاتا بھی تھا۔ اس کے مالک معمولی تعلیم کے پنجابی تھے۔ پڑھے لکھوں کی صحبت میں بیٹھتے اُٹھتے چشمِ

لہ برڈن آ وسونگ انگریزی میں آشنائی کو کہتے ہیں۔ چونکہ ٹیپ بھی آشنائی کا کام دیتی ہی لہذا اُس پر بھی اِس کا اطلاق ہو سکتا ہی۔ یہ انگریزی صنعت اس مقام پر بغرضِ لطفِ ایہام لائی گئی ہی۔

عہ [illegible] اسباب۔ مال و متاع۔ دھن دولت۔ جائداد۔

سہ بنجارا۔ اناج کی سوداگری کرنے والا۔ ایک قوم کا نام جو غلے کی سوداگری کرتی ہی۔ سوداگر۔ بیوپاری۔ مثل ہے۔ سو بنجارا۔ رکھے سو ہتیارا۔

معاملین ۱۸۳۱ء و ۱۸۳۱ء

تشریف رکھتے تھے۔ احمد علی خاں نے میرزا نوازش علی بیگ کا نشان[‡] بتایا جو میاں نظیر کی نواسی کے اکلوتے داماد ہیں۔ میرزا نوازش علی بیگ سے معلوم[+] ہوا کہ میاں نظیر کی نواسی ابھی جیتی جاگتی ہیں اور میاں نظیر کے بہت سے حالات اُن کو معلوم ہیں۔ غرض یوں سلسلۂ سلسلہ اصل چشمۂ مقصود تک پہنچا، اور پہنچا تو سیراب بھی ہوا۔

جون ۱۹۲۰ء میں ایک ضرورت سے میں آگرے گیا ہوا تھا۔ اُسی ہلنے میں، بیک کرشمہ دو کار، میرزا نوازش علی بیگ کی نوازش سے بھی فائدہ اُٹھایا۔ اُن کی خوش دامن سے بھی مل کر خوش خوش دامنِ مقصود بھر لایا۔ میاں نظیر کے مزار کی بھی زیارت ہوئی۔ اُن کی غیر مشتہر تصانیف سے چار پانچ کتابیں بھی ہاتھ آئیں۔ میاں غلام محمد رہا ہنوز قیدِ حیات سے آزاد نہوے تھے، اُن سے بھی کچھ استفسارات رہے۔ استفسار کی یہ ابتدا تھی مگر پھر تو اس کا سلسلہ اس قدر بڑھا کہ جو شخص آگرے کی طرف کا ملتا اُسی سے کچھ نہ کچھ حالات دریافت کر لیتا۔ فقیر بھیک مانگنے آیا ہے۔ لب و لہجے سے آگرے کا معلوم ہوا۔ بٹھا کر اُسی سے کچھ باتیں پوچھ لیں۔ کوئی سیاح صاحب کتابیں بیچتے ہوے تشریف لائے ہیں۔ اکبر آباد کی بہت باتیں بیان کرتے ہیں۔ آکر اُنھی سے کچھ حقیقت دریافت کر لی۔ جب لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ میں اس قدر نظیر کے حالات کا جویا ہوں تو بعض اشخاص خود بے پوچھے بھی بتانے لگے۔

چوں کہ نظیر کے مزاج پر موزونی کے ساتھ مزاح بھی غالب تھی تو خاص اس پہلوے طبیعتِ انسانی کی تحقیق کے لیے اپنے زمانے کے بعض قدیم نمونۂ طباعی و ظرافت کی بھی مدتوں صحبت رکھی اور اُن کے اخلاق و عادات حرکات و سکنات کا برسوں دوربینِ تحقیق سے مشاہدہ کیا۔ غرض بقول سعدیؒ

تمتع زہر گوشۂ یافتم زہر خرمنے خوشۂ یافتم

---

‡ سب انسپکٹر لوہا منڈی۔ آگرہ۔

+ بذریعۂ مراسلۂ ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء

+ بذریعۂ خط و بالمشافہہ۔

ماخذ تو اس قدر قلیل مگر کتاب باعتبار مضامین خاصی عمرو عیار کی زنبیل! اسکا سارا بھید بند ہر دو لفظوں ہیں تفتیش اور تخییل ۔ تفتیش نے تخییل کو ابھارا تخییل نے تفتیش کو چمکایا۔ دونوں ملکر مضمون کو لے اڑیں ؎

واں پہنچی ہی فریاد کہ لپٹے نظر آئے
دُم دار ستارے، کئی، فریاد کی دُم میں

رُباعی

کیا اک تمہیں نور کی دکھائیں قمری
ہردم جو پڑی الاپتی ہی ٹھمری
شہباز کے ہاتھ میں وہ قمری ہی قلم
ٹھمری ہی نظیر کی سوانح عمری

اشتہار میں اس کتاب کا نام نظیر نامہ مشتہر ہوا تھا اس خیال سے کہ نظیر مشہور ناموں ہی سے ہی۔ مگر اتفاق سے بعض تاریخی نام ایسے عمدہ نکل آئے ہیں کہ اُن کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ تاریخ کہتی ہی۔ زندگانیِ بے نظیر۔ کہو۔ یا اکبر آباد کے نظیر کی سوانح عمری۔ اشتہار کہتا ہی نظیر نامہ سے بہتر کوئی نام نہیں۔ تجویز کش کش میں ہی۔ اشتہار اور تاریخ کی کش کش میں "دل آویز" بیچ بچاؤ کو اُٹھ کھڑا ہوا اور پانوٗ پڑ کر دونوں کو راضی کر گیا۔ اب چاہے "نظیر نامۂ دل آویز" کہہ لیجیے چاہے "زندگانیِ بے نظیر" چاہے "اکبر آباد کے نظیر کی سوانح عمری"۔ ایہام کا فتویٰ ہی:-

خیر الامور اوسطھا۔

اچھا یہی سہی۔

جام باغ۔ حیدرآباد دکن۔ ۹۶۰۸۰۲۰

دیباچہ طراز
محمد عبد الغفور شہباز

نظیر کی پیدایش

محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ ہو اور شہر میں رنگ رلیاں نہ منائی جائیں کوئی کہنے کی بات ہے۔ در و دیوار سے رنگ ٹپکتا تھا اور گلی گلی سے راگ اُبلتے تھے۔ لال قلعہ لالوں لال تھا اور چاندنی چوک مالا مال۔ لیکن عام قاعدۂ قُدرت کے مطابق اُس راگ رنگ کے زمانے میں بھی بعض گھر نوحہ و شیون سے خالی نہ تھے۔ ہر چند زمانہ بہت گزر گیا ہے مگر خیال کی دوربین آنکھوں سے ہم اب بھی دیکھتے ہیں کہ شہر کے کسی گوشے میں خوش وقت ہمسایوں سے گھرے ہوئے گھر میں دو نیک بختیں نہایت ملول بیٹھی ہیں اور رفع ملال کی کچھ نسوانی معصومانہ تدبیریں سوچ رہی ہیں۔ بڑی بی کی پیشانی اور بھنوؤں پر توہم نے ایک خاص کھنچاوٹ پیدا کر رکھی ہے۔ صاحبزادی کی آنکھیں گو اشک بار نہیں مگر پُرنم ضرور ہیں۔ غم کی تصویر کوئی نقاش اس سے بہتر کھینچ نہیں سکتا۔ نگاہ بارِ غم سے اُٹھتی نہیں۔ ہر وقت جُھکی ہی رہتی ہے۔ رنگت گو زرد نہیں ہے مگر پھیکی ضرور پڑ گئی ہے۔ خون آہستہ آہستہ جسم میں گھٹ رہا ہے۔ بعض وقت گزشتہ مصیبتیں یاد آکر دل کو بے چین کر دیتی ہیں۔ یکایک رنگ فق ہو جاتا ہے اور دفعتہً آنکھوں سے غم آلود مگر خوش نما آنسوؤں کا سلسلہ جاری ہو پڑتا ہے۔ عاشق زار ماں یہ منظر دیکھ نہیں سکتی۔ وہ بھی بلبلا اُٹھتی ہے اور پھر ساون بھادوں ملکر برسنے لگتے ہیں۔ بلکہ ع

یوں نہ برستے دیکھے ہوں گے کسی نے ساون بھادوں

لونڈی مامائیں یہ سماں دیکھ کر ہمدردی کے رومال لیے کر دوڑتی ہیں اور دل سوزی کے ہاتھ سر پر رکھ کر خیر خواہی سے آنسو پونچھتی ہیں۔ آنسو تھمتے ہی پاس پڑوس کے اور مصیبت مندوں کا ذکر چھڑ جاتا ہے اور جھاڑ پھونک اور دعا تعویذ کے تجربے بطور علاج بیان ہونے لگتے ہیں۔ مُلّا سیانوں درویشوں مجذوبوں کی زندہ کرامتیں ایک نہیں بیسیوں چشم دید شہادت کے ساتھ بڑے زور سے مذکور ہوتی ہیں۔ بوعلی قلندر اور نظام الدین اولیا اور قطب صاحب اور نصیر الدین چراغ دہلی اور شاہ سرمد کی اولاد بخشی کی نظیریں سیکڑوں پیش کی جاتی ہیں۔ خوش اعتقاد نیک بختیں پہلے بے اعتنائی سے سنتی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اُن کی توجہ اُدھر زیادہ مُڑنے لگتی ہے۔ پھر ہر بات وحی اور الہام کا رتبہ بہم پہنچاتی ہے اور آخر یہ ہوتا ہے کہ بڑی بی بڑے اصرار سے فرماتی ہیں کہ خدا کے لیے میری بچی کے لیے بھی کوئی تدبیر سوچو بلکہ ہو سکے تو آج ہی فلاں شاہ صاحب کے ہاں جاؤ اور اُن کو خدمت سے خوش آمد سے منت سے سماجت سے جس طرح بنے ہمارے حال پر مہربان کرو۔

یہ دو نیک بختیں جن کا ابھی ذکر ہوا گو اس وقت نہ ہوں مگر اب تو یقیناً نظیر کی ماں اور نانی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نظیر کی ماں کی اولادیں زندہ نہ رہتی تھیں۔ بارہ اولادیں ہوئیں اور بارھوں مر مر گئیں۔ دل کا ایک ناسور بہت ہوتا ہے۔ جب بارہ ہوں تو پھر اُس دل کے درد اور ٹیس کا کیا پوچھنا ہے۔ نسوانی تدبیریں زیادہ فوق العادہ اُمور سے متعلق ہیں۔ ماما دائیوں کے ذریعے سے ایسی تدبیریں ایک نہیں سیکڑوں کی گئیں مگر کوئی بکار آمد نہ ہوئی۔ تجسس کے سلسلے میں ایک بزرگ ایسے بھی ملے جنھوں نے ماما کی زبانی نظیر کی نانی کو کہلا بھیجا کہ لونڈی ماماؤں کو کیا بھیجتی ہے۔ کام چاہتی ہے تو داماد کو بھیج۔ محمد فاروق نام کے اعتبار سے جو کچھ ہوں مگر معمولی تعلیم کے آدمی تھے۔ بارہ اولادیں کھو چکے تھے۔ ایک معتقد علیہ اور مشارٌ الیہ فقیر کا جو یہ پیام سُنا سر کے بل دوڑے اور آنکھوں سے وہ پھول اُٹھا لائے جو فقیر نے اُن کو بنے گلشن کرامات سے عنایت کیے۔ یہ پھول گنتی میں پانچ تھے۔ فقیر کی ہدایت تھی کہ اُن کو سونگھ کر دریا میں ڈال دینا

اور جو کیفیت اِن پھولوں کی ہو پھر مجھ سے کہہ جانا۔ عقیدت میں شور بور جمنا کنارے پہنچے اور ایک خوشگوار تشویش کے ساتھ اُن پھولوں کو پانی میں پھینکا۔ ان میں سے صرف ایک پھول تو سیدھا پڑا باقی سب پٹ۔ یہ خبر لے کر پھر فقیر کے پاس پہنچے۔ فقیر نے بشارت دی کہ جا خوش ہو ایک لڑکا تیرا زندہ ہوگا زندہ رہے گا اور تیرے نام کو زندہ کرے گا۔ قابلیت اُس کی غنچے کی طرح شگفتہ ہوگی اور خوش بو اُس کی پھول کی طرح تمام پھیلے گی۔ حسنِ اتفاق یہ کہ اسی کے بعد آثارِ حمل بھی ظاہر ہوئے۔ عقیدت دو بالا ہوگئی۔ نویں مہینے میاں نظیر دبستانِ عدم سے مکتبِ ظہور میں آئے۔ چوں کہ کئی اولادوں کو مار کر ہوئے تھے۔ جُرم سنگین تھا۔ لہٰذا ناک کے ساتھ دونوں کان بھی چھیدے گئے۔ اس سزا پر معصوم آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ بطورِ عذرِ گناہ خوش تر از گناہ ناک میں بُلاق ڈالا گیا۔ کانوں میں دُر لٹکے۔ بُلاق نے نتھنوں سے سرگوشی شروع کی۔ دُر نے خدا جانے کانوں میں کیا پڑھ پھونکا۔ زینت لے اُڑی۔ بھولا پن مُنھ دیکھتا رہ گیا۔

نظیر کی طفولت

ڈیڑھ پونے دو سو برس قبل لڑکوں کی پرورش اور تربیت کا کیا ڈھنگ تھا اُس کا بیان اِس وقت میں آسان نہیں ہے۔ لیکن ازبس کہ ہمارے ہندوستانی بھائی کنسرویٹو[1] خیالات کے ہیں اور دستورِ قدیم کو چھوڑنا بہت کم پسند کرتے ہیں اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ قریب قریب کُل باتیں وہی ہوں جو اب رائج ہیں۔ زچہ خانے[2] سے لے کر مکتب کے زمانے تک ساری باتیں وہی ہوں گی جو اب ہر شریف گھرانے میں دیکھی جاتی ہیں۔ چھٹی، چلّہ، تارہ دکھائی، بکیر بچہ وغیرہ خدا جانے کیا کیا رسمیں ہوتی ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ نظیر کی پیدائش میں یہ سب باتیں نہ ہوئی ہوں گی۔ نظیر پیدا ہوا ہوگا تو کیا اُس کی بزرگ عورتوں نے اُس کے لیے کپڑے اور زیور نہ بھیجے ہونگے؟۔
جب نظیر پیدا ہوا ہوگا تو کیا محلّے اور قرابت کی عورتیں جمع نہ ہوئی ہونگی؟۔ کیا ڈھول مجیرے لے کر میراثنیں نہ پہنچی ہونگی؟۔ کیا زچہ گیریاں نہ گائی ہونگی؟۔ کیا لوگوں نے دعائیں نہ دی ہوں گی؟۔ کیا بچے کی صورت شکل

[1] کنسرویٹو یعنی قدیم دستور پر اڑا رہنے والا گروہ جو پرانی باتوں کا چھوڑنا اور نئی باتوں کو اختیار کرنا بہت کم پسند کرتا ہے۔ مسٹر لیپل گریفن نے ہندوستانیوں کے کنسرویٹزم یعنی قدامت پرستی کو ایشیاٹک کوارٹرلی ریویو کے کسی پرچے میں نہایت مدلل اور خوش گوار طریقے سے ثابت کیا ہے۔

[2] زچہ خانے کا سامان کنھیا جی کے جنم میں خود نظیر یوں بیان کرتا ہے:-

سب ناری آئیں گونے کی اور پاس پڑوسن آبیٹھیں
کچھ ڈھول مجیرے لاتی تھیں، کچھ گیت جچا کے گاتی تھیں
کچھ ہر دم مُکھ اُس بالک کا بلہاری ہو کر دیکھ رہیں
کچھ تھال پنجیری کے رکھتیں، کچھ سونٹھ سنٹھورا کرتی تھیں
کچھ کہتی تھیں "ہم بیٹھے ہیں نیگ آج کے دن کا لینے کو"
کچھ کہتیں "ہم تو آئے ہیں آنند بدھاوا دینے کو"

اور قوئی پر ہلے زر[illegible] نہ ہوئی ہو گی ؟- کیا لوگوں نے زچہ اور بچہ کو دعائیں نہ دی ہوں گی ؟- کیا دائی مُنہ بھر انعام نہ مانگتی ہو گی ؟- کیا پنجیری کے تھال طیار نہ ہوئے ہوں گے ؟- کیا سونٹھ سنٹھورے کا سامان نہ ہوا ہو گا ؟- کیا بھانڈ بھگتیے اور ہیجڑے آ جمع نہ ہوئے ہوں گے ؟-

عورتوں اور اُن کی رعایت خاطر سے مردوں نے جو خوشی نیگ جوگ کے دینے لینے میں ظاہر کی ہو گی اور اِس مولودِ مسعود کے ہونے کی خوشی میں باجے گاجے سے کام لیا ہو گا اُس کا تصور ہر شخص اچھی طرح کر سکتا ہے- لیکن عاقل اور دور اندیش عورتیں کم اور مرد زیادہ اُس لڑکے کے تیور سے اُس کی ذہانت اور فطنت استنباط کرتے تھے اور اُس کی ہر ادا سے سمجھتے تھے کہ لڑکا ہونہار ہے- آنکھیں بڑی ہوں یا چھوٹی لیکن اُن کی گردش- اُن کی چمک- پلکوں کی نرمی اور باریکی دکھاتی تھی کہ اُن چھوٹی کھڑکیوں سے ذہانت اور تیزی جھانک رہی ہے- بھنویں جُٹی ہوں یا علیحدہ مگر اُن میں بال ایک انداز سے اُگے ہوئے تھے اور آنکھوں کی عبارت چودہ ورق کی کتاب کی فہرست نہایت اختصار کے ساتھ اپنی بغل میں دبائے ہوئے تھیں- سر بڑا نہ تھا تو

کوئی کُھٹی میٹھی گرم کرے، کوئی ڈالے اسپند اور بھوسی
کوئی لائی ہنسلی اور کھڑوے، کوئی کُرتہ، ٹوپی، میوہ، گھی
کوئی دیکھے روپ اُس بالک کا، کوئی ماتھا چومے مہر بھری
کوئی بھنووں کی تعریف کرے، کوئی آنکھوں کی، کوئی پلکوں کی

کوئی کہتی "عمر بڑی ہووے اے پیر تمہارے بالے کی"
کوئی کہتی "بیاہ بہو لاؤ اِس آس مرادوں والے کی" الخ

ہر چند یہ سامان ہندوؤں کے ہاں کا ہے لیکن مسلمانوں نے اکثر اِس قسم کی باتیں ہندوؤں سے اخذ کی ہیں اس لیے اِن کے ہاں کا سامان بھی قریب قریب یہی ہے۔ اکبر آباد میں قاعدہ ہے کہ جب کسی گھر میں بیٹا ہوتا ہے تو یہ لوگ اپنی ڈھولک ولک لے کر آن موجود ہوتے ہیں اور گا بجا کر انعام طلب کرتے ہیں- یہ لوگ گویا دیار کے نیوڑیے کی جگہ ہیں-

بیٹا ہوا کسی کے جو سُن پائیں ہیجڑے
سُنتے ہی اُس کے گھر میں پھر آ جائیں ہیجڑے
ناچیں بجا کے تالیاں اور گائیں ہیجڑے
لے لے کے بیل بھاؤ بھی بتلائیں ہیجڑے
اُس کے بڑے نصیب جہاں آئیں ہیجڑے

چھوٹا بھی نہ تھا۔ متوسط درجے کا لیکن اس اُصول ہندسی پر بنا ہوا تھا کہ اکثر عمدہ قواے ذہنی کو اُس میں فراغت کی
جگہ ملی ہوئی تھی۔ ناک بلند تھی اور اُس کی بلندی پر غیرت اور عزتِ نفس ننھی ننھی کرسیاں بچھائے بیٹھی تھی۔
ٹھوڑی اعتدال کی تھی۔ نہ بہت مختصر نہ بہت نکلی ہوئی۔ پیشانی چوڑی اور اونچی جس سے ہیبت ٹپکی پڑتی تھی۔
سینہ بہت چوڑا تھا جس سے فراخ حوصلگی کا اندازہ ہوتا تھا۔

یہ تصویر جو ہم نے کھینچی ہے نظیر کے اخلاق کے آئینے سے لی گئی ہے۔ اُس کی نواسی کا دیا ہوا فوٹو[۱] آگے
چل کر پیش ہوگا۔

نظیر چوں کہ خاندانِ قریش سے تعلق رکھتا ہے اور قاعدہ ہے کہ قریشی عموماً سیاہ فام نہیں ہوتے غالباً اُس کا
رنگ گندم گوں ہوگا۔ گویا اُس کی رنگت بھی اُس کی آدمیت کی شہادت دیتی تھی۔ قد کو بہت پست
نہیں کہہ سکتے کیوں کہ اُس کی کسی تحریر سے اُس کا مکر وفن یا میلانِ فتنہ پردازی ثابت نہیں ہوتا۔
نہ بہت ہی طول بتا سکتے ہیں اس لیے کہ حماقت کی جھلک بھی اُس کی کسی تحریر میں نہیں ہے۔ متوسط درجے کا
قدو قامت ہوگا۔

جس زمانے میں نظیر ماں کی یا دائی دوا کی گود میں ننھا بچہ پڑا یا پالنے میں پڑا رہتا تھا اُس زمانے میں
بھی لوگ دیکھتے تھے کہ وہ اپنی ذہانت سے کس طرح کام لے رہا ہے۔ مضغۂ گوشتِ محض۔ بے چارہ زیادہ
ہل ڈل تو نہیں سکتا تھا لیکن چت پڑا ہے تو اُسی حالت میں چھت سے نظر جمائے کبھی کڑیوں کی حالت پر غور
کر رہا ہے، کبھی شہتیر اور کڑیوں میں امتیاز کے اسباب تجویز کر رہا ہے۔ رنگ اور بو اور آواز کے نکات میں
غلطاں پیچاں ہے۔ پتلیاں اُس کی آنکھوں میں بعض وقت بڑی سُرعت سے گردش کرنے لگتی ہیں، بعض

[۱] عکسی تصویر۔

وقت غور و فکر کے ٹھہراے سے انتہا سے زیادہ ٹھہر جاتی تھیں۔ جاگتے وقت وہ اکثر فطرتی بے چینی سے گھڑی بھر میں بیسیوں پہلو بدلتا اور اکثر چیزیں جس تک اُس کا ہاتھ پہنچتا اُن پر بار بار ہاتھ پہنچاتا اور ہر مرتبہ ایک نئی بات سیکھتا۔ ازبس کہ شگفتہ مزاج پیدا ہوا تھا زیادہ لوگ اُس کو روتا نہ دیکھتے۔ اکثر مسکراتا اور ہنستا رہتا اور اگر مرض کی کوئی شکایت نہیں ہے تو پاخانے پیشاب اور بھوک پیاس کی اوقات کے علاوہ لوگ اُس کو کبھی روتے نہ دیکھتے۔ اچھی صورتوں کا امتیاز اور اچھے لوگوں کی تمیز اُس کو لڑکپن ہی سے تھی۔ خوب صورت اور ستھرے آدمیوں کی گود میں شوق سے جاتا اور جن کو میلا دیکھتا یہاں تک کہ جنکے چہرے پر ڈاڑھی کچھ بہت بے قاعدہ گھنی ہوتی اُن کی گود میں جاتے گھبراتا اور روکر جلد الگ ہو جاتا۔ اس کے لب و دہن کی ساخت ایسی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ جلد بولنا سیکھے گا۔ نہ زبان موٹی نہ ہونٹھ موٹے۔ دونوں انداز کے مسوڑھوں اور دانتوں کی ساخت سہولت تلفظ کے مناسب حال۔ تھوڑے ہی دنوں میں مم۔ ہپا۔ اما۔ ابا وغیرہ کہنے لگا اور بہت جلد معمولی الفاظ اپنے مطلب کے اُس کو یاد ہو گئے۔ اخذ اور حافظے کی قوت اتنی قوی تھی کہ جو بات سُنی نقش کالحجر ہو گئی۔ ہر چند ایک زمانے تک بعض مخارج اس سے ادا نہ ہوتے تھے جیسے ر ڑ ش وغیرہ مگر اُس نقص میں اُس کے بھولے پن نے وہ کمال پیدا کر دیا تھا کہ صحیح تلفظ اُس پیارے پیارے ننھے مُنّے مخارج کے ایجاد کیے ہوے ناقص تلفظ کے آگے ہیچ تھا۔ دانتوں نے کچھ دنوں تک اُس کو ستایا لیکن پیٹ سے اچھے قویٰ لے کر نکلا تھا۔ اس سے بسہولت اس مشکل گھاٹی سے بھی نکل آیا۔ پوری تبیسی تو نہ تھی مگر ٹوٹی پھوٹی جیسی تھی اُس کو اپنی جبلی خوش طبعی سے اکثر ناز کے ساتھ اپنے پاس والوں کو دن میں سیکڑوں بار دکھاتا اور لوگوں کو یہ جھوٹے موتیوں کی لڑیاں دکھا دکھا کر اکثر نقد الفت حاصل کرتا۔

اس میں شک نہیں کہ نظیر کا لڑکپن نہایت خوشی میں گزرا ہے۔ اس کو اپنی ماں کے فراق کا صدمہ نہیں ہوا

اس کو دودھ کی طرف سے کچھ زیادہ تکلیف نہیں ہوئی - یہ اکثر بیماری جھیلا نہیں کیا - اس کے بزرگ تشدد اور مار پیٹ کے آدمی نہ تھے - اچھے ماں باپ اور بزرگوں کے زیر سایہ اس نے پرورش پائی اور ایک شگفتہ اور بے داغ دل لے کردار التربت سے باہر آیا - وہ لڑکپن کو جہاں یاد کرتا ہے اُس کی تعریف میں بے اختیار ہو جاتا ہے جیسے آدم کو جنت کی یاد آئی ہو - عشرت ایام طفلی کے بیان میں یہ بند قابلِ ذکر ہیں -

کیا وقت تھا وہ ہم تھے جب دودھ کے چھوڑے | ہر آن آنچلوں کے معمور تھے کٹورے
پانوں میں کالے ٹیکے، ہاتھوں میں نیلے ڈورے | یا چاند سی ہو صورت یا سانورے و گورے

کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

گل کی طرح سے ہر دم سینے پہ پھولتے تھے | پی پی کے دودھ ماں کا خوش ہو کے پھولتے تھے
ماں باپ ان کی خدمت سر پر قبولتے تھے | ہاتھوں میں کھیلتے تھے، جھولوں میں جھولتے تھے

کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

نے دوستی کسی سے، نے دل میں ان کے کینا | جانیں نہ بے قرینہ، نے سمجھیں کچھ قرینا
نے گرمیوں سے واقف، نے جانتے پسینا | چھاتی سے ماں کی لپٹے خوش اُن کو دودھ پینا

کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

جو دیکھے ان کی صورت لے پیار سے کھلائے | ہاتھوں اُپر اُچھالے، اور چھیڑ کر ہنسائے
چومے کبھی دہن کو، چھاتی کبھی لگائے | کوئی چسنی مُنھ میں دیوے، کوئی جھنجھنا بجائے

کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

چھوٹا سا کوئی اُن کا کُرتا نکالتا ہے | یا چھوٹی چھوٹی ٹوپی سر پر سنبھالتا ہے

ماں دودھ ہی پلاتی، اور باپ پالتا ہی — نانا گلے لگاوے، دادا اُچھالتا ہی

کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

کیا عمر ہی عزیزو اور کیا یہ وقت ہیگا — جب گھٹنیوں پہ آئے پھر اور کچھ تماشا

پائوں چلے تو واں سے پھر اور پیار ٹھہرا — سب زندگی کا حظ ہی ان کو نظیرؔ اہا ہا!

کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

دوسری جگہ طفلی کی تعریف میں پھر یہ بند بھی قابل ملاحظہ ہیں:-

کیا دن تھے یارو وہ بھی تھے جب کہ بھولے بھالے — نکلے تھی دائی لے کر، پھرتی کبھی دوا لے

چوٹی کوئی رکھالے، بدھی کوئی پنہالے — ہنسلی گلے میں ڈالے، منت کوئی بڑھالے

موٹے ہوں یا کہ دُبلے، گورے ہوں یا کہ کالے

کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

دل میں کسی کے ہرگز نہ شرم، نہ حیا ہی — آگا بھی کھُل رہا ہی، پیچھا بھی کھُل رہا ہی

پہنے پھرے تو کیا ہی، ننگے پھرے تو کیا ہی — یاں یوں بھی واہ وا ہی اور وُوں بھی واہ وا ہی

کچھ کھالے اس طرح سے، کچھ اُس طرح سے کھالے الخ

مرجاوے کوئی تو بھی کچھ ان کو غم نہ کرنا — نہ جانے کچھ بگڑنا، نہ جانے کچھ سنورنا

ان کی بلا سے گھر میں ہو قند یا شکر نا — جس بات پہ یہ مچلے پھر وہی کر دھرنا

ماں اوڑھنی کو، بابا پگڑی کو بیچ ڈالے الخ

جو کوئی چیز دیوے نت ہاتھ اوٹتے ہیں — گڑ، بیر، مولی، گاجر لے مُنہ میں گھوٹتے ہیں

بابا کی مونچھ، ماں کی چوٹی گھسوٹتے ہیں
گردوں میں [illegible] ہیں خاکوں میں لوٹتے ہیں

کچھ بن گیا سو پی لے کچھ بن گیا تو کھا لے۔ الخ

جو اُن کو دو سو کھا لیں پھیکا ہو یا سلونا
ہیں بادشہ سے بہتر جب مل گیا کھلونا
جس جا پہ نیند آئی پھر واں ہی اُن کو سونا
پروا نہ کچھ پلنگ کی نے چاہیے بچھونا

بھونپو کوئی بجا لے پھرکی کوئی پھرا لے۔ الخ

یہ بالے پن کا یارو عالم عجب بنا ہے
یہ عمر وہ ہے اس میں جو ہے سو بادشا ہے
اور سچ اگر چہ پوچھو تو بادشا بھی کیا ہے
اب تو نظیر میری سب کو یہی دعا ہے

جیتے رہیں سبھوں کے آس اور مراد والے۔ الخ

قیس کے پردے میں نظیر اپنی نازپروردگی کا حال یوں بیان کرتا ہے:-

پیدا ہوا تھا قیس جب اپنے پدر کے گھر
ماں باپ کو ہوئی تھی خوشی سب سے بیشتر
کنبے کے لوگ بیٹھے تھے باہم سب آن کر
اک دھوم مچ رہی تھی خوشی کی اِدھر اُدھر
چومے تھا باپ قیس کے ہر لحظہ چشم و سر
رکھتے تھے ہاتھوں چھاؤں اُسے گرچہ بے خطر
ماں بھی لیے پھرے تھی اُسے اپنے دوش پر
فرزند کی خوشی میں لٹاتی تھی سیم و زر

لیکن وہ ماں کی گود میں آ کر نہ سوتا تھا
ہر وقت شور کرتا تھا، ہر لحظہ روتا تھا

مادر تھپک تھپک کے سلاتی تھی کر کے پیار
پھرتا تھا باپ فال دکھاتا بہ چشم زار
تعویذ ڈالتا تھا گلے بیچ بے شمار
لیکن اُسے قرار نہ آتا تھا زینہار

رہتا تھا اک فقیر کوئی واں بزرگوار
جس دم وہ حال اس پہ کیا جا کے آشکار
سنتے ہی اس نے آہ کی اور ہو کے اشکبار
مجنوں کے باپ سے یہ کہا اس گھڑی پکار

"دکھ پانے والے لڑکے جو دنیا میں آتے ہیں
لچھن سب ان کے پہلے ہی پہچانے جاتے ہیں"

لڑکا ترا یہ عاشقِ شاعر ہووے گا" وغیرہ وغیرہ۔

شیر خوارگی کے عالم سے گزر کر جب نظیر دوڑنے اور چلنے پھرنے لگا اور کسی قدر ہوش سنبھالا تو وہ چسنی اور جھنجھنے وغیرہ تو رخصت ہوئے لیکن اور بہت سے دوسرے کھلونوں نے ان کی جگہ لی۔ دیوالی آئی تو اپنے ساتھ بیسیوں کھلونے دیوالی کے لائی؛

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تیوہار
کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے ادھار
کھلونے کھیلوں بتاسوں کا گرم ہے بازار
ہر اک دکاں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار

سبھوں کو فکر ہے اب جا بجا دوالی کا

مٹھائیوں کی دکانیں لگا کے حلوائی
پکارتے ہیں کہ "لالہ دوالی ہے آئی"
بتاسے لے کوئی، برفی کسی نے تلوائی
کھلونے والوں کی ان سے زیادہ بن آئی

گویا انھوں کے واں راج آگیا دوالی کا

مٹھائی کے آدمی ہیں۔ جانور ہیں۔ مٹی کے بیل ہیں۔ گائیں ہیں۔ گھوڑے ہیں سیکشن جی اور رام و لچھمن کی ہزاروں طرح کی مورتیں ہیں۔ گائیں ہیں تو ان کے بچے چھاتی سے لگے دودھ پی رہے ہیں امیرن تازہ دانا سے سر پہ دہی کی مٹکی لیے مٹکتی چلی آرہی ہے۔

عید آئی تو عید کے کھلونوں نے دھوم مچائی۔

جو جو کہ ان کے حسن کی رکھتے ہیں دل سے چاہ	جاتے ہیں اُن کے ساتھ لگے تا بہ عید گاہ
توپوں کے شور اور دوگانوں کی رسم و راہ	میانے، کھلونے، سیر، مزے، عیش، واہ واہ

ایسی نہ شب برات نہ بقر عید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

ابرک کی پالکیاں ہیں۔ قندیلیں ہیں۔ انواع انواع طرح کے خوب صورت پنکھے ہیں سرخ سرخ چھڑیاں ہیں۔ لکڑی کی مطلا اور مذہب تلواریں ہیں۔ خوب صورت میانوں میں بند۔ چھوٹی چھوٹی مزے کی ڈھالیں ہیں۔ بزرگ عید گاہ گئے ہیں۔ وہیں سے لیتے آئے ہیں۔ میاں نظیر ہر ایک کھلونے کو دیکھ رہے ہیں۔ ہر ایک پر کچھ نہ کچھ رائے دیتے جاتے ہیں۔ ابا یہ اچھا ہے۔ اہا کیا ہی چمکتی ہوئی قندیل ہے۔ بیٹا تلوار اور ڈھال لو اس سے تم سپاہی کہلاؤ گے۔ ابا میں سپاہی نہیں بنا چاہتا۔ وہ ظالم ہوتے ہیں۔

شبرات آئی تو باپ پر فرمایش ہو رہی ہے۔ ابا مجھے انار اور بہت پھول منگا دو۔ ہوائی بھی خوب ہوتی ہے۔ مہتابی کی بھی اچھی سیر ہے۔ جس وقت چھوٹتی ہے کالا آدمی بھی گورا دکھائی دینے لگتا ہے۔ گھنچکر لاتو ذرا خوب دم کا ہو کہ گھنٹے بھر تک تو چکر کھائے۔ لٹو۔ تومڑی۔ ٹونٹے۔ زرکی۔ چھچھوندر۔ پٹاخے۔ گلکاری۔ کلھیا۔ قلم نرٹی وغیرہ کا بھی فہرست میں مذکور ہے۔ باپ ہونہار بیٹے کی فرمائش سر آنکھوں سے بجالاتے ہیں اور بیٹے کے بہلنے سے آپ بھی آتش بازی کی سیر سے لطف اٹھاتے ہیں۔ نظیر اپنی مآل اندیشی سے معمولی بے خطر آتش بازیوں کے سوا کسی کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ خطرناک آتش بازیوں کے جلانے میں محلے کے شریر لڑکے اور گھر کے نوکر چاکر

سلہ انشا۔ شب برات جو آئی تو دیکھو انشا۔	کہ مچ رہی ہے پٹاخوں کی کیا پٹاخ پٹاخ +

مصروف ہیں۔ انار اور ہت پھول چھوٹ رہے ہیں معلوم ہوتا ہے گھر میں پھلواری کھلی ہوئی ہے۔
کبھی گھر سے لڑکوں کے غول باندھ کر لڑنے جاتا ہے اور وہاں یہ سیر دیکھتا ہے۔

آکر کسی کے سر پہ چھچھوندر لگی کڑی
اوپر سے اُوڑھوائی کی آکر پڑی چھڑی
ہو گئی گلے کا ہار پٹاخے کی ہر لڑی
پائوں سے لپٹی شور مچا کر قلم نٹڑی

کرتی ہے پھر تو ایسی ستم گاری شب برات

چہرہ کسی کا جل گیا، آنکھیں جھلس گئیں
چھاتی کسی کی جل گئی، باہنیں جھلس گئیں
ٹانگیں بچیں کسی کی تو رانیں جھلس گئیں
مونچھیں کسی کی پھک گئیں، پلکیں جھلس گئیں

رکھے کسی کی ڈاڑھی پہ چنگاری شب برات

دہلی شہر بڑا ہے۔ دن بھر میں سیکڑوں تماشے والے آتے ہیں۔ ابھی ریچھ والا آیا۔ ریچھ نچا کر اور ریچھ کے اور اپنے کرتب اور کشتی کی سیر دکھا کر چلا گیا تو مچھندر بندر اور بکرا لے کر پہنچا۔ کچھ دیر ان کی سیر ہی

کھڑکی کا حسن دیکھا تو پھر نچا کے بندر
جب ڈگڈگی بجائی کوچے گلی کے اندر
بکرا ابھی لا بٹھایا اس کام کا سمندر
لڑکے ہزاروں بولے: "آؤ میاں قلندر"

سو مکر و فن بنانا، سو رنگ روپ بھرنا
عاشق کو ہر طرح سے خوباں کی دید کرنا

پھر ایک اُستاد گلہری کا بچہ لے کر پہنچے۔

سفیدی میں وہ کالی دھاریاں ایسی ہی ہیں بن
کہ جیسے گال پر لڑکوں کے چھوٹے زلف کی ناگن
کناری دار پٹا جس میں گھنگرو کرتے چھن چھن
گلے میں ہنسلی پائوں میں کڑے اور ناک میں لٹکن

رہا ہی سر بسر گہنے میں بھر بچہ گلہری کا

اُستاد کی تصویر بھی قابلِ ملاحظہ ہی:-

وہ دیکھے تو بُری صورت، بُرا حال، اور پھٹے کپڑے	پٹے داڑھی کے بال اور زرد مُنھ آنکھوں میں آنسو سے
بندھی میلی سی پگڑی سر پہ، اور ٹکڑے انگرکھے کے	وہ کچھ تھے گو کہ بیٹھے پر بہتر اپنے فن میں تھے پورے

لگا رکھتے تھے ایسے وقت پہ بچہ گلہری کا

مُلاحظہ کیجیے کہ کس شان سے اُستاد گلہری کا بچہ نکالتے ہیں:-

نظر سے اس کی میں نے جب تو واں اس بات کو تاڑا	کمر کو دیکھ ڈھونڈی جیب پگڑی کو جو ٹالا اس میں

وہیں ہم نے نکالا ڈھونڈ کر بچہ گلہری کا

ریچھ والے قلندر تشریف لائے ہیں۔ اور یوں فرما رہے ہیں۔ قلندر کی تصویر کیا ہی خوب ہی۔

تھا ہاتھ میں اک اپنے سوا من کا جو سونٹا	لوہے کے کڑے جس پہ کہ گھر کہتے تھے سراپا
کاندھے پہ چڑھا جھولنا اور ہاتھ میں پیالا	بازار میں لے آئے دکھانے کو تماشا

آگے تو ہم اور پیچھے وہ تھا ریچھ کا بچا

ریچھ کی تصویر:-

تھا ریچھ کے بچے پہ وہ گہنا جو سراسر	ہاتھوں میں کڑے سونے کے بجتے تھے جھک کر
کانوں میں دُر، اور گھنگرو پڑے پاؤں کے اندر	وہ ڈور بھی ریشم کی بنائی تھی جو پُرزر

جس ڈور سے یارو تھا بندھا ریچھ کا بچا

جھمکے وہ جھلکتے تھے پڑے جس پہ کرن پھول	مُقیش کی لڑیوں کی پڑی پیٹھ اوپر جھول

اور اُن کے سوا کتنے بٹھائے تھے جو گُل پھول
یوں لوگ گرے پڑتے تھے سر پانو کی سُدھ بھول

گویا وہ پری تھا کہ نہ تھا ریچھ کا بچّا

لیجیے اب قلندر اپنے ریچھ کے بچّے کو نچاتا ہے:-

مدت میں اب اس بچّے کو ہم نے ہی سدھایا
لڑنے کے سوا ناچ بھی ہر اس کو سکھایا
یہ کہہ کے جو ڈھپلی کے تئیں گت پہ بجایا
اس ڈھب سے اُسے چوک کے جمگھٹ میں نچایا

جو سب کی نگاہوں میں کُھبا ریچھ کا بچّا

پھر ناچ کے وہ راگ بھی گایا تو وہاں واہ
پھر گھر وا نا چا تو ہر اک بولی زباں "واہ!"
ہر چار طرف سے کہیں پیر و جواں "واہ!"
سب ہنس کے یہ کہتے تھے: "میاں واہ! میاں واہ!

کیا تم نے دیا خوب نچا ریچھ کا بچّا!

آئیے اب ریچھ کی کُشتی بھی ملاحظہ کیجیے:-

جب ہم نے اُٹھا ہاتھ کڑوں کو جو ہلایا
خم ٹھونک پہلواں کی طرح سامنے آیا
لپٹا تو یہ کُشتی کا ہنر آن دکھایا
جو چھوٹے بڑے جتنے تھے اُن سب کو رجھایا

ہم بھی نہ تھکے اور نہ تھکا ریچھ کا بچّا

جب کُشتی کی ٹھہری تو وہیں سر کو جو جھاڑا
للکارتے ہی اُس نے ہمیں آن لتاڑا
گہ ہم نے پچھاڑا اُسے، گہ اُس نے پچھاڑا
اک ڈیڑھ پہر ہو گیا کُشتی کا اکھاڑا

پر ہم بھی نہ ہارے، نہ ہٹا ریچھ کا بچّا

جو حسن شیر دیکھا تو ریچھ کو نکالا
کُشتی سے کھڑ کھڑایا اور آپ کو اُچھالا

اور بن کے ریچھ والے سونٹا کڑا سنبھالا | اس ریچھ سے بھی کتنے گل رو کو دیکھ ڈالا

سو مکر و فن بنانا سو رنگ روپ بھرنا
عاشق کو ہر طرح سے خوباں کی دید کرنا

کہیں سے سر پر ایک بھاری ڈلیا لیے ہوے سپیرا ابھی پہنچا۔ اژدہے کا بچہ نکال کر لوگوں کو دکھا رہا ہے۔ اور طرح طرح کے سانپ اور بچھوؤں سے بچّوں کو بہلا رہا ہے۔

دیکھا جو حسن کوئی بلدار لہر کھایا | تو بن گئے سپیرے اور سانپ کو چلایا
پونگی بجا کے ہر دم سانپوں کا پھن ہلایا | اس سانپ کے کبھی فن سے اپنا بھی من منایا

سو مکر و فن الخ

یہ حضرت تشریف لے گئے تو کسی طرف سے بئے والا پہنچا۔ بئے کا رنگ روپ اس کی تیزی۔ اس کی چلت پھرت سب نظیر کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ پیٹی سے اس کی جو ڈورا بندھا ہوا ہے اس پر بھی نظیر کی نظر ہے۔ بئے والا بیٹھ جاتا ہے اور تماشا کرنے لگتا ہے۔ کوڑی سامنے پھینک دی اور بئے کو اشارہ کیا۔ بجلی کی طرح چمکا اور جھٹ کوڑی اٹھا لایا۔ کسی کے ہاتھ میں مہندی لگی ہوئی ہے چھڑا کر لے آیا۔ گرہ میں انگوٹھی چھلا باندھ دیا بیا گیا اور اپنی چونچ اور پنجوں سے کھول کر لے آیا۔ پوستوں کا ڈول بنا کر دیا۔ کنوئیں سے پانی کھینچ کر لے آیا۔ اگر پاس میں کوئی عورت کھڑی ہے اس کی پیشانی سے بندی ٹیکی اکھاڑ لایا۔ یہ سب باتیں نظیر کے دل پر گہرا اثر کرتی ہیں اور وہ نقش رفتہ رفتہ ایسا پکا ہو جاتا ہے کہ پھر کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتا۔

اب ہاتھ پر مرے جو نمودار ہے بیا | زردی میں اپنے رنگ کی زردار ہے بیا
جس دن سے میرے ہاتھ یہ عیار ہے لگا | کوڑی کبھی اٹھا، کبھی مہندی اتار لا

کیا کیا پری رخوں کی بہاریں ہیں دیکھا	بیٹی سے اُس کی یارو یہ ڈورا نہیں بندھا

لڑکوں کی اُلفتوں میں گرفتار ہی بسیا

اُڑتے کو دیکھ جب سے لیا ہی یہ ہم نے مول	پھرتے ہیں ساتھ تب سے کئی دلبروں کے غول
چھلا انگوٹھی لاتا ہی ہر دم گرہ سے کھول	پانی کنوئیں سے کھینچے ہی کر پوستوں کے ڈول

ایسا ہنر میں اپنے نمودار ہی بسیا

کرتا ہی آ کے بندی و ٹیکی پہ جب یہ چوٹ	بالوں کی لٹ دکھاؤ تو لا دے وہیں کھسوٹ

کبھی یہی شخص جس کے پاس اب بیا ہی گلہری کا بچا۔ بنیٹی باز طوطا۔ سدھا ہوا بگلا بھی لے کر آیا تھا اور جانوروں کی جو اُس کی تعلیم نے اثر کیا تھا اُس کا نظیر کے دل پر عمدہ اثر ڈالا تھا۔

آگے ہمارے پاس تھا بچا گلہری کا	طوطا، بنیٹی، اور تھا بگلا سدھا ہوا
اُن کو تو ہاے چور کوئی لے گیا چرا	اب اس کا ہی ہمارے تئیں یارو آسرا

اِس سے کسی میں اب تو مدد گار ہی بسیا

خوبی کا لہر کھاتا دیکھا جو حُسن لہری	پالے بٹیر، طوطے، بگلے، بئے، گلہری
کی بات وہ ہی جو کچھ اُس کی پسند ٹھہری	اُس لہر کی ہی دیکھی کیا کیا بہار گہری

سو مکر و فن ۔ الخ

دیکھا جو حُسن یارو جوں لعل یا انگارا	تو لعل چٹی کا ہی پھر پالنا بچارا
کل یا کہ جال روکا اور لعل کو اُتارا	اُس لعل کے ہی ڈھب میں اُس پہ بھی جال مارا

ـلہ کرنے کو دیکھ یعنے بنظر دید بازی۔

سو مکر و فن الخ

جانور والے چلے جاتے ہیں تو کسی طرف سے ایک آدھ رنگ بھریے بھی آن کر اپنے بازار کا رنگ جماتے ہیں۔ گڑیوں کے چھوٹے چھوٹے زیور چھلے انگوٹھی۔ بازو بند۔ کڑے۔ نونگے۔ توگرھیاں۔ وغیرہ بنا بنا کر دے رہے ہیں۔ میاں نظیر اپنی ماما کے ساتھ ہیں کچھ تو اپنے شوق اور کچھ گھر کی لڑکیوں کی فرمایش سے زیور بنوا کر لے جا رہے ہیں۔ کیا دن ہیں کہ معمولی تین کوڑی کے زیور ہزاروں اشرفیوں کے گہنے سے زیادہ خوش کر رہے ہیں۔ خیالات میں موزونی تو جبلی ہی ہر ایک زیور کی نسبت کچھ نہ کچھ تشبیہات بھی بہم پہنچاتے جا رہے ہیں :-

پایا جو رنگ بھولا تو بنگے رنگ بھریے بولا کوئی جو اس میں کچھ تو خدا سے ڈریے	چھلے انگوٹھی ڈھالے سانچے کے کر کے بھریے تو اس نے ہنس کے کہنا کچھ بات یاں نہ کیجے

سو مکر و فن الخ

اکثر ایسا بھی ہوتا ہی کہ میاں نظیر بیٹھے ہیں۔ گھر کے کوئی خوش طبع رکن ان کے پاس آن بیٹھے۔ اور ان کو بعض کھیل کی باتوں اور کھیل کی چیزوں سے بہلانے لگے۔ شام کا وقت ہی۔ چراغ روشن ہو گیا ہی۔ چاندنی کھلی ہوئی ہی۔ تخت صحن میں بچھے ہوے ہین۔ ایک بزرگ لیٹے ہوئے ہیں۔ میاں نظیر ان کی گود میں بیٹھے ہیں۔ ان پر تقاضے کر رہے ہیں۔ مرزا صاحب کوئی پہیلی ارشاد کیجیے۔ پہیلی سُنی تو اتے پتے پوچھ رہے ہیں۔ عقل لڑا رہے ہیں۔ کوئی دوسرے صاحب چاہتے ہیں کہ حل کریں تو یہ ان کو روکتے ہیں کہ آپ نہ بتائیے۔ میں سوچ کر کہتا ہوں۔ جب کسی پہیلی کو بوجھ لیتے ہیں تو اچھل پڑتے ہیں اور مارے خوشی کے جامے میں پھولے نہیں سماتے۔ کبھی مُکریاں سُن رہے ہیں۔ کہتے والے نے ابھی نا کھی کہا بھی نہیں کہ انھوں نے اخیر لفظ تڑ سے

کہ دیا۔ کبت اور کھنڈ اور خدا جانے کیا کیا چیزیں لوگ اُن کو سناتے ہیں اور یہ سب ایک خاص دلچسپی کے ساتھ لطفِ تازہ اُٹھاتے ہیں۔

رات اس شوخ سے میں نے یہ پہیلی میں کہا: — "بھیگی بکری کسے کہتے ہیں بتاؤ تو بھلا؟"
اس پہیلی کے تئیں سُن کے بڑے سوچ میں آ — جب نہ سمجھا تو کہا ہار کے "اب تو ہی بتا"

سُن کے جب میں نے کہا: "ای مرے دل بر، تربوز"

دیکھا جو حسنِ قابل تو ریختہ بنائے — کچھ مکریاں بنائیں اور کچھ کبت بنائے
سکھیوں کی بحث ڈالی اور کھنڈ بھی جلائے — جب جھولنے پہ آئے پھر تو مزے اُڑائے

سو مکر و فن بنانا۔ الخ

مرزا صاحب کو لڑکوں کے بہلانے کا ڈھنگ اچھا ہی۔ کبھی یہی حضرت دوسرے وقت بیٹھے ہیں۔ دو چار مکڑیوں کو لے کر ڈبیوں میں بند کیا۔ پھر ایک مکھی کو اس میں ڈال اُن مکڑیوں اور مکھی کی لڑائی کا تماشا دیکھا۔ کبھی چیٹیوں کو اکٹھا کرکے اُن کی سیر دیکھی۔ کبھی تتلیوں کو گرفتار کرکے اُن کو نچایا۔ لکڑی کے پھول کتر رہے ہیں۔ سنگترے کو تراش کر اُس کی قندیل بنا رہے ہیں۔ مولی کا ہنس بگلا طیار ہو رہا ہی۔ گاجر کا مورباشا بن رہا ہی۔

جو حسن بالا دیکھا تو مکریاں بنائیں — ڈبیوں میں ڈال مکھی اور مکڑیاں لڑائیں
کچھ چیٹیاں منگائیں کچھ تتلیاں نچائیں — ان تتلیوں کی خاطر کیا تیلیاں بنائیں

سو مکر و فن ۔ الخ

ہر اک پلنگ اُتارا شیشے میں، جڑ کے ماشا — لکڑی کے پھول کترے، اور سنگترہ تراشا
مولی کا ہنس بگلا، گاجر کا مورباشا — دیکھا ہر اک بہانے اُس حسن کا تماشا

سو مکر و فن ۔ الخ

نظیر کے مشاغلِ لہو و لعب

نظیر جس مزاج کا آدمی تھا، اور اُس کے کلام سے جیسا مترشح ہوتا ہی، یقیناً اس نے بہت بڑا حصہ اپنی اوقات کا لہو ولعب میں صرف کیا ہی۔ وہ ایک متانت کی ادا سے چُپ چاپ بیٹھا نہیں رہ سکتا لوگ جیسی کھیل رہے ہیں تو آپ بھی شریک ہیں۔ جُوا ہو رہا ہی تو اُس میں بھی داؤ رکھنے کو حاضر ہیں۔ شطرنج میں بند نہیں۔ گنجفے میں عاری نہیں۔ اگر ایک دفعہ مات کھائی تو دوسری دفعہ کچھ ایسے بندوبست سے چلے کہ اگر مات نہیں کی تو بازی بُرد ضرور ہوئی۔ چوسر کے پاسے پھینک رہے ہیں۔ داؤ بول رہے ہیں۔ بازی بگڑی ہوئی ہی۔ گوٹ پر گوٹ کٹ رہی ہی پاسا یاری نہیں دیتا۔ مگر چال کچھ ایسی چل رہے ہیں کہ حریف کے چھکّے چھوٹے ہوئے ہیں۔ ہارتے ہیں تو ایک دو پاسے سے۔ جتنے مشغلے سوسائٹی میں جاری ہیں، اور اُن کی بنیاد کچھ آپس کی معاشرت پر معلوم ہوتی ہی، نظیر ہر میں شریک ہیں۔ کبھی آپ کو گیڑیاں بھی کھیلتے دیکھا گیا ہی۔ کبھی آپ جمنا میں کود رہے ہیں، گھنٹوں پڑے تیر رہے ہیں۔ کبوتر اُڑانے سے انتہا سے زیادہ ذوق ہی۔ کنکوے کثرت سے لڑاتے ہیں۔ جبھی تو حضرت کی ہمدردی اس قدر وسیع ہی کہ بُرے سے بُرے اخلاق، اور پاجی سے پاجی خیالات، اور ناپاک سے ناپاک مشغلے کے آدمی کو بھی یہ نظرِ عداوت سے نہیں دیکھتے۔ ہر کے ساتھ ایک طرح کی ہمدردی اور اُلفت ہی ہی۔

نظیر چوسر اس طرح کھیلتے ہیں:-

عجب طرح کی وہ رنگیں چوپڑ غرض بچھائی ہی اب خدا نے	کوئی ہی ٹھنگل، کسی کا جگ ہی، پھریں ہیں نَو دس بھی خانے خانے
جو پاسا پھینکے بنا بنا کر، وہ داؤں کتنے ہی مل میں ٹھانے	جو چاہتا ہو اٹھارہ آویں تو اُس کو پڑتے ہیں تین کانے

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت، ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر، خدا کی باتیں خدا ہی جانے

پھر شطرنج کے مُہرے یوں بچھاتے ہیں:-

عجب یہ شطرنج کا سا نقشہ بچھا ہی دن اور رات اِس جا
جو بات چاہے کرے کسی کو، نہ آوے بُرد اُس کو ہات اِس جا
ہزاروں منصوبے باندھے دل میں، بتاوے چالوں کی گھات اِس جا
نہیں ہی اک چال پر چوک قائم، سبھوں کی بازی ہی مات اِس جا

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت، ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر، خدا کی باتیں خدا ہی جانے

پھر گنجفے کے ورق یوں بکھیرتے ہیں:-

عجب طرح کے ورق بنے ہیں کوئی مکدّر، کوئی صفا ہی
کسی کے سر پر ہی تاجِ شاہی، کسی پہ شمشیرِ پُر جفا ہی
کوئی امیر اور کوئی وزیر، اور کوئی فقیری ہیں دل خفا ہی
سبھوں کو اِس جا خیال آیا، یہ حق کی قُدرت کا گنجفا ہی

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت، ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر، خدا کی باتیں خدا ہی جانے

ایک دن ایک دل بر کی خدمت میں بیٹھا تھا۔ ایک دوسرا محبوب آیا اور اُس سے کہا "کوئی شغل کرنا چاہئے" اُس نے کہا "گنجفہ موجود ہی" مجھ سے پوچھا "تجھ کو آتا ہی؟" میں نے کہا "یہاں تو نہیں آتا" کہا "کیوں؟" میں نے کہا: "سرتاجِ من آفتاب رویاں ٭ من از دل و جان غلام ایشاں" کہا "حکم سے بھی نہیں؟" میں نے کہا "در خوش دلی سُرخ روئی و براتِ سعادت در چنگ و بخلت ضد خوش تماش و شمشیرِ عتاب بے درنگ۔ پس انکارِ سفید و سیاہ بہ از اقرار" اسی گفتگو میں ایک شوخ اور آیا۔ تینوں کھیلنے لگے اور میں اپنا حسن و ناز کا

مشاہدہ کرتا رہا۔

میاں نظیر بالخلقۃ سوسائٹی کے کیڑے ہیں۔ جن جن چیزوں میں وہ یہ لطف دیکھتے ہیں کہ اُن سے لوگ مجتمع ہوتے ہیں یہی اجتماع کی خوبی اُن کے شوق کے لیے محرک کافی ہوتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جہاں کنکوہ بڑھا، چھوٹے بڑے سب آن گھیرتے ہیں۔ دو چار سڑک پر کھڑے آسمان سے نظر لڑائے ہیں، دس بیس صحن میں آ ڈٹے ہیں۔ کوئی ڈور لوٹنے کی فکر میں ہے۔ کسی کو کنکوے کی گھات ہے۔ لڑکے ہجوم کیے ہوے ہیں۔ مفت کے غلام بنے ہوے ہیں۔ کوئی آپ سے شیشہ پیس رہا ہے۔ کوئی شیشے کے ٹکڑے سمیٹ رہا ہے۔ کوئی لیپ طیار کر رہا ہے۔ کوئی مانجھا چڑھا رہا ہے۔ کوئی لپیٹ رہا ہے۔ کانپیں چھل رہی ہیں۔ کنکوے گھٹ گئے ہیں تو ایک دوڑا ہوا بازار سے لینے جا رہا ہے۔ گھر میں خاصہ میلا لگا ہوا ہے۔ چہل پہل اور آبادی معلوم ہوتی ہے۔

کنکوے پتنگ کی فصل آگئی ہے۔ اکّا دُکّا اُڑنے لگے ہیں۔ بازاروں میں جا بجا دُکانوں پر اِن کی بہار ہے۔ اب میاں نظیر سے کہاں ضبط ہو سکتا ہے۔ نوکروں کو بازار دوڑایا ہے۔ ڈور کا بند و بست ہو رہا ہے۔ کنکوے آرہے ہیں۔ بازار کے کنکووں سے عاجز آ کر کبھی خود لپنے ہاتھ سے کانپ چھیل رہے ہیں۔ اُنگلی پر اُس کا وزن دیکھ رہے ہیں۔ اپنے ہاتھ کا کنکوہ بڑھا کر آس پاس والوں سے اُس کی عمدگی کی داد لے رہے ہیں دیکھنا مرزا کیا سُدھا کنکوہ ہے جہاں سے چاہو موڑ لو۔ گھرنی بھی جتنی چاہو کھلا لو۔ شاہ جی تم ذرا اِس کنکوے کو ہاتھ میں لے کر دیکھو۔ ایسا شایستہ ہے کہ ایک بچہ بھی ہاتھ میں لیے رہ سکتا ہے۔ لانا وہ بڑھا آتا ہے۔ لاؤ اُسے کاٹ دوں۔ اگر دوسرے کے ہاتھ میں کنکوہ ہے اور کوئی اُس کی طرف کنکوہ لیے آتا ہے تو اُس کو ہدایت بھی فرماتے ہیں:۔

لاتا ہے پیچ پیار کے تکّل جو اپنی واں		کہتا ہے کوئی اُن سے "خبردار ہو میاں،	

اب پیچ پڑنے کو ہی نہ دے اتنی ڈھیلیاں	گھبرا کے کنّے اس کے نہ پھنسنے دو، میری جاں

اچھا نہیں ہی مفت کھپانا پتنگ کا"

پیچ پڑ جاتا ہی تو پھر ڈھیل دینے اور رگڑا دینے کے قاعدہ بتاتے ہیں :-

گر پیچ پڑ گئے تو یہ کہتے ہیں: "دیکھیو	رہ رہ اسی طرح سے نہ اب دیجے ڈھیل کو
پہلے تو یوں قدم کے تئیں او میاں رکھو	پھر ایک رگڑا دے کے ابھی اس کو کاٹ دو

ہیگا اسی میں فتح کا پانا پتنگ کا"

پتنگ کے کٹنے پر لوٹنے کی سیر یوں دکھاتے ہیں :-

کٹتا ہی جو پتنگ تو پھر لوٹنے اُسے	دو دو ہزار دوڑتے ہیں چھوٹے اور بڑے
کاغذ ذرا سا ملتا ہی، یا ٹکڑے کانپ کے	جب اس طرح کی سیر بھلا آن کر کرے

پھر سوچیے تو کیا ہی ٹھکانا پتنگ کا

کنکوے کا میاں نظیر کو چوں کہ شوق بہت تھا اکثر احباب کبھی پتنگ کا کاغذ، اور کبھی خود کنکوے بھیج دیتے تھے۔ ایک دوست نے کاغذ پتنگ کا بھیج دیا تھا اُس کا شکریہ یوں ادا کرتے ہیں :- کاغذِ مہرہ دو رویہ کشیدۂ پتنگ کہ جلاے آئینہ رامنصوبۂ تحیّر افزاید، و بصافیِ رخسارِ پری بازی نماید، بدست پیادۂ تیز رفتار رسید۔ خاطرِ پُر ہوس ہواے طفلی در سر قائم بگنجِ مراد پے برد، و ابتہاج بشمارِ اوراق رو باوقات لہوسمات آورد۔

اپنے شوق کی وجہ نظیر ضمناً یوں بیان کرتے ہیں :- (یعنی چوں کہ اس میں چھوٹے بڑے سب کی خوشی مضمر ہی اس لیے پتنگ ایک اچھی چیز ہی اور اس کا شوق بھی ایک امرِ ضروری ہی کہ اس سے لوگوں سے ملنے جلنے کا

ایک خاصہ موقع ہاتھ آتا ہے)

اس آگرے میں یہ بھی تماشا ہے دل پذیر		ہوتے ہیں دیکھ شاد جسے خرد اور کبیر
کیوں کر نہ دل تپنگ کی ہو ڈور میں اسیر		خوباں کے دیکھنے کے لیے کیا، میاں نظیر

ہے یہ بھی ایک طرفہ بہانا پتنگ کا

نظیر ذیل کی قسموں کا خاص ذکر فرماتے ہیں اور ہر ایک کی خاص شاعرانہ مدحت بیان کرتے ہیں۔

دو باز۔ ل پرا۔ گھایل۔ لنگوٹیا۔ چاند تارا۔ پہاڑیا۔ بگلا۔ دوپتا۔ دہیڑ۔ گلہریا۔ دودھاریا۔ مانگ دار خربوزیا۔ پیندی پان۔ بمنا۔ دوکونیا۔ کلسرا۔ چپ۔ ککڑی۔ چوگھڑا۔ چمچکا۔ تکل۔ جھجاؤ۔ کج کلاہ۔

کبوتر بازی :۔ میاں نظیر خود فرماتے ہیں کہ ؎ چھوڑ ان کو، نظیر، اپنا دل اب کس سے لگاویں؛ اپنے، تو لڑکپن سے ہیں، دم ساز کبوتر؛ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے طفولیت سے ان کو کبوتر کا شوق تھا۔ اور لطف یہ کہ تا عمر یہ شوق رہا۔ جب کہ اشتغال کا یہ حال ہو تو یہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ کبوتر بازی کی اصطلاحات سے اُن کو واقفیت نہ تھی۔ وہ اس فن کو اُستادوں کی طرح جانتے تھے۔ اکثر کبوتر بازی بدکر اُڑاتے اور بیسیوں کبوتر جیت کرلے آتے۔ کبوتر کے علاج معالجے میں بھی ان کو وقوف تھا۔ کبوتر کے نئے نئے رنگ پیدا کرنے کی عجب عجب تدبیریں ان کو معلوم تھیں۔ جہاں قابل لوگ ان سے شعر و شاعری میں اصلاح لیتے، جُہلا اور عوام اور نواب زادے امیر زادے ان سے کبوتر بازی میں فیض حاصل کرتے، اور ان کی واقفیت اور مہارت دیکھ کر اُن کے ہوش اُڑ جاتے۔

کبوتر چھتری پر بیٹھے ہوئے ہیں اور نظیر اُن کو دیکھ دیکھ کر خوش ہیں، اور یوں ارشاد کرتے ہیں :۔

تاروں کے وہ انداز نہیں بام فلک پر		جو کرتے ہیں چھتری کے پر ناز کبوتر	
پھر ہاتھ میں چھپی لیتے ہیں اور اس طرح فرماتے ہیں:-			
کو کرکے، جدھر کے تئیں چھپی کو ہلاویں گٹی کو نہ پھڑکاویں تو پھرتہ پہ نہ آویں		کچھ ہووے، غرض پھر وہ اُسی سمت کو جاویں چھوڑ ان کو، نظیر اپنا دل اب کس سے لگاویں؟	
	اپنے، تو لڑک پن سے ہیں دم ساز کبوتر		

صرف آٹھ بندوں کی تو ایک نظم لکھی ہے، مگر اسی مختصر میں اتنے کبوتروں کے نام بھر دیے ہیں کہ خاصہ کبوتر خانہ معلوم ہوتا ہے۔ اِن ناموں میں سے اکثر کی تحقیق ہوئی لیکن بعض ایسے ہیں کہ بڑے بڑے نامی کبوتر باز بھی اُس کی حقیقت نہ بتا سکے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظیر کی کبوتر بازی کی معلومات کس قدر زائد تھی۔

گولا۔ گرہ باز۔ بصرئی۔ کابلی۔ شیرازی۔ نساور۔ چوپا چندن۔ سبزہ۔ کمّی۔ شست رو۔ اکرے۔ طاؤسی۔ گل پوٹیا۔ نیلا۔ گلّی۔ تھیتر۔ لقا۔ چیتا۔ جوگیا۔ کھیرا۔ ٹپیت۔ چپ۔ نقتا۔ کمھرا۔ زرچہ۔ گل آنکھ۔ لل آنکھ۔ اودا۔ زردہ۔ کابرہ۔ تیرہ۔ مسی۔ توسی۔ پلکا۔ سیاہیا۔ گھاگرا۔ تنبولیا۔ پان لعل۔ اگرئی۔ سُرمئی۔ عنبری۔ خال۔ بھورا۔ گسی۔ تانبڑا۔ ببرا۔ ہسترا۔ کاسنی۔ لوٹن۔

کم و بیش پچاس قسم کے کبوتر اس میں مذکور ہیں۔ اس پچاس میں اکرے۔ کمھرا۔ ہسترا۔ ان تین قسموں کا حال معلوم نہ ہوا کہ کیا بلا ہیں۔

کبوتر کی چال اور زمزمہ سنجی کی یوں تصویر کھینچتے ہیں:-

پھرتے ہیں ٹھمک چال سُناتے ہیں خوشی سے	کیا کیا وہ غٹر غوں کی خوش آواز کبوتر	

کبوتر کی پرواز یوں دکھاتے ہیں:-

لڑتے ہیں ادھر اپنی کساوٹ کو دکھاتے	ہیں جو گیے بھی رنگ کی جوگ لئے لاتے
چیتے ہیں اُدھر سیمبری اپنی جتاتے	پریوں کے پرے دیکھ کے ہیں چرخ میں آتے

جب حلقہ زناں کرتے ہیں پرواز کبوتر

انسان میں ایک ہمدردیِ عام کا مادّہ رکھا گیا ہی۔یہی مادّہ ہی جس پر دار و مدار تمدّنِ عالم انسانی ہی۔اس عام اُلفت کے مادّے کو بعض رُباعیوں اور مثنوی میں میں نے عشق[۱] سے تعبیر کیا ہی اور واقع میں عشقِ حقیقی اسی کا نام ہی۔یہ اُلفت نہ فقط انسان کو اپنی نوع کے ساتھ ہوتی ہی بلکہ اس کا سلسلہ تمام اجزاء کائنات تک پہنچتا ہی۔جو مخلوق جس قدر اُس سے نوع میں قریب ہی اُسی قدر اُس سے زیادہ مالوف ہی گائے، بیل، گھوڑے وغیرہ سے جو اس کو ربط ہی گو اِس میں کسی قدر اپنی منفعت بھی مقصود ہی لیکن ربط کا اصلی محرّک وہی ہمدردیِ عام ہی۔جہاں جہاں جسم نامی محرّک بالارادہ دیکھتا ہی اِس کو اُس کے ساتھ ایک خصوصیت ہمدردی پیدا ہوتی ہی اور بغیر اِس کے کہ کوئی منفعت مقصود ہو اُس سے تعلق پیدا کرتا ہی اور اس کا دل تسکین پاتا ہی۔

ہر چند سوسائٹی میں ان جانوروں کے ساتھ صحبت رکھنے کا چنداں انسان محتاج نہیں لیکن اُس کا مدنی الطبع ہونا اُس کو تنہائی کے اوقات میں کبھی کبھی محض جانوروں کی صُحبت سے وہی لذّت بخشتا ہی جو کسی انسان کی صحبت سے حاصل ہو سکتی۔ لاٹیوڈ ایک قیدی کی نقل مشہور ہی کہ کس طرح چوہوں نے اُس کو قیدِ تنہائی میں مُدّتوں خوش رکھا تھا۔کس طرح وہ اُن کے قدوم کا منتظر رہتا تھا اور کس طرح اُس کو اُن کی شکر یہ آمیز

[۱] عشق سیکھو یہ نیت کے ہیے جسنِ دل، خوبیِ نیت کے لیے

اُچھل کود اور معصومانہ کھیلوں اور حرکات سکنات سے لطف حاصل ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اپنی نوع کے ساتھ اُلفت اور ہمدردی کا اُس کو موقع نہیں ملتا تو وہ ہمدردی جو عامۂ حیوانات کے ساتھ اُس کو ہے موقع پا کر اُبھرتی ہے اور اپنے فعل میں مصروف ہوتی ہے۔ نوعی ہمدردی چوں کہ قوی ہے اس لیے اُس کے مقابل میں دبی رہتی ہے لیکن جب وہ باقی نہیں رہتی تو پھر اپنا زور دکھاتی ہے۔ کبھی جب ایسی تنہائی ہوتی ہے کہ حیوانات بھی نہیں ہوتے تو فقط عام منظرِ عالم سے انسان کو وہی لُطف حاصل ہوتا ہے۔ دریا کا پاٹ۔ آسمان کی وُسعت۔ صحرا کی فضا بھی کبھی کبھی اُس کے قلب کے ساتھ وہی اثر رکھتی ہے۔

ہمدردی کے علاوہ ایک خیال تفحص اور تجسسِ احوال کا جانوروں کے پالنے میں محرک ہے۔ انسان دیکھتا ہے کہ فلاں جانور چلنے پھرنے، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے سب میں ہمارے شریک ہیں۔ لیکن خدا نے اِن کو زبان نہیں دی کہ اِن سے دریافت کریں کہ دل میں کیا سوچا کرتے ہیں؟۔ اِن کے ایک دوسرے کے ساتھ خیالات کیسے ہیں؟۔ اِن میں احسان مندیوں کا وزن کیا ہے؟۔ اِن کو اوروں کے ساتھ سلوک کے کس قسم کے قاعدے سکھائے گئے ہیں؟۔ ان میں سوسائٹی ہے یا نہیں؟۔ اور اُس کے کیا قواعد ہیں؟۔ اِن میں شر و فساد انگیزی کا کس قدر مادّہ دیا گیا ہے اور آیا وہ ضرورت سے زیادہ ہے یا ٹھیک بقدرِ ضرورت؟۔ ازیں قبیل اور بہت سے خیالات پیدا ہوتے ہیں، اور انسان کو اِسی تعلق سے اُن کے ساتھ ایک خاص تعلق خیالی پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ غیر محسوس طور پر اُن کا شوق دل میں پیدا کرتا ہے اور اُن کو گھر میں لا کر چندے اُن کی عادات و اخلاق، اور حرکات و سکنات، اور طرزِ زندگی کی تفتیش کرتا ہے، اور جس قدر اُس کی معلومات بڑھتی جاتی ہے اُس کی تفتیش کی گُدگُدی کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ اخیر میں اطمینان پیدا ہو جاتا ہے۔

تفحص کے ساتھ کسی قدر تازگی پسندی کو بھی اس میں دخل ہے۔ ہر چند سوسائٹی اُس کے لیے ایک بہت

دل کش چیزیں ہیں لیکن بعض اوقات وہ ایک ہی طرح کی مسلسل حالت کے یکسانی کے ساتھ گزرتے چلے جانے سے کسی قدر
افسردہ اور ملول ہو جاتا ہی- گھر اگرچہ منقش اور مطلا، وسیع اور پُرفضا، نہایت پُرزر پردوں سے آراستہ، اور
طلائی اور نقرئی ظروف اور لوازم خانہ داری اور اسباب زینتِ مکان سے پیراستہ ہو لیکن دن رات وہیں رہتے
رہتے کچھ ایسی یکسانی پیدا ہو جاتی ہی کہ پھر گھر کاٹنے دوڑتا ہی، اور اُس وقت یہی اچھا معلوم ہوتا ہی کہ کسی صحرا میں
کسی سایہ دار درخت کے تلے انسان بیٹھا ہو- دریا کا سیمابی تختہ لہریں لے رہا ہو- آسمان پر تارے چھٹکے ہوں چاندنی
کھلی ہو- جانور چہک رہے ہوں- علیٰ ہذا پری تمثال خاتونوں، اور غلمان وش نوجوانوں کی صحبت سے بھی
انسان اُکتا جاتا ہی، اور ایسے وقت میں ایک غزالِ وحشی کی آنکھیں ہزار حوروں کی چشمِ فتاں سے زیادہ دل فریب
معلوم ہوتی ہیں- ایک بلبل کا چہکنا ہزار ہارمونیم اور پیانو سے بڑھ کر جادو تاثیر معلوم ہوتا ہی- کبوتروں کی غٹرغوں
کسی پری وش کے ناز و نیاز سے زیادہ مزہ دیتی ہی- اور فاختہ کی کوکو حکما اور فلاسفہ کے چون و چرا سے
زیادہ لذت بخشتی ہی-

بڑے بڑے شہروں میں جو عام نزہت گاہیں اور چڑیا خانے اور عجائب خانے وغیرہ بنے ہوتے ہیں
اسی حکمت سے ہوتے ہیں- عام لوگوں کو چنداں سوسائٹی کی یکسانی ملول نہیں کرتی، لیکن جو لوگ دماغی کام زیادہ
کرتے ہیں اُن کو بہت جلد اُس کی یکسانی افسردہ کرنے لگتی ہی، اور تا وقتیکہ اُن کی تازگی پسندی نزہت گاہوں
اور چڑیا خانوں اور دوسرے ایسے مقاموں میں اپنی غذا نہ پالے گردِ ملالت رفع ہو نہیں سکتی، اور اگر ہوگی
تو دیر میں ہوگی-

بہ اعتبار اسکے کہ نظیر میں وہ ہمدردیِ عام کا مادہ بھی علی العموم لوگوں میں جس قدر ہوتا ہی اُس سے کہیں
زیادہ تھا، اور اُس میں تفتیش و تلاش کی گدگدی بھی انتہا سے بڑھ کر تھی- دماغی کاموں میں اشتغال کے سبب

تازگی پسندی سے کام لینے کا وہ زیادہ محتاج بھی تھا، ان اسباب سے اُس کو ابتدا ے عمر سے ہم جانوروں کے پالنے میں مصروف پاتے ہیں۔ پالنے کے جو بعض طیور ہیں اُن کو وہ "شوق کے طائر" اور "بازی و اشغال کے طائر" بتاتا ہے۔ شوق کے طائر سے غرض یہ ہے کہ وہ طیور جن کو انسان اُس عام ہمدردی کے تقاضے سے پالے جو ہر جاندار مخلوق کے ساتھ اُس کو ہے۔ اسی تقاضے سے پالنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ بازی و اشغال کے طیور سے مراد یہ کہ بعض اوقات انسان پر بے شغلی سے کسی قدر تکلیف ہوتی ہے، اور کوئی زیادہ اہم شغل اُس کو اُس وقت کرنا مناسب نہیں، تو اُس وقت کسی قدر اپنے آپ کو کھیل میں ڈال دیتا ہے، اور کھیل سے بعض اشغال میں مشغول ہو کر اپنے جی کو بہلا لیتا ہے۔ اس قسم کے طیور ہیں وہ ان چڑیوں کا ذکر کرتا ہے:-

بلبل۔ قمری۔ چپے۔ پدڑی۔ پدپے۔ چنڈول۔ اگن۔ لال۔ بیے۔ ابلقے۔ طوطے۔ طوطی۔ مینا۔ پپئی۔ تیتر۔ شکرے۔ کبوتر۔

کیا بلبل و قمری و چپے پدڑی و پدپے	چنڈول۔ اگن۔ لال۔ بیے۔ ابلقے۔ طوطے
کیا طوطی و مینا و پپئی۔ تیتر و شکرے	طائر ہیں، غرض، بازی و اشغال کے جتنے

کی غور تو ہیں سب میں سرافراز کبوتر

جنگِ بلبلان:- بلبلوں کے لڑانے سے بھی نظیر کو بہت شوق تھا۔ بلبل کی پٹی باندھ رہے ہیں۔ پٹی ہاتھوں میں ہے۔[۱] اڈے پر اُس کو بٹھائے لیے پھر رہے ہیں۔ لڑائی کی پالی ہوتی ہے تو اُس میں جاتے ہیں۔ عجب عجب فن معلوم ہیں، بلبلیں لڑ رہی ہیں۔ ایک کنکری پھینک کر ماری۔ بلبلوں کی گٹھری بندھ گئی۔ لوگ سمجھے جادو کیا۔ سب بولے: "واہ حضرت، اچھی یہ پڑھ کے پھونکی!"

[۱] اڈے کو چکس بھی کہتے ہیں۔

کل بلبلیں جو نو دس قابو میں اپنے آئیں
یہ شور سن کے خلقت دوڑ آئی دائیں بائیں

اُس میں سے دو پکڑ کے کشتی میں دھر بٹھائیں
کوئی بولا "واہ حضرت!" کوئی بولا "واہ سائیں!"

سو سو طرح کی دُھومیں اک دم میں کر دکھائیں
اس ڈھب سے ہم نے یارو کل بلبلیں لڑائیں

دس میں تو دو تو کٹ کٹ لڑتی تھیں کر کے کڑا
خلقت بھی آ کے ٹوٹی چھوڑا اپنا اڈّا

جب تیسری کو چھوڑا، پھر تو ہوا اکھڈّا
کڑکی کسی کی پسلی، ٹوٹا کسی کا ہڈّا

سو سو طرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں
اس ڈھب سے ہم نے یارو، کل بلبلیں لڑائیں

تھی تین کی یہ کشتی، چوتھی کو اس میں چھوڑا
پھر تو یہ پھنکا آ کر ان کشتیوں کا کوڑا

اس نے تو خم بجا کر تینوں کو دھر جھنجھوڑا
چھوٹا کسی کا ہاتھی، بھاگا کسی کا گھوڑا

سو سو طرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں
اس ڈھب سے ہم نے یارو کل بلبلیں لڑائیں

اک کنکری جو ماری پڑھ ہم نے پھر فسوں کی
سن سن کے چیخیں اُن کی لڑنے میں غرغوں کی

کشتی میں گٹھری بندھ گئی اُن چاروں بلبلوں کی
سب بولے: "واہ حضرت! اچھی یہ پڑھ کے پھونکی!"

سو سو طرح کی دُھومیں اک دم میں کر دکھائیں
اس ڈھب سے ہم نے یارو کل بلبلیں لڑائیں

ایک پودنے کی لڑائی کا قصہ بھی اسی شان سے لکھا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ ایک پودنا اور ایک پودنی جوڑے کا

جوڑا کسی پیڑ پر رہتا تھا - اگرچہ جانور چھوٹا سا تھا لیکن بڑے سے بڑے جانور کو مال موجود نہ سمجھتا تھا کسی طرف سے
ایک ارنے کا جوڑا آیا - ارنی اور پودنی میں دوستی ہوگئی - ایک روز ارنی کی شامت آئی - اُس نے اُس پیڑ سے
جس پر پودنے کا گھونسلا تھا پیٹھ اپنی کھجائی - جس سے تمام درخت ہل گیا - پودنا بہت بگڑا اور کہا: "اِس بات
سے ایک دن مردوں میں لڑائی ہو جائے گی - اِس تیرے کھجانے سے میں کہہ نہیں سکتا کیا آزار مجھ کو پہنچا ہی"
ارنی نے نہایت حقارت سے اِس کا جواب دیا تب پودنے نے کہا: "رہ، میں اس کی سزا کل تیرے ارنے کو دیتا
ہوں" دوسرے دن صبح کو وہاں پہنچا جہاں ارنا پڑا سوتا تھا اور -

وھر بیٹھ گیا کان میں باندھ اپنے پروں کو — پھڑ پھڑ کیا، اور پردے میں پنجوں کو گڑایا

اِس کے بعد جب ارنی نے بہت منت وسماجت کی تو اُس نے چھوڑ دیا - اور ارنے سے سوا بھاگنے کے
اور کچھ بن نہ آیا -

یہ قصہ از قبیل نرسری ٹیل[۵۱] ہی - جو نظیر نے اپنے لڑکپن کے زمانے میں بعض ماما دائیوں سے سنا ہوگا، اور عقل و
شعور کے زمانے میں کسی بچے کے لیے نظم کر دیا ہوگا -

شکار:- نظیر کو طیور سے اِس قدر شوق معلوم ہوتا ہی کہ جہاں کہیں موقع طیور کے ذکر کا آتا ہی وہ بے اختیار ہو جاتا ہی
اور خواہ مخواہ اُن کی ایک مطوّل فہرست پیش کر دیتا ہی - ایسا سمجھ میں آتا ہی کہ نہ فقط اُس نے گھر بیٹھے لال، بئے،
طوطے وغیرہ شوق کے جانور پال لیے ہیں بلکہ وہ اکثر اوقات باغوں میں چڑیوں کا شکار بھی کرتا پھرا ہی -
وہ تمام اُن جانوروں سے واقف معلوم ہوتا ہی جو شکار کیے جاتے ہیں - اور جب اُن جانوروں کا کہیں تقریباً
ذکر آتا ہی، چوں کہ اُن کے ساتھ اُس کے نہایت لذت انگیز اور پرلطف ایسوسی ایشن (تعلقاتِ خیالی) رہے ہیں،

۵۱ وہ کہانیاں جو بڑی بوڑھیاں بچوں کے بہلانے کو کہا کرتی ہیں -

وہ اپنے قابو میں نہیں رہتا۔ اگرچہ اُس کی فہرست ایک خشک تفصیل ہوتی ہی، لیکن چوں کہ اُس کے پُرجوش قلب سے بے اختیاری میں نکلی ہوتی ہی، سادگی اور بے تصنعی کے مزے سے خالی نہیں ہوتی۔ اُن کے ذکر میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ یہ بے ترتیبی ظاہر کرتی ہی کہ کوئی قصد تصنع کا شریک نہیں ہی۔ طبعی جوش ہی کہ اُس سے نام گنوا رہا ہی۔ ایک غیر محسوس طور پر شکار گاہ کا سرد سا اں پیش نظر ہوتا ہی، اور معلوم ہوتا ہی کہ میاں نظیر کبھی سُرخاب کے پیچھے دوڑے جا رہے ہیں، کبھی سارس شکار کیے ہوے لیے آرہے ہیں۔ کچھ رفیق بھی ساتھ ہیں۔ بعض رُفقا درخت پر ہَریل بتا رہے ہیں۔ بعض فاختہ کا نشان دیتے ہیں۔ اِن کی آنکھیں شاخوں سے منجّمبنا نہ لڑی ہوئی ہیں۔ تپّے تپّے میں ڈھونڈھ رہے ہیں۔ لیجیے اُنھوں نے جانور کو دیکھ بھی لیا۔ بندوق کو چھتیاتے ہیں۔ ایک آنکھ بند کی ہی توڑے پر ہاتھ ہی۔ وہ لیجیے دَن سے فیر ہوئی۔ ہَریل بسمل ہو کر نیچے آتا رہا۔ فاختہ بھی ایک طرف تڑپ رہی ہی۔ قرولی لے کر احباب دوڑے ہیں۔ میاں نظیر بے اعتنائی سے اور شکار کی تلاش میں دوسری طرف بڑھے جا رہے ہیں۔ گویا فاختہ اور ہَریل کے شکار سے اُن کو چنداں خوشی نہیں۔ جمنا کا کنارہ ہی۔ ایک جوڑا سرخاب کا بیٹھا ہوا ہی۔ آڑ بھی موقع کی ہی۔ نظیر بڑے اہتمام سے نشانہ کرتے ہیں۔ فیر ہوتے ہی نر بسمل ہو گیا۔ مادہ اُڑ گئی ہی مگر سر کے اوپر منڈلا رہی ہی۔

جنگ بلبلان۔ ذکرِ مرغان۔ ہنس نامہ۔ پودنے کی لڑائی۔ ذکرِ بیا۔ اور بعض اور متفرق اشعار سے ہم کو نظیر کے خیالی چڑیا خانے میں یہ طیور ملے ہیں۔ جن میں بعض شوق کے طائر ہیں۔ بعض شکاری۔ بعض شکار۔

چنڈول۔ اگن۔ ابلقے۔ جھپان۔ بیا۔ دہیڑ۔ مینا۔ کلکلیان۔ بگلے۔ طوطے (ٹوئیان۔ لہبر) بلبل۔ کوکلے۔ کویل۔ کھنجن۔ کُلنگ۔ سیمرغ۔ گرڑھ ہنکھ۔ سارس۔ خواصل۔ گدھ۔ باز۔ جُرّہ۔ شاہین۔ بحری۔ شکرہ۔ سبزک۔ بڑنکے۔ ٹنٹن۔ بٹیرے۔ پنڈخی۔ ٹوٹرو۔ قمری۔ ہریوہ۔ غوغائی۔

بگیری - لٹورے - پپیہے - لال - چڑے - پودنے (پودنا پودنی) - پدّے - پدڑی - بٹیر - لوے - تیتر - کبک - تدرو - ہدہد - بڑھیا - کوّے - چیلیں - طوطی - مور - کبوتر - شام چڑے - جھانپو - ہریل - سارو - مرغ - مرغی - چغد - اُلو - پنکھ ہوا - عنقا - ہرّے - پنکھ - ٹٹیری - فاختہ - تیہو - ابابیل - چکور - لم ڈھیک - مولا - کرّا - لگھڑ - لگھڑی - چپے -

شوق کے طائر :- چنڈول - اگن - ابلقے - بیے - دہیڑ - مینا - پپئی - بگلے - طوطے - بلبل - کوئل - قمری - کبوتر - پپیہا - لال - بٹیر - تیتر - طاؤس - شام چڑے - طوطی -

شکاری طائر :- باز - جرّہ - شاہین - بحری - شکرہ -

شکار :- کلنگ - گرڑھ پنکھ - سارس - ٹنٹن - بزّے - پنڈخی (فاختہ) - ٹوٹرد - ہریوہ - غوغائی - بگیری - لٹورے - چڑے - پودنے - پدّے - پدڑی - لوے - کبک - تدرو - ہدہد - بڑھیا - جھانپو - ہریل - سارو - ہرّے - تیہو - چکور - لم ڈھیک - کرّا - چپے - کھنجن - برٹنکے - پنکھ ہوا پنکھ

معمولی طیور :- چھپان - سیمرغ - حواصل - سبزک - زاغ - زغن - چغد - اُلو - عنقا - ٹٹیری - ابابیل - مولا - لگھڑ - لگھڑی - (زاغ زغن چغد - ایک اعتبار سے شکاری طائر ہیں) -

خانگی طیور :- مرغ - مرغی -

سب کچھ ذکر کیا ہی لیکن بٹیر کی لڑائی کا کہیں تفصیل کے ساتھ مذکور نہیں ہی - دو حال سے خالی نہیں - یا تو انھیں اس جانور سے شوق نہیں تھا، یا یہ کہ اتفاقی بات ہی کہ اُس کا کہیں ذکر ان کے کلام میں نہ آسکا یہ بھی ممکن ہی کہ اس کا حال لکھا ہو مگر موجودہ مجموعے سے وہ غائب ہو - ضمناً کہیں کہیں ذکر آیا ہی، مگر اس سے ان کی شیفتگی اس جانور کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی مرغ کی لڑائی کا بھی کہیں شاید مذکور نہیں ہی - اور یہ بھی سخت موجب

تعجب ہی۔ چوں کہ یہ جانور عموماً خوار طور پر لڑتے ہیں شاید اس وجہ سے اُن کو مرغوب نہ ہوں۔ بہر حال انکا ذکر کہیں نہیں ہی یہ بھی ممکن ہی کہ چوں کہ بعض اور اساتذہ نے مُرغ کی لڑائی کا ذکر کیا ہی، اِس لیے اُنھوں نے اُس کا مذکور تحصیلِ حاصل سمجھا ہو۔

تیراکی:- انسان جب اَور جانوروں کو دیکھتا ہی کہ وہ اُس سے بعض کمالات زیادہ رکھتے ہیں، باوجودیکہ نعمتِ عقل سے محروم ہیں، تو اُس کو خواہ مخواہ ایک قسم کا رشک پیدا ہوتا ہی، اور مادّۂ منافست جوش میں آتا ہی۔ دیکھتا ہی کہ مچھلیاں پانی میں آزادی سے تیر سکتی ہیں۔ کچھوے اپنا چین کرتے پھرتے ہیں۔ کیکڑے فراغت سے پانی کی سطح پر سیر کر رہے ہیں۔ اور اُن کو اِس تیرنے میں کسی قسم کی صناعی جدوجہد کی ضرورت نہیں۔ اُن کے جسم کی ترکیب ہی کچھ اس وضع پر ہی کہ اُن کو پانی ڈبا نہیں سکتا۔ (غرض ایسے جانور بکثرت ہیں جو پانی میں تیر سکتے ہیں۔ بہ کثرت اَور بھی اِس کی آتشِ رشک کو بھڑکاتی ہی)۔ اگر فقط آبی جانور پانی میں تیر سکتے تو شاید کچھ اُس کو تسلی ہوتی، لیکن نہیں وہ دیکھتا ہی کہ وہ جانور بھی تیر سکتے ہیں جو اُسی کی طرح خشکی میں رہتے ہیں۔ گائے بیل۔ گھوڑے۔ ہاتھی۔ شیر۔ کُتّے۔ سانپ۔ بچھّو۔ اِن میں سے کوئی بھی تو ایسا نہیں جو تیر نہ سکتا ہو۔ اِس سے وہ آتشِ رشک بھڑک کر چوگنی ہو جاتی ہی۔ جب منافست کے مادّے کے اشتعال کے اِتنے سامان تھے تو وہ چُپکا کیوں کر رہ سکتا تھا۔ اِس کے علاوہ بسا اوقات اُس کو بضرورت عبورِ آب کرنا پڑتا تھا۔ غرض وہ اِس نقص کی تلافی میں مصروف ہوا۔ پہلے تو اُس نے چھوٹی چھوٹی کشتیاں بنائیں۔ گھڑنائیں طیار کیں۔ پھر رفتہ رفتہ اُس نے تیرنے کا فن ایجاد کیا۔ اُس نے دیکھا کہ انسان اور دیگر حیوان میں فرق یہ ہی کہ اور جانوروں کا سر کسی قدر چھوٹا ہی، اور انسان کا سر سب سے بڑا ہی۔ پس جو دقّت اس کو تیرنے میں ہی اسی سر کے بڑے ہونے کی وجہ سے ہی۔ اگر کسی طرح وہ سر کو سطحِ آب پر رکھ سکے، تو پھر تیرنے میں کسی طرح کا اشکال نہیں۔ اُس کے

رفتہ رفتہ اُس کو طریقے معلوم ہو گئے۔ پھر تو ضبطِ نفس وغیرہ کے ذریعے سے اُس نے یہ کمال بہم پہنچایا کہ بعض وقت کرامات میں اور اُس میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ مشہور ہی کہ اولیاء اللہ سطحِ آب پر سے گزر گئے اور قدم ترنہ ہوا تیرنے والوں میں قدم ترنہ ہونے کا کمال تو بے شک نہیں ہی لیکن وہ سطحِ آب پر اس طرح بیٹھے جا رہے ہوتے ہیں کہ معلوم نہیں ہوتا وہ پانی پر ہیں۔ ہاتھ میں پنجرہ لیے ہوئے ہیں۔ سر پہ طوطا بیٹھا ہوا ہی۔ پتنگ اُڑا رہے ہیں سوئی میں دھاگا پرو رہے ہیں۔ حقّوں کا دم لگ رہا ہی۔

آگرے[1] میں ہر سال برسات کے دنوں میں تیراکی کا تماشا ہوا کرتا تھا۔ جس طرح بنارس میں بُڑھوا منگل ہوتا ہی وہاں بھی لوگ برسات کی خوشی کرتے تھے۔ جمنا کے کنارے ہزاروں خلقت کا ہجوم ہوتا تھا۔ بہت سے کنارے ہی پر ناچ رنگ کا رنگ جمائے ہوئے ہیں۔ بہتیرے اپنے احباب کو لے کر سجی سجائی کشتیوں میں بیٹھے ہیں۔ کوئی اونچی چوٹی کی رنڈی ساتھ ہی۔ ناچ گانا ہو رہا ہی۔ طبلے کھڑک رہے ہیں۔

ناؤوں میں وہ جو گُل رونا چوں میں چھک رہے ہیں
تانیں ہوا میں اُڑتیں، طبلے کھڑک رہے ہیں
جوڑے بدن میں رنگیں، گہنے بھبک رہے ہیں
عیش و طرب کی دھومیں پانی چھپک رہے ہیں

سو ٹھاٹھ کے بنا کر اطوار پیرتے ہیں

[1] بھادوں میں تیرائی ہوتی ہی۔ ناؤوں پہ ناچ ہوتا جاتا ہی۔ دو روز تیرائی کا میلا رہتا ہی۔ خواجہ امیر جو نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے عہد میں اپنے والد کے ساتھ آگرے گئے تھے اس تیرائی کی نسبت اپنی کتاب معدن الجواہر میں یوں تحریر فرماتے ہیں:۔ "خانۂ ما بادریائے جمن پُر قریب بود۔ چوں بسیر دریا می رفتیم اکثر اوقات میدیدیم کہ شناوران بسیار بشنا آشنائی نشوند و صنعتہائے بے شمار دریں علم بکار می بردند چنانچہ شخصے بود موسوم بہ (موتی مشر) کہ صد ہا شاگرد داو بودند و قدرت و دستگاہ شناہ آں قدر داشت کہ دہ انگشت دست خود بہ بست دہ تا آشنائی داد و شنا کردہ آں طرف دریای برد۔ و بازہمچناں ہمہ راایں روبے آب می آورد۔ و شخص دیگر بود مسمّی بہ (بھوفا مشر) و ہنرش ایں بود کہ دست و پایش بہم بستہ بدریای انداختند و بہماں حالت غوا صیہا کناں و آب رزاں عبور بحر زخار بر شنائی کرد و کرانہ موج می زد و می آورد و بازمی آمد۔ و درانجا (اکبرآباد) رسم قدیم است کہ در ہر سال بروز معینے کہ ہست ہمہ شناوران مجتمع شدہ آب ورزیہای کنند و ہنرہا و صنعتہای خود شاں می نمایند و بہ کنار دریا طعامہای پزند۔ و بعد از نصف روز ہمہ شناگران آمدہ چاشت می کنند و دیگر تماشائیان ہزارہا آمدہ گل سُرخے (میلا) می سازند و آب رزاں پس از اکل اطعمہ نفس راست کردہ باز بشنا مشغول می گردند و بیگاہ (شام) بخانہائے خود مراجعت مے نمایند۔

اس آگرے میں کیا کیا، ای یار، پیرتے ہیں	
کچھ ناچ کی بہاریں، پانی کے کچھ لتاڑے	دریا میں مچ رہے ہیں اندر کے سو اکھاڑے
لب ریز گل رخوں سے دونوں طرف کراڑے	آ جا رے ناؤ چھوڑ دو نگی ہے؛ نواڑے
ان جمگھٹوں سے ہو کر سرشار پیرتے ہیں الخ	

جھرنے سے لے کے سہجا[51] (یا سجا) کے نالے تک اور چھتری سے لے کے برج خونی[52] اور دارا کے چبوترے تک پھر مہتاب باغ سید نیلی قلعہ روضہ[53] حکیم کا باغ۔ تشیو داس کا چمن سب جگہ لوگوں کا انبوہ اور تماشائیوں کا غل شور ہوتا تھا۔ جگہ جگہ پر مجلس ہے، انجمن ہے۔ میوہ مٹھائی بک رہا ہے۔ ناچ ہو رہے ہیں۔ ہر ایک مقام پہ چرچے ہیں کہ آج فلاں فلاں استاد تیریں گے۔ فلاں کا ایک شاگرد بھی بہت ہوشیار نکلا ہے۔ کچھ دنوں میں استاد سے بڑھ جائے گا۔ جدھر نظر کیجیے سیر ہی سیر نظر آتی ہے۔ بڑے چھوٹے سب عمدہ عمدہ پوشاکیں پہن کر آئے ہیں عورتیں اور لڑکے اپنے رنگ برنگ کے لباس سے کنارۂ دریا کو صحن گلزار بنائے ہوئے ہیں۔ ہر شخص کے چہرے پر انبساط کا گلدستہ کھلا ہوا ہے۔

لیجیے استاد دریا میں کود پڑے۔ انواع طرح سے تیر رہے ہیں۔ اور ہر جگہ تیر رہے ہیں۔ کھڑی[54]۔ چادر بند۔ نا[illegible]۔

---

٥١ بادشاہی وقت میں سجا یا سہجا کوئی امیر عورت تھی۔ اسی نے وہ محلہ بسایا۔ نالا اسی کے نام سے مشہور ہے۔

٥٢ برج خونی پہ ایک توپ رہتی تھی جو آدمی کا بل لیتی تھی۔ تب چلتی تھی۔ جمنا کے کنارے ہے۔

٥٣ روضہ دریا کنارے ہے، مگر اب دریا ہٹ گیا ہے اور سڑک بن گئی ہے۔ قحط میں آدمی کے بچانے کو سرکار نے بنائی۔

٥٤ اس مقام پر ایک امر قابلِ ذکر یہ ہے کہ وہ بند جس میں نظیر نے یہ اصطلاحیں درج کی ہیں اکثر محققین کے آگے بغرض تحقیق پیش کیا گیا مگر کسی نے تحقیق شافی نہ فرمائی بعضوں نے کہا اس وقت نوٹ کے کاغذات حاضر نہیں لیکن مجمل یہ ہے کہ یہ موجوں اور گردابوں اور اسی قسم کی سطح دریا کی اور مختلف کیفیتوں کے نام ہیں بعضوں نے دعویٰ کیا کہ میں بتا سکتا ہوں مگر فرادی فرادی جب ہر ایک کی ماہیت دریافت کی جانے لگی تو بغلیں جھانکنے لگے۔ آخر آگرے کے تیراکوں سے پوچھا گیا لیکن بعض الفاظ سے وہ بھی نا آشنا نظر آئے۔ غرض اس تجسس و تلاش سے یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ نظیر کی زبان ثانی ایک [illegible] ناپیدا کنار ہے جس کی نہ تھاہ ہے نہ اور چھور۔ ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء واللّٰہ ذو الفضل العظیم

چکوا - بینڈا - بھنور - اُچھالن - چکر - سمیٹ - مالا - مینڈا گھمیر - تختہ - کسنی پچھاڑ - گرا - پانی کو ئی شکل اختیار کرے بہر شکل یہ تیر رہے ہیں - لوگوں سے دادیں مل رہی ہیں -

کتنے کھڑے ہی پیریں، اپنا دکھا کے سینا	سینہ چمک رہا ہی ہیرے کا جوں نگینا
آدھے بدن یہ پانی، آدھے یہ ہی پسینا	سرووں کا یہ چلا ہی گویا کہ اک قرینا

دامن کمر پہ، باندھے دستار پیرتے ہیں - الخ

جاتے ہیں اُن میں کتنے پانی یہ صاف سوتے	کتنوں کے ہاتھ پنجرے، کتنوں کے سر پہ طوطے
کتنے پتنگ اُڑاتے، کتنے سوئی پروتے	حقّوں کا دم لگاتے ہنس ہنس کے شاد ہوتے

سو سو طرح کا کر کر بستار پیرتے ہیں - الخ

نظیر نے برسوں یہ تماشا دیکھا تھا - اور حق یہ ہی کہ تیراکی کا تماشا آگرے سے بہتر دوسری جگہ کم ہوتا ہوگا - پھر کیوں کر گمان کیا جا سکتا ہی کہ اُس کے دل میں اُس کے سیکھنے کا جوش نہ پیدا ہوا ہو - روضۂ جہاں یہ رہتے تھے، جمنا کے کنارے ہی واقع ہی - سال کے تماشے کے ماورا وہاں گھاٹ پر نہانے والوں اور تیرنے والوں کا روز اس قدر ہجوم رہتا ہی کہ معمولی سے آدمی کے دل میں بھی بے تحریک پیدا کیے رہ نہیں سکتا - چہ جائے کہ وہ تو نظیر تھے - نظیر نے گو اس فن میں وہ مرتبہ حاصل نہ کیا ہو جو اُستادوں کا ہوتا ہی لیکن پھر بھی معمولی لوگوں سے کسی قدر زیادہ جانتے تھے - اور بعض تیرائیاں عمدہ بھی اُن کو معلوم تھیں - بعض اوقات جوانی میں جب کچھ ہم عمر نوجوانوں کا ساتھ ہوا ہی تو جمنا پار بھی ہو گئے ہیں - جس جوش، اور جس واقفیت کے ساتھ اُنھوں نے آگرے کی تیراکی کا بیان کیا ہی، وہ اُن کی شناوری کی دلیلِ روشن ہی -

اکبر آباد کی تعریف میں جو نظم ہی اُس میں بھی جہاں نہرِ جمن کا ذکر آیا ہی تو بے اختیاری میں نظیر اہلِ شنا

اور شناوری کا ذکر کر گئے ہیں :-

گر یاں کے پیرنے کا کروں صف میں رقم پیرے ہیں اس روش کی بہاروں سے ہو بہم	تو تختۂ صفحہ بیچ سے لگے پیرنے قلم سو سو چمن بھرے ہوئے شبنم کے دم بہ دم
آجاتے ہیں نظر وہیں دریا کے درمیاں	
اہلِ شنا جو کرتے ہیں سو سو طرح شنا ملتا نہیں کنار کچھ عشرت کے بحر کا	لہریں نشاط و عیش کی اُٹھتی ہیں دل میں آ ساحل پہ جوشِ خلق سے ملتی نہیں ہی جا
ہوتا ہی وہ ہجوم بھی اک بحرِ بیکراں	

علیٰ ہذا بزم عیش میں بے اختیار ہو گئے ہیں :-

(دریا کا سین - عورتیں) بحرِ الطافِ جمنا دریں جا ہچناں جاری است کہ در چمنستان نسیم سحری و در بستان بادِ بہاری - بر ساحلِ بے خطرش ہجومِ آب کشاں و غسل سازاں، و اکثر بار چنیں بہار کہ گلعذاران جلوہ طراز می شوند، و برہمنانِ صندل سا چوں خطوطِ تلک و رشتۂ زنار صف درازمی بندند - طرۂ پرچینِ دل براں نمودِ موجِ مسلسل پرداز، و خاطرِ مسرورِ دل بستگاں چوں حباب کلاہ بہوا انداز - قیامِ موزوں قداں تمثیلے می جوید جز سرو و شمشاد بر کنارِ نہرِ نہال کدام مضموں بلند باید گردانید، و تمکنِ سیم براں تشبیہے می خواہد، غیر از نسرین و نسترن بر لبِ آب جو چہ غنچۂ سخن بہ شگفتگی باید نشانید - نازنینانِ آب تا کمر دیدن سرو در بحیر با صنوبر، و تریِ جسمِ نزاکت آگیں و زلفِ معنبر گُل سیراب و سنبل تر -

(تیرائی کا میلا - تیراک) علی الخصوص وقتی کہ شناوران بشتابی پرداز ند و غول خودنمایاں می سازند - بہ علم شنا دریا، و از دقائق شناوری آں قدر آشنا کہ وسعت روے آب را فرشِ چاندنی می دانند، و ہجومِ امواج را

لہر سیتل پانی - چکوہ پر چکا بورا پونچ، و پیچ گرداب را ہیچ - چادر اڑتے تار تار، و چار موج نیز ناچار - سر کشا طرفگی فزا، و مور چال تحیر پیرا جنبشِ دست بآں صافی کہ رشحہ نہ جنبد، و تحریک پا باایں خوبی کہ آب نہ رنجد - سرخاب خجلت یاب، و بط آب آب - با قامت بہارِ کنول و نیلوفر، و بروانی چمن روان در نظر - بے کدو چناں روند کہ لعبان تیز رو کدو، و تا غوطہ نہ زنند آب مشتاقِ گلو - کارے می کنند کہ چیں ہر موج زبانِ تحسین، و ہنری می نمایند کہ حباب گرد آفریں - صدائے جی بآہنگے کہ چہ چہ بلبلاں بہ چمن، و کلاہ رنگا رنگ بنوعے کہ شگفتنِ گل ہا بہ گلشن - چندے ترانہ و دستک پرداز، و اکثرے ستار و منہ چنگ نواز - انبوہِ تماشائیان بر ساحل - و انواعِ سیر و تماشا حاصل -

زجمنا عالمے صد عیش یاب است	بخوبی خوش تر از بحرِ خوشاب است
ز آبش ماند ایں جا مثلِ گلشن	چراغِ خضر تا سازند روشن

(نظیر کی تعلیم و تربیت)

میاں نظیر کھیل تو آپ بہت چکے۔ اب مکتب کا رُخ کیجیے۔ ماما دائیوں کی گود چھوڑ کر بوڑھے شفیق استاد کے آغوش تربیت میں جگہ لیجیے۔ چار برس چار مہینے چار دن بہت ہوتے ہیں۔ اس اثنا میں (آپ کے قویٰ نے بہت کچھ ابتدائی معلومات فراہم کر لی ہیں) آپ بہتیرے پھول سونگھ چکے ہیں۔ بیلا۔ گلاب۔ چنبیلی۔ ہزارہ چنپا۔ جوہی۔ کیوڑہ۔ موتیا۔ شب بو پر آپ گھنٹوں وجد کر چکے ہیں۔ عطر بھی بیسیوں قسم کے مل چکے ہیں۔ پھل بھی کئی طرح کے کھا چکے ہیں۔ تربوز۔ ککڑیاں۔ خربوزے۔ بیر۔ سنگترے۔ نارنگیاں۔ کیلے۔ آم۔ انار۔ انگور سب کا مزہ آپ کے کام و دہن میں موجود ہے۔ سیریں بھی ہزاروں دیکھ چکے ہیں۔ تماشے بھی انواع طرح کے آپ کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ گھر کے رشتہ مند اور بڑی بوڑھیوں کے لاڈ پیار بھی بہت ہو چکے۔ اب کیا آپ عمر بھر کھیلتے ہی رہیں گے۔ زیور اور رنگین کپڑوں سے دل سیر نہیں ہوا تو ابھی چندے انھیں رہنے دیجیے۔ لیکن خدا کے لیے کھیلنا تو اب چھوڑیے۔ کھیلنے کو بھی مطلق منع نہیں کیا جاتا۔ کھیلیے۔ لیکن گھڑی دو گھڑی پڑھ کر اور سبق یاد کر کے۔

"آبا میں پڑھوں گا لیکن پہلے آپ میری دھوم سے بسم اللہ تو کر دیجیے۔" "ہاں صاحب! اس کا مضائقہ نہیں۔ اچھا بتاؤ۔ تمھاری بسم اللہ میں کتنی مٹھائی آئے؟۔ اور کون کون سی؟"۔ "ابا، اور کچھ ہو کہ نہ ہو تل کے لڈو ضرور ہوں۔ اور مٹھائی دس من سے کم نہ ہو۔"

"بیٹا۔ تل کے لڈو تو دوا کی مٹھائی ہے۔ وہ بانٹنے کے مصرف کی نہ ہو گی۔ کوئی اور مٹھائی تجویز کرو۔"

"تو اچھا برفی منگوائیے - خوب میٹھی ہوتی ہے - لب چپکتے ہیں۔"

"اس تجویز پر تمھاری میرا بھی صاد ہے۔"

"ابا، مٹھائی بٹنے لگے تو تھوڑی مجھے بھی دیجیے گا - مرزا کا بیٹا جو میرے ساتھ کھیلتا ہے میں اُس کو دوں گا اور دو ایک لڑکے اور بھی ہیں - اور ایک شخص کو اور دینا ہے وہ آپ کو نہ بتاؤں گا۔"

"میں سمجھا تم اپنی انا کو دینا چاہتے ہو۔"

"جی نہیں - اُس کو تو آپ خود دیں گے۔"

"تو پھر کس کو دوگے؟"

"جب آپ مٹھائی دے لیں گے تو بتا دوں گا۔"

کچھ اسی قسم کی تقریر باپ بیٹے میں ہوتی ہے - باپ مسکراتے ہوے فکرِ بسم اللہ میں تشریف لے جاتے ہیں - حلوائی پر مٹھائی کی فرمائش ہوتی ہے - فرش فروش کا سامان کیا جاتا ہے - دعوت کے رقعے تقسیم ہوتے ہیں - اہلِ شہر جمع ہوتے ہیں - شہر کے کسی مقدس مُلّا کے سامنے نظیر بٹھایا جاتا ہے - قرآن شریف رحل پر رکھا ہوا ہے - مُلّا صاحب اُس سے دو چار اخلاق آمیز باتیں کرتے ہیں - وہ ہر بات کا معقول جواب دیتا ہے - مُلّا صاحب "ماشاء اللہ ماشاء اللہ" کہتے جاتے ہیں - ایک ہاتھ میں تسبیح ہے - دوسرے میں ناسدانی ہے - تسبیح والے ہاتھ سے قرآن شریف کھولتے ہیں - اور نظیر سے سورۂ اقرأ باسم پر اُنگلی رکھواتے ہیں - اور اُس سے کہتے ہیں "کہو اقرأ باسم ربک الاعلےٰ الذی خلق خلق الانسان من علق" بعض مخارج کے ادا کرنے سے گو نظیر قاصر ہے - مگر الفاظ پورے پورے ادا کرتا ہے - مُلّا صاحب کو مکرر کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی - اسی طرح تین دفعہ پڑھا کر - مُلّا صاحب نظیر کے علم کے لیے دعا کرتے ہیں اور نظیر کو شاباش اور اُس کے باپ کو مبارک باد

دیتے ہیں۔ پھر چاروں طرف مبارک باد کا غل مچ جاتا ہے۔

دو چار روز تک تو نظیر کو کوئی کچھ نہیں چھیڑتا۔ لیکن جب پھر ہفتے کا دن آیا تو باپ نے اُس سے کہا کہ "بیٹا اب مکتب جاؤ۔ مولوی صاحب کئی دن سے تمہارا انتظار کھینچ رہے ہیں۔" نظیر نے کہا "میں خود حیران تھا کہ ایک ہی دن پڑھنا ہو کر رہ گیا۔ مجھ کو مُلّا صاحب نے جو کچھ پڑھایا وہ بہت بھلا معلوم ہوا۔" اس کے بعد نظیر بغل میں قاعدہ دبا کر مکتب میں پہنچتے ہیں۔[لہ] اُستادِ شفیق نہایت شفقت کے ساتھ دو چار حرف بتا اور پہچنوا دیتے ہیں۔ "الف خالی[لہ] ۔ بے کی پیٹھ پر ایک نقطہ۔" "مولوی صاحب، یہ نُقطہ تو ٹھیک اُسی برفی کی طرح ہے جو میری بسم اللہ کے دن بٹی تھی۔" "ہاں صاحب جبھی تو پڑھنے لکھنے میں اس قدر مزہ ہے۔" "لیکن بے کو برفی ملی اور الف کو نہیں۔" "یہ شاید بانٹنے والوں کا قصور ہے۔" "جی ہاں کم بخت بانٹنے والے بڑے بدذات ہوتے ہیں۔ میرزا میرا ایک دوست ہے۔ وہ لاکھ مانگتا رہا مگر اس بے چارے کو کسی نے ایک ٹکڑا بھی نہ دیا۔" اُستاد شاگرد میں اس طرح کی باتیں بھی ہوتی جاتی ہیں۔ اور پڑھنا بھی ہو رہا ہے۔ جب اس شفقت اور مہربانی کی پڑھائی

لہ۔ مکتب میں اُس کے باپ نے لا کر بٹھا دیا ✤ اک قاعدہ بھی سامنے اُس طفل کے رکھا ✤

لہ اِس مقام پر انشا کی یہ غزل خالی از لطف نہیں:۔ تب سے عاشق ہیں ہم اے طفل پری زاد ترے ✤ جب سے مکتب میں لگا پڑھنے الف بے تے ثے ✤ یاد آتا ہے وہ حرفوں کا اُٹھانا مجھ کو ✤ جیم کے پیٹ میں اک نقطہ ہے اور خالی حے ✤ خے کی پھر شکل جو حاصل کی سی آتی ہے نظر ✤ نقطہ جو اُس پہ لگا دیں تو ہوئی پھر وہ بخے ✤ دال ہے کُبڑی سی انا کی مری قد کی شبیہ ✤ ہے سویک پانچ ہے بن بیٹھی ہے اور بن نقطے ✤ ذال بھی چھوٹی بہن اُس کی ہے جوں آتوں جی ✤ ایک پرکار سا ہی سانحہ ہے گھونس اُس کے ✤ رے بھی خالی ہے و رے زے پہ بھی ہے اک نقطہ ✤ کہ مشابہ ہے یہ تِل سے مرے رخسار تلے ✤ سین خالی ہے بڑے شین پہ ہیں نقطے تین ✤ صاد اور ضاد میں بس فرق ہے اک نقطے سے ✤ طوے بن ظرّہ ہے اور ظوے پہ ہے اک نقطہ ✤ عین بے عیب ہے اور کانے میاں غین ہوے ✤ فے پہ اک نقطہ ہے اور قاف پہ ہیں نقطے دو ✤ کاف بھی خالی ہے اور لام بھی خالی ہوے ✤ میم بھی یوں ہی ہے اور نون کے اندر نقطہ ✤ مُغلسا بیگ ہے یہ واو بھی اور چھوٹی ہے ✤ کیا خلیفہ جی یہی ایسی پھبن سے نکلے؟ ✤ آکے چھٹی دوا بھی لام الف ہمزہ یے ✤ گالیاں تیری ہی سنتا ہے یہ انشا ورنہ ✤ کس کی طاقت ہے کہے کوئی جو یہ اُس کو بے ✤

ہو تو پھر کیوں نہ پڑھنے والے کا جی لگے جمعے کو گو تعطیل کی خوشی ہوتی ہے لیکن نہ ویسی جیسی اور لڑکوں کو کہ سمجھتے ہیں قید خانے سے چھوٹے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں نظیر قاعدے کو ختم کرتا ہے۔ اُستاد کو قاعدہ ختم کرانے کا انعام الگ ملتا ہے اور سیپارۂ عم شروع کرانے کی نذر جدا۔ سیپارہ شروع ہوتا ہے تو مٹھائی آتی ہے اور نیاز ہوتی ہے۔ پیمبر کی رُوح کو ثواب بخشا جاتا ہے۔ ترقّی علم کی دُعا مانگی جاتی ہے۔ لڑکوں میں مٹھائی تقسیم ہوتی ہے۔ میاں نظیر خود اندر باہر خوشی خوشی تقسیم کرتے پھر رہے ہیں۔ سب سے دُعائیں لے رہے ہیں۔ سیپارہ بھی تین چار مہینے میں تمام ہوتا ہے۔ بعد ازاں حضرت سعدی کی روحِ پُر فتوح مکتب میں داخل ہوتی ہے اور نظیر کے سامنے کریما کھلتی ہے۔ یہ کب اوستاد کے خیال میں ہوگا کہ ایک زمانہ وہ بھی آئے گا کہ نظیر جس کتاب کے اشعار بلا فہمِ معنی فقط وزن کی چاٹ پر یاد کر رہا ہے اُس کی بحر کا ایسا آشنا ہوگا کہ اُس میں تضمین کی ناؤ کھیتا پھرے گا۔ وزن کا پسند کرنا طبیعتِ انسانی کا عام خاصہ ہے۔ نظیر کی طبیعت تو شاعری کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی۔ سمجھنے کی بات ہے کہ اُس کو کریما کا موزوں کلام کس قدر پسند آیا ہوگا۔ جیسے خانۂ نگین میں نگینہ بیٹھ جاتا ہے اُس کے اشعار ذہن نشین ہو جاتے تھے اور پھر کسی طرح بھولتے نہ تھے۔ دو چار روز تک ایک ایک شعر کی نوبت آئی۔ پھر تو اُس کا کچھ ایسا باہرہ کھلا کہ چار چار پانچ پانچ شعر پڑھ جاتا اور گھنٹے بھر میں یاد کر کے رکھ دیتا۔ کریما کے ساتھ ساتھ کبھی اُستاد اور کبھی بعض مکتب کے اور لڑکوں سے بیت بحثی کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا۔ اب جہاں کہیں شعر دیکھتا اُس کے اوّل اور آخر حرف پر اس کی نظر پڑتی اور اس طرح ایک غیر محسوس طور پر املا کا اُس کو خیال ہو چلا۔ بیت بحثی نے اس کے مذاقِ نظم کو کسی قدر اور گہرا کر دیا اور حافظے میں چسپیدگی کا مادہ کسی قدر اور بڑھ گیا۔ رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ حریف سے اگر کوئی نیا شعر سُنتا ایک دفعہ میں اُس کو یاد ہو جاتا۔ کریما کے بعد مامُقیماں شروع ہوئی۔ مامُقیماں کے ختم ہونے پر خالق باری کی باری آئی اور آمدنامے کی آمد آمد ہوئی۔ خالق باری نے ایک مختصر

ذخیرۂ فرہنگ کے علاوہ اُس کو مختلف بحروں سے بھی آشنا کیا اور اب وہ رفتہ رفتہ ہر بحر کے اشعار کے پڑھنے پر قادر ہو چلا۔ بیت بحثی کے شوق نے اُس سے محمود نامہ اور عطائی نامہ بھی پڑھوایا۔ کتابوں میں جو اشعار اُس نے پڑھے اُن کے علاوہ اُستاد سے سُنے یا اور ہم مکتبوں سے جواب میں پائے یا اور کسی بھلے مانس کو پڑھتے دیکھا وہ بھی یاد کر لیے۔ اور اب بات کرنے کے بہت سے مضحک اور حکمی ہیچ اُس کو یاد ہو گئے۔ ردیف ڑائے مثقلہ اور ث اور ڈھ اور ق اور ژ وغیرہ کے اشعار اُس کو بکثرت یاد تھے اور اُن کے جوابی اشعار بھی۔ اُس کا ذہن اِس چھوٹی ہی سی عُمر میں ایک اچھا خاصہ مجموعہ اشعار کا ہو گیا تھا۔ اور شاید یہ اسی کا صدقہ تھا کہ بعض اوقات بعض موزوں مصرعہ بھی بے ساختگی میں اُس کی زبان سے نکلنے لگا۔ اِس مذاق شعر و سخن کے بعد آمدنامہ کے رُوکھے پھیکے صیغوں نے کسی قدر اُس کو تکلیف دی لیکن مکتب میں اور لڑکے بھی پڑھتے تھے اور اُن سے پیچھے رہنا یہ اپنے لیے موجب کسرِ شان خیال کرتا تھا اِس لیے کسی طرح دھکم پشتم بڑھتا چلا گیا۔ اُس مشکل راہ سے گزر کر اُس نے دیکھا کہ اُس کے آگے ایک نہایت پُر فضا وعظ و نصائح کی پھلواری کھلی ہوئی ہے۔ حضرت سعدی اُس پھلواری کے مالی ہیں۔ اور کچھ اِس قسم کے گلدستے طیار کر رہے ہیں:-

گلے خوشبوئے در حمام روزے
رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مُشکی یا عبیری
کہ از بوئے دل آویزِ تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم
و لیکن مُدتے با گُل نشستم
جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

کمالِ

اِس باغ میں اُس کی رُوح بہت خوش ہوئی۔ ہر گلدستے کو سونگھتا اور اپنے ذہن و خیال کے جیب و دامن کو بساتا۔ رفتہ رفتہ اُس کے دماغ میں ایک خاصہ مجموعے کا عطر پیدا ہوا جس کی خوشبو سے آج تک

لوگوں کے دماغ تازہ ہیں۔ یہ کون اُس وقت سمجھ سکتا تھا کہ یہ نونہال آگے چل کر خود اس قدر پھولے پھلے گا کہ گلستانِ سعدی اُس کے آگے گرد ہو جاے گی۔

تفصیل کہاں تک لکھی جاے۔ مختصر یہ کہ نصاب الصبیانِ ابونصرِ فراہی۔ گلستاں۔ بوستاں۔ مثنویِ غنیمت۔ یوسف زلیخا۔ سکندر نامہ۔ انشاے خلیفہ۔ انشاے منیر۔ انشاے ہرکرن۔ طاہر وحید۔ بہار دانش۔ ابوالفضل۔ سہ نثر ظہوری۔ مینا بازار طغرا۔ دیوان غنی۔ قصائد عرفی۔ قصائد خاقانی۔ قصائد ظہیر فاریابی۔ تحفۃ العراقین۔ قران السعدین۔ اس قسم کی کتابیں جو فارسی درسیات میں داخل ہیں اُس نے کچھ مدت میں تمام کرلیں۔ جب فارسی کی استعداد میزان مُنشعب سمجھنے کے لائق ہو گئی تو یہ عربی کے ڈھرے پر لگایا گیا۔ لیکن جہاں تک اس کے کلام سے مستنبط ہوتا ہی عربی میں شاید صرف ونحو سے آگے قدم نہ بڑھا سکا۔ کیوں کہ کسی مقام سے اس کی عربی کی ادبیت اچھی طرح تراوش نہیں کرتی خمسہ ہفت زبان میں عربی کا ایک شعر لکھا ہی۔ ممکن ہی کہ کاتب یا راوی کی غلطی ہو۔ لیکن جس حالت میں کہ وہ مندرج ہی اُس سے تو اُس کی عربیت کی نسبت کوئی اچھی راے قائم نہیں ہوتی۔ وہ شعر عربی کا یہ ہی۔

فدای وجہک عشق شرقا۔ دموع نہرا۔ ومن فراقک
کثیر حزنا۔ مع الہموا۔ ثقیل ہجرا۔ وکالجبالا

مبلغِ علم۔ کلام سے یہ بات اچھی طرح مترشح نہیں ہوتی کہ نظیر کا مبلغ علم کس قدر تھا۔ لیکن چوں کہ کسی مسئلۂ فقہی یا نحوی کی طرف اشارہ نہیں ہی اس سے گمان ہوتا ہی کہ شاید عربیت بہت زائد نہ تھی۔ معمولی صرف ونحو کی مختصر کتابیں پڑھی ہوں تو پڑھی ہوں۔ شاید ایک آدھ رسالہ منطق کا بھی دیکھا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ فارسی کی نہ صرف درسی کتابیں پڑھی تھیں بلکہ ان کے علاوہ اس زبان کی اکثر

مشہور تصانیف اور اکثر مشہور شعرا کے کلام پر نظر تھی۔ حافظ۔ خسرو۔ جامی۔ صائب۔ سعدی۔ نظامی۔ وحشی۔ خاقانی۔ فردوسی۔ انوری وغیرہ شعرا کے کلام سے اچھی طرح واقف نظر آتا ہی۔ چنانچہ بعضوں کے بعض کلام کی تضمین بھی کی ہی۔ فارسی میں استعداد خاصی ہی۔ کتب درسیہ ظہوری۔ طغرا۔ سہ دفتر ابوالفضل۔ غنی وغیرہ پڑھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ مختصراتِ صرف و نحو بھی پڑھاتا ہو تو عجب نہیں۔ بعض مقام پر جہاں فارسی اشعار لکھے ہیں زور فارسیت ظاہر ہوتا ہی۔ مرزا نوازش علی بیگ نے تو ایک خط میں ذکر کیا ہی کہ اُن کا مستقل دیوان فارسی موجود ہی۔

مکتب کی تصویر۔ مکتب کی تصویر نظیر نے لیلی مجنوں میں خود کھینچی ہی۔ اس موقع پر اُس کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہی۔

مکتب میں اُس کے (قیس کے) باپ نے لاکر بٹھا دیا ٭ اک قاعدہ بھی سامنے اُس طفل کے رکھا ٭

(بغدادی قاعدہ قیس کے زمانے میں تو تصنیف نہیں ہوا تھا۔ البتہ نظیر کو خود پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا یہ تسامح ویسا ہی ہی جیسے لکھنؤ کے مرثیہ گو شعرا کو زنانِ اہل بیت کے طریقۂ ماتم و لباس و پوشاک کی نسبت اکثر واقع ہوتا ہی)۔

اُستاد کی تصویر میں خود نظیر کی تصویر نظر آتی ہی۔

اُستاد ایسے بیٹھے کہ پوچھیں وہ عشق کو	روے سخن میں اُن کے مئے عاشقی کی بو
جو کچھ پڑھے تو یوں کہیں "غم کے گھر پڑھو"	تختی لکھے تو بولیں: "اُسے آنسوؤں سے دھو"
معنی جو پوچھے تو کہیں "صبر و قرار کھو"	تقریر پوچھے تو یہ کہیں اُس کے روبرو
"دل دے کے خوب رو کی محبت میں خوب رو"	باعث جو عشق کے تھے وہ حاضر تھے، دوستو

چاہت کی پاک بازی کا ہر دم رواج تھا
لڑکا بھی ابتدا ہی سے عاشق مزاج تھا

قیس کے تختی لکھنے کا حال نظیر لکھتے ہیں، لیکن وہ تو خود اُن کا حال ہے:-

تختی کو لے کے جب وہ قلم کو اُٹھاتا تھا
مشق الف میں آہ کی مدّیں دکھاتا تھا

بے کی کشش میں طول طپش کو جتاتا تھا
نقطے کی جائے قطرۂ آنسو بہاتا تھا

لکھنے میں میم کے جو قلم کو ہلاتا تھا
نقشِ دہن صنم کا اُسے یاد آتا تھا

جس وقت عین لکھنے میں دل کو لگاتا تھا
دیکھ اُس کو چشمِ یار تصوّر میں لاتا تھا

تختی وہ کیا تھی، دفترِ رنج و ملال تھا
لکھنے کی بات پوچھو تو اُس کا یہ حال تھا

نظیر جب علم پڑھ کر نکلتے ہیں اور اخیر کو اُسی علم کی عینک سے دیکھتے ہیں کہ مآل سب کا فنا ہی تو یوں عبرت کے چشمے جاری کرتے ہیں:-

پڑھ علم کئی اس دُنیا میں گر کامل ذی ادراک ہوئے
اور لاد کتابیں اُونٹوں پر ہر معنی کے درّاک ہوئے

معقول پڑھی، منقول پڑھی، ہر منطق میں چالاک ہوئے
یاں جتنے علم کے دریا ہیں اُن دریا کے تیراک ہوئے

سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں، سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصّے قضیے پاک ہوئے

مشہور حکیم اور بید ہوئے یا پڑھ کے علم طبابت کا
دالان کتابوں سے روکا، اور نسخوں سے صندوق بھرا

جب موت مرض نے آن لیا سب بھولے نبض اور قارورا
گو نسخے لاکھ مجرّب تھے پر کام نہ آیا اک نسخا

سب جیتے جی کے ۔ الخ

اسی رنگ میں دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

کیا کالی پیلی شکل کے، کیا گورے گل عذار	عاشق کوئی ہے، اور کوئی معشوق طرح دار
عاقل حکیم و عامل و فاضل رسالدار	پنڈت، نجومی، بید، چہ ناداں، چہ ہوشیار

دو دن کی شان ہر کوئی دکھلا کے مرگیا
جیتا رہا نہ کوئی، ہر اک آ کے مرگیا

جس طرح نظیر سات زبانیں جانتا تھا گمان ہوتا ہے کہ اسی طرح وہ ہفت قلم بھی تھا۔ اس نے بعض موقعوں پر خوشنویسوں کا ذکر کیا ہے اور مطلّا مذہّب کتابیں جو لوگوں نے ہزاروں لاکھوں روپے کے صرف سے لکھوائی ہیں اُن کو مخصوص بالذّکر کیا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ خوشنویسوں کی خدمت میں اکثر بہ نظرِ اصلاح جایا کیا ہے اور اُن کا کمال اُس کو خوش آیا ہے۔ خود بھی مدتوں خوش نویسی کا دل میں ذوق رکھا ہے۔ اچھے اچھے قطعات اُستادوں کے بہم پہنچاتا ہے، اور بڑی محنت سے اُن کی شانیں مشق کرتا ہے۔ جب سِن رُشد کو پہنچتا ہے بعض خوشخط قلمی کتابیں اپنے مذاقِ خوش نویسی کی سفارش سے خرید تا ہے اور اُن پر ناز کرتا ہے[1]

مرنے سے پہلے مرگئے جو عاشقانِ زار	وہ زندۂ ابد ہوئے تا حشر برقرار
کیا کاتبانِ اہلِ قلم خوش نویس کار	جتنی کتابیں دیکھتے ہو، لاکھ یا ہزار

کوئی لکھ کے مرگیا کوئی لکھوا کے مرگیا

[1] اکبر آباد میں میرزا نوازش علی بیگ نے نظیر کی چند نثریں دکھائیں جو بروایت اُن کے خود نظیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔ خط بہت پاکیزہ نستعلیق تھا اور ایسا کہ جس پر اکثر خوش نویسوں کو رشک ہوسکتا ہے۔

جیتا رہا نہ کوئی، ہر اک آ کے مرگیا

دُوسری جگہ نظیر یہ مُلاحظہ کرتے ہیں کہ اگرچہ کوئی کتنا ہی علم والا ہو لیکن اسرارِ الٰہی پر کما حقّہ عبور حاصل نہیں کرسکتا۔

جہاں میں کیا کیا خرد کے اپنے ہر اک بجاتا ہے شادیانے
کوئی حکیم اور کوئی مہندس، کوئی ہو پنڈت کتھا بکھانے
کوئی ہے عاقل، کوئی ہے فاضل، کوئی نجومی لگا کہانے
جو چاہو کوئی یہ بھید کھولے، یہ سب ہیں حیلے، یہ سب بہانے

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت، ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

نظیر سات آٹھ زبانیں جانتا تھا۔ عربی فارسی کا ذکر تو ہم ابھی کر آئے ہیں۔ کہ نظیر نے اُس میں کس طرح ترّقی کی۔ اُردو اُس کی مادری زبان تھی۔ اِس میں اس کو چنداں محنت اور کاوش کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن چوں کہ تحصیل زبان کے ساتھ اُس کو جبلّی مناسبت تھی وہ اِس مادری زبان کے نکات اور خصوصیات کو اَوروں سے بہت زیادہ سمجھتا تھا۔ وہ دیکھتا تھا کہ گو سب اُردو ہی بولتے ہیں لیکن بعضوں کی اُردو میں فارسی اور عربی کی آمیزش زیادہ ہے۔ بعضے ہندی اور سنسکرت الفاظ اُس میں داخل کرتے ہیں بعض اصطلاحیں بعض خاص پیشوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور اکثر پیشہ ور کچھ نہ کچھ اپنی زبان میں اور لب و لہجہ میں خصوصیّت رکھتے ہیں۔ جس سے وہ فقط اپنی طرزِ تقریر سے پہچانے جاتے ہیں کہ کس پیشے کے ہیں فقیروں اور بے نواؤں کا لہجہ اَور ہے۔ اور بانکوں اور شُہدوں کا اَور۔ عورتیں کچھ اَور ہی طرح بولتی ہیں اور مرد کچھ اَور۔ ہندوؤں کی عورتوں کا لب و لہجہ مسلمان عورتوں کے لب و لہجے سے بالکل جُداگانہ ہے۔ ان تمام

خصوصیتوں پر نظیر کی نظر اِس طرح دوڑتی تھی اور حاوی ہو جاتی تھی کہ وہ پکّی عُمر کو پہنچ کر اِس قدر قادر الکلام ہو گیا تھا کہ جس طبقہ اس کی تقریر کی نقل کرنے کو کہیے وہ کر دیتا - اور اِس خوبی کے ساتھ کہ معلوم ہوتا نقل نہیں اصل ہی - کبھی آپ سنپیرے بنے ہوے ہیں - کبھی آپ مچھوے کے لباس میں تشریف لائے ہیں - کبھی مارواڑی بن کر کچھ ارشاد کر رہے ہیں - اُردو چوں کہ ہر زبان کو مہمان نوازانہ اپنے کاشانے میں جگہ دیتی ہی اِس لیے جو شخص اُردو میں کمال پیدا کیا چاہتا ہی وہ گویا بالطبع اور کئی زبانوں کی تحصیل پر مجبور ہوتا ہی - اِسی مجبوری اور کچھ طبیعت کی رنگینی کی وجہ سے نظیر نے اپنی توجّہ کو مُختلف زبانوں کے حاصل کرنے کی طرف مصروف کیا - وہ تھوڑے زمانے میں پنجابی خاصی طرح بولنے لگا - برج بھاشا میں اُس نے گوپ اور گوپیوں کی سی مہارت حاصل کی - پوربیوں کا لہجہ اخذ کیا - مارواڑیوں کی اصطلاحیں یاد کیں - ملک محمدِ جایسی کی بھاشا میں یا وہ جو تُلسی داس کی ہی اُس میں کمال پیدا کیا -

کنھیا جی کا جنم وغیرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اس شخص کو ہندؤوں کی اصطلاحوں میں پنڈتوں اور کبیشروں کا سا کمال تھا اور اسی سے یہ بھی ترشّح ہوتا ہی کہ اُس کو زبانِ سنسکرت اور ہندؤوں کے مذہبی اور تاریخی امور میں اچھا خاصہ دخل تھا -

اِس کی ٹھیک تعیین نہیں ہو سکتی کہ نظیر نے یہ غیر زبانوں میں کمال کس زمانے میں حاصل کیا تھا - پنجابی چوں کہ دہلی میں اکثر لوگ پنجاب کے بسے ہوے ہیں اور پنجاب ہی میں وہ شہر داخل ہی غالباً اُس کو لڑکپن ہی میں معلوم ہو گئی ہو گی - لیکن اور زبانیں خصوصاً سنسکرت غالباً اُس نے بعدِ فراغ مکتب سے نکلنے کے بعد سیکھیں -

جس زمانے میں نظیر تھا اُس میں مذاقِ تصوف لوگوں پہ غالب تھا - کبیر اور گرو نانک کی تعلیم نے

لوگوں کو بتا دیا تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا تصوف قریب قریب ایک ہی اور اگر غور سے دونوں مذہب کے تصوف کی چھان بین کی جائے تو مآل ایک ہی ٹھہرتا ہی۔ اِس لحاظ سے اکثر صوفی خیال مسلمان بعض اوقات ہندو جوگیوں اور مذہبی پیشواؤں اور عالموں سے ملتے اور واقعی معقول استفادہ کرتے تھے۔ ہمارے شہر عظیم آباد میں ایک پُرانے آدمی شاید کوئی سو برس سے زیادہ عمر کے رہتے ہیں۔ اُنھوں نے ایک دفعہ باتوں ہی باتوں میں ایک فقیر کا ذکر کیا جن کا ہمزہ علی شاہ نام تھا۔ اُنھوں نے بیان کیا کہ یہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ یہاں آن کر شاہ ارزاں صاحب کی درگاہ پر رہ گئے۔ بہت ہی کامل درویش تھے۔ اُن کا اکثر معمول تھا کہ ہندوؤں کی کتھا میں شریک ہوتے۔ ہندو بھی اِن کی بڑی آؤ بھگت کرتے اور ممتاز جگہ دیتے۔ کتھا کہنے والے خاص کر اِن کی طرف خطاب کرتے اور یہ بہت ہی محظوظ وہاں سے واپس آتے۔

تذکرہ گلشن بے خزاں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ حضرت شاعر بھی تھے چنانچہ صفحہ ۲۸۴ میں صاحب تذکرہ میاں باطن لکھتے ہیں کہ ہمزہ تخلص لا اعلم۔ از فقرائے شاہجہاں آباد۔ سیرگاہ اِن دنا کی بلدۂ عظیم آباد درویش سخن کاغذ کے تکیے میں اِس طرح کرتا ہی حق کی یاد۔ ہمزہ ازِ طبع سُوالِ سخن کو یوں کرتا ہی یاد۔

ہائے کس کس کے تئیں بیٹھ کے ہم یاد کریں	غمِ مجنوں کریں یا ماتمِ فرہاد کریں

اِس ذکر سے مقصد یہ ہی کہ کچھ اسی طرح کا مذاق میاں نظیر کا بھی ہوگا۔ تعلیم کے تعلق سے چوں کہ ہندوؤں کے ہاں اِن کو رہنے کا زیادہ اتفاق ہوا اِس سے شاید یہ مذاق اور چمکا ہوگا۔ عُلمائے ہنود کی صحبت، اور ذہن وذکا کی تیزی، اور حافظے کی قوت، اور تلاش کی اشتہائے صادق نے اِن کے ذخیرۂ دماغ کو تھوڑے ہی دنوں میں معلومات کافی سے بھر دیا ہوگا۔

ہر چند ہم نظیر کے حالاتِ تعلیم میں صدرا اور شمس بازغہ کا کہیں ذکر نہیں پاتے۔ اُس کے آگے کبھی فقہ واحادیث کی موٹی موٹی کتابیں کُھلی ہوئی نہیں دیکھتے۔ وہ منطق اور معقولات کی موشگافیوں میں اُلجھا ہوا نظر نہیں آتا۔ وہ علمِ کلام اور علمِ عقائد میں غوطے لگاتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن یہ خدا کی دین ہی۔ اس میں کسی کا اجارہ کیا ہی ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال	کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے

وہ اگر کسی کو بے محنت گھر بیٹھے تمام علوم کی دولتیں عطا کرے تو اُس کی قدرت سے کیا بعید۔ اکثر بزرگوں کے حالات میں مذکور ہی کہ اُن کی خضر سے ملاقات ہوئی جنھوں نے ایک غیر معمولی طریقے سے تمام علم اُن کو گھول کر پلا دیا۔ ہم کو وجودِ خضر سے انکار نہیں اور نہ اس میں کلام کہ بعض حضرات کو اُن سے یہ غیر معمولی فیض پہنچا بھی ہی، لیکن اس کثرت سے جو روایتیں مشہور ہیں وہ یقیناً محلِ تامّل ہیں۔ حقیقت یہ ہی کہ دُنیا میں بہت سے ایسے ذہین ہو گزرے ہیں کہ جنھوں نے اپنی فطری بے چینی اور سیماب وشی سے جو اذکیا کا خاصہ ہی زمانہ تحصیل میں رسمی طریقے پر زیادہ علم حاصل نہیں کیا، لیکن اُس جبلّی مادّے کی وجہ سے پھر جو آگے چل کر اُن کو توجہ ہوئی ہی تو رسمی طریقۂ تحصیل میں عمر بھر جانفشانیاں کرنے والے بیٹھے ہی رہ گئے ہیں اور یہ اُن سے بمراحل آگے نکل گئے ہیں۔ اگر ایسے اذکیا کا میلانِ خاطر کچھ مذہب اور تصوّف کی طرف ہی تو اُنھی کی نسبت کہا جاتا ہی کہ خضر سے اُنھوں نے تعلیم پائی ہی۔ پس ان صورتوں میں خضر حقیقت میں نام ہی اُن فطری قویٰ کا جن کو ظلماتِ استعداد سے بعض خاص اوقات میں فعل کی روشنی میں جلوہ گر ہونے کی توفیق ہوتی ہی۔ یہ خضر نظیر کی استعداد کے ظلمات میں بھی تشریف رکھتے تھے، اور یہ انھی خضر کا تصرّف ہی کہ بغیر اس کے وہ باضابطہ تعلیم کا قدیم کورس تمام کرے وہ تمام علوم میں ایک خاصی مہارت رکھتا تھا۔ علم ہیئت کے اکثر مسائل جن کی

معمولی ریاضی دانوں کے فلک کو بھی خبر نہیں اُس کو ازبر تھے۔ وہ علم معانی و بیان میں ایک معقول معلومات رکھتا تھا۔ اچھے اچھے قابل اور ذی علم لوگوں کی صحبتوں میں بیٹھتے بیٹھتے ہر علم کے مُتعارف اور معمولی مسائل اُس کو نوکِ زبان ہو گئے تھے۔ وہ ایسی ویسی صحبتوں میں بیٹھا ملتا تو لوگوں کو مشکل سے معلوم ہوتا کہ وہ علومِ عربیہ کا پورا عالم نہیں ہی۔ ہر چند طب اُس نے نہ پڑھی ہو لیکن معلوماتِ طبّی اُس کی کم نہیں معلوم ہوتی۔ ہم اُس کے شاگردوں میں ایک طبیب کو بھی پاتے ہیں جس کا نام مانک چند اور عُرف جتی جی تھا۔ یہ شہر کا ایک نامی طبیب تھا اور اخیر عمر میں نظیر کے خاندان کے لوگوں کا علاج اُسی کے ہاتھ سے ہوتا تھا۔

حق تو یہ ہی کہ سب سے بڑی تعلیم یہ ہی کہ انسان کے ذہن میں علم کی بھُوک پیدا ہو جائے اور اس طرح کہ ہر وقت بھڑکی رہے۔ عالم کے جس قدر اجزا ہیں ہر جزو سے اُس کے ذہن میں حرکت پیدا ہو جائے۔ اُس کی جس پھُول پر نظر پڑے وہ اُس پھُول کو پھول نہ سمجھے بلکہ کاتبِ قدرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا چند ورقوں کا ایک نادر رسالہ۔ جس پتّے پر نگاہ ڈالے سمجھے کہ دفترِ معرفت ہی بقول سعدی ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار	ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

ہر واقعے اور ہر ماجرے کو دیکھ کر بیسیوں سُوالات دل میں پیدا ہونے لگیں۔ چوں و چرا عقل کی زبان پر ہو۔ کو اور کجا اور این و متی تفتیش و تفحّص کا تکیۂ کلام ہو۔ اگر یہ کیفیت طالب میں پیدا ہو گئی ہی۔ اور علومِ رسمیہ سے ایک حرف بھی اُس کو معلوم نہیں تو وہ ایک بڑا عالمِ متبحر ہی اگرچہ اُس کا علم قطرے سے زیادہ نہیں، اور وہ فلکِ معلومات کا آفتاب ہی ہر چند وہ ایک ذرّے سے کم رتبہ ہی۔ نظیر میں ہم اس کیفیت کی ایک اعلیٰ نظیر پاتے ہیں گو اُس نے پڑھا مکتب ہی میں لیکن اُس نے کبھی اپنی آنکھوں کو اُنھی چند ورقوں میں محدود نہیں رکھا۔ وہ مکتب میں بیٹھا ہوا ہی تو سبق کے علاوہ اپنے ہم مکتبوں کے عادات و خصائل پر غور

گزر رہا ہی۔ کوئی کسی کا منھ شرارت سے چڑا رہا ہی تو یہ اُس کے لیے بدیہ جانچ کے ایک دل چسپ چیستانی شعر کا کام دیتا ہی جس کے مطالب پر آہستہ آہستہ غور کرنے لگتا ہی۔ اور آخر ایک صحیح مطلب ذہن سے پیدا کرکے رہتا ہی۔ اُستاد پر بیٹھے بیٹھے غنودگی طاری ہوتی ہی اور اس رحمت نشان غفلت سے معصوم ہم سبقوں میں جو ایک خاص قسم کی مسرّت پھیلتی ہی اور چپکے چپکے مختلف مشاغلِ لایعنی اور افعالِ تفریح انگیز و شرارت خیز کا دفتر کھل جاتا ہی، تو نظیر کے آگے انسانی طبیعت کا ایک دل چسپ مسئلہ پیش ہو جاتا ہی جس کو بڑی رغبت سے وہ سلجھانے لگتا ہی۔ غرض اس قسم کی تعلیم تھی جس کا قیمتی سرمایہ لے کر وہ بازارِ دنیا میں معلومات اور تجربوں کی خریداری کے لیے وارد ہوا۔

مکتب ہی کے قیام کے زمانے میں نظیر نے اُن تعلّقات پر بھی غور کی جو اُستاد اور شاگردوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ اُستادوں میں اکثر وہ بھی ہوتے ہیں جن کی چلبلی طبیعتوں کو عموماً عشقیہ قطعے پسند آتے ہیں، اور جن کی چلتی پھرتی ہوئی نگاہیں زیادہ تر حُسن نگار وصلیوں سے لڑی رہتی ہیں۔ ایسے اُستادوں کی خوش قسمتی سے شاگردوں کے زمرے میں بھی بعض ایسے منتخبِ روزگار ہوتے ہیں جن کے مُصحفِ رخ کی طلائی لوح اور میناکار جدولوں اور نقش و نگار میں کاتبِ قدرت یا قوت رقمانہ صنعتیں صرف کیے ہوتا ہی۔ ایسے اُستادوں اور شاگردوں کے باہمی برتاؤ ایک ذہین اور فہیم اور تیز ہوش لڑکے کے لیے بیشک نہایت تفریح بخش اور دل آویز تماشے ہوتے ہیں۔ نظیر نے اس قسم کے بیسیوں تماشے دیکھے تھے۔ بعض محض مَعصومانہ تھے، اور بعض کسی قدر نفرت کو بھی جوش میں لاتے تھے۔ خود لڑکوں کے بھی آپس کے برتاؤ بعض وقت بڑے زور سے اُس کی عبرت شکار نگاہ کو اپنی طرف کھینچتے تھے، اور دیر تک محوِ تماشا رکھتے تھے۔ وہ ان برتاؤں سے بھی کبھی مسرّت اور کبھی نفرت حاصل کیا کرتا تھا۔ معصومانہ روشیں میل جول اور اختلاط اور ارتباط کی اس کو بھاتی

[illegible]

تھیں، اور شرارت انگیز فطری چلبلاپن اُس کو خوش آتا تھا لیکن جب کبھی بعض ناپاک خیالات کا فوارہ اُبلتے دیکھتا تھا تو وہ تنفر بھی اتنا ہی ہوتا تھا - اِس قسم کے ناہموار لڑکوں سے بات کرنی تو درکنار اُن کا پاس بیٹھنا تک اُس کو ناگوار گزرتا تھا - اپنی اسی نفرت کو ہنسی میں ڈال کر بعض نظموں میں نہایت خوش طبعانہ طور پہ اُس نے ظاہر کیا ہی - اِس نظم میں مدرسے کے علاوہ کسی قدر خانقاہ - شیوالے - اور مندر وغیرہ کا تجربہ بھی شریک ہی

لڈو میں نہ پیڑوں میں نہ اولوں میں مزا ہی	جو مردِ مجرد کے . . . میں مزا ہی

اُس زمانے میں تعلیم میں ریاضت بھی داخل تھی - اب کی طرح لوگوں کے خیالات نہ تھے - اُس وقت میں مرد کا لفظ آیا اور اُس کے ساتھ سپاہی کا اسوسی ایشن ذہن میں پیدا ہوا (یعنی تمام سروسامانِ سپہ گری ذہن میں خطور کر گئے) - ہر مرد کے لیے ضرور تھا کہ وہ کچھ فنِ کشتی میں دخل رکھتا ہو - کچھ پھینک جانتا ہو - لٹھیت ہو - گدکے پھری کا شوق رکھتا ہو - اکھاڑے میں روزانہ ڈنڈ پیلتا ہو - جوڑی ہلاتا ہو - تلوار - بانک - پٹا - بلم - لیزم - کسی ہتھیار کے چلانے میں بند نہ ہو - نظیر نے بھی اپنی بساط بموجب کچھ کچھ اس فن میں مہارت پیدا کی تھی - ورزش کی تو اُس کو یہاں تک عادت پڑ گئی تھی کہ ہونے کو بوڑھا ہو گیا لیکن اس معمول کو نہ چھوڑا - اخیر عمر میں جب کچھ نہیں ہو سکتا تھا تو فقط دیوار ہی کی ورزش کر لیتا تھا - اسی ورزش کی بدولت بڑھاپے میں بھی یہ دم و خم تھے کہ ایک جگہ ارشاد کرتے ہیں؛ -

اے یارو سو برس کی ہوئی اپنی عمر آکر	اور جھریاں پڑی ہیں سارے بدن کے اوپر
دکھلاتے جس گھڑی ہیں میدان میں زور جا کر	رستم کو بھی سمجھتے اپنے نہیں برابر

اب بھی ہمارے آگے، یارو، جوان کیا ہے

جن دنوں نظیر کی اُٹھتی جوانی تھی یہ اپنے زور میں کس کو مال موجود سمجھتے تھے - زور جوانی کی اُمنگوں میں

کچھ دنوں یہ بانکے بھی بنے رہے اور اکثر شہر کے بانکوں کے ساتھ نشست و برخاست اور گفت و شنود رہتی، چنانچہ اُس زمانے میں جو اُن کے محاورے اِن کی زبان پر چڑھ گئے تو پھر تا عمر نہ بھولے۔ جہاں کہیں لڑائی یا پہلوانی یا ڈینگ یا تعلی کا ذکر آجاتا ہی تو پھر یہ خاصے بانکے ہیں۔ جن دنوں یہ بانکے تھے اُن دنوں کا حال وہ یوں تحریر فرماتے ہیں:-

بانکے بھی ہو کے ہم نے اِس دید کو اُڑایا
شمشیر اور سپر کو اک عمر کھڑکھڑایا
بانک و پٹا و بلم گدکا و لٹھ پھرایا
جھمکا تمھارا اس دم ہم کو جو یاد آیا

اک دم کو آگئے ہیں، منہ مت چھپالے ہم سے
ٹک ہنس کے او پری رو آنکھیں لڑالے ہم سے

کشتی میں کتنی مدت ہم نے بدن کو توڑا
سو گلبدن کے تن کو من مانتا مروڑا
جو ڈھب تھا اُس ہنر کا کوئی نہ ہم نے چھوڑا
اب خوب رو کا پیارے دنیا میں دیکھ توڑا

اک دم کو آگئے ہیں۔ الخ

پھر دوسرے خیال میں۔ بانکوں اور سپاہیوں کا ذکر یوں فرماتے ہیں:-

یا ہو سپاہی بانکا ترچھا بڑا اکھایا
بل دار باندھ چیرہ، طرّے کو جگمگایا
کھیتوں میں جا کے کودا، لاکھوں کے تئیں بھگایا
جب منہ اجل کا دیکھا پھر کچھ بھی بن نہ آیا

یکتا شجاع بہادر صفدر رہوا، تو پھر کیا

گھوڑا اُٹھا کے ڈوبا فوجوں میں ہو دل آور
مارے طپنچے بھالے، کھائے کٹار جمدھر
مارا قضا نے بھالا جس دم فنا کا آکر
پھر مردمی شجاعت سب ہو گئی برابر

خود وسلاح، چلتہ، بکتر ہوا، تو پھر کیا

یا خانہ جنگی لڑکر کھایا بدن میں ٹانکا
جب گھور کر قضا کے بانکے نے آکے جھانکا
مونچھوں کو تاؤ دے کر سو زور وقت ہانکا
ٹیڑھا رہا نہ ترچھا گُن ڈار ہا نہ بانکا

تیغا، سپر قرابیں جدھر ہوا، تو پھر کیا

آزادوں کے محاورے میں یہ بند بھی قابلِ ملاحظہ ہے:-

ہر آن کھڑا کے سے اس ڈھب کا لگا رگڑا
چِتّان چڑھا گہرا اور باندھ ہرا بگڑا
جوشن کے کھڑک اس کی ہو بند سبھی دگڑا
کیا سیر کی ٹھہرے گی ٹک چھوڑ کے یہ جھگڑا

کونڈی کے نقارے پر خشکے کا لگا ڈنکا
نت بھنگ پی اور عاشق دن رات بجا ڈنکا

اس بند میں بھی پہلوانانہ مذاق ہے:-

جاڑا تو اپنے دل میں تھا پہلوان جھجھاڑا
جس دم دل و جگر کو سردی نے آلتاڑا
پر ایک تِل نے اُس کو رگ رگ سے ہی اکھاڑا
خم ٹھونک دوں ہی ہم نے جاڑے کو دھر پچھاڑا

تن پھیر الببا بیگا جب کھائے تِل کے لڈّو

بُلبُلوں کی لڑائی اور ریچھ کے بچّے کے بیان میں جو بند کشتی سے متعلّق آئے ہیں وہ نقل ہو چکے ہیں۔ اُن میں بھی پہلوانانہ مذاق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، اور الفاظ اور ترکیبیں سب مناسبِ مضمون ہیں۔

پہلوان کا روپ۔ دیدبازی کے تماشا گاہ میں بہادری کے رُوپ یوں بھرتے ہیں:-

دیکھا جو حُسن بھاری شہزور یا جاڑا
تو پہلوان بن کر کھودا وہیں اکھاڑا

ڈنڈ پیل بنا اُن مگدر لیزم سے خم کو جھاڑا ‌ ‌ ‌ ‌ اِس پیچ سے گنگل دہیٹے کو دھر پچھاڑا

سو مکر و فن بنانا، سو رنگ رُوپ بھرنا
عاشق کو ہر طرح سے خُوباں کی دید کرنا

لکڑی باز کا روپ:-

جو حُسن تھا چمکتا قاتل کا مثل کتا ‌ ‌ ‌ ‌ تو لکڑی باز بن کر پھینکا پھری بھی گتکا
بانک اور پٹا ہلایا، محنت سے ہو کے لتا ‌ ‌ ‌ ‌ راوت ہی بن کے مارا اُس پر بھی اپنا ہتا

سو مکر و فن بنانا- الخ

بانکے کا روپ:-

دیکھا جو حُسن بانکا تو بن کے ٹیڑھے بانکے ‌ ‌ ‌ ‌ تیغ و سپر طمنچے باندھے ہیں سب جہاں کے
کر خانہ جنگی اُس سے کھائے بدن پہ ٹانکے ‌ ‌ ‌ ‌ ٹانکے تو کھائے، لیکن پھنکے بھی خوب بھانکے

سو مکر و فن بنانا- الخ

خیبر کی لڑائی میں بھی معرکے کو خوب لکھا ہے اور اُس سے بھی پہلوانانہ مذاق ٹپکا پڑتا ہے-

نظیر کی جوانی

جوانی کا زمانہ ایک ایسا سحر انگیز اور جادو تاثیر زمانہ ہے کہ اس میں بھدے سے بھدے اور سست سے سست آدمی کے خیالات میں بھی بلند پروازیاں آجاتی ہیں۔ ہر چند بدصورت ہو مگر وہ خواہ مخواہ آئینے کی تلاوت میں مصروف ہوتا ہے۔ بالوں میں ہر وقت تیل پڑتا ہے۔ کنگھی ہوتی ہے۔ بیسن سے منھ دھویا جاتا ہے۔ رنگ کی صفائی کی دوائیں تلاش ہوتی ہیں۔ بلاناغہ چوک کی سیر ہوتی ہے۔ دوستوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ تاش ہو رہا ہے۔ چوسر بچھی ہوئی ہے۔ ایک طرف ستار چھڑ رہا ہے۔ دوسری طرف کوئی الاپ رہا ہے۔ قہقہے چھت اڑا رہے ہیں۔ لطیفوں کی دھوم کان پڑی آواز سننے نہیں دیتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جوانی کے آنے سے لڑکپن کے معصومانہ خیالات پر ایک خاص برقی اثر پھیل جاتا ہے۔ اور ایک نئی دنیا نگاہوں کے سامنے ہوتی ہے جس طرح آفتاب کے قریب نصف النہار پہنچتے پہنچتے کرنوں میں ایک خاص گرمی اور دھوپ میں ایک خاص تابانی آجاتی ہے، اسی طرح جوانی کے ترقی کرنے سے خواہشوں میں ایک خاص تیزی، خیالات میں ایک خاص جودت، اور ارادوں میں ایک خاص قوت آجاتی ہے۔ نظیر جس کو ہم ایک غیر معمولی طبیعت کا آدمی ظاہر کر چکے ہیں کیوں کر اس عموم سے مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ اس میں بھی تمام وہ خواہشیں موجود تھیں جو جوانی میں عموماً پائی جاتی ہیں، بلکہ عطیاتِ فطری کے غیر معمولی ہونے سے وہ خواہشیں بھی اس کی ذات میں اوروں کی بہ نسبت غیر معمولی تھیں۔ ہر چند وہ، جیسا کہ خود کہتا تھا، کریہ منظر تھا مگر کیا جوانی میں اس کراہتِ منظر نے ایک منٹ کے لیے بھی اس کو آئینہ دیکھنے سے باز رکھا۔ وہ آئینہ میں معائنۂ جمال کی اس طرح مزاولت کرتا تھا کہ جیسے

کوئی وظیفہ جی وظیفے کی۔ صبح ہوئی ہے۔ بستر سے اُٹھتے ہی اُس نے سرہانے سے آئینہ اُٹھایا ہے۔ خواب کے خمار سے چہرے پر جو ایک خاص اثر پیدا ہوا ہے اُس کو مختلف پہلوؤں سے دیکھتا ہے۔ رومال سے چہرے کو پونچھتا ہے اور اُس کو ایک مُتّقر آزینہ نفاست پر لے آتا ہے کہ حوائج سے فارغ ہونے اور مُنھ ہاتھ دھونے تک دوستوں کو نفرت کی وجہ باقی نہ رہے۔ بلکہ اگر کسی دل میں اُس کی محبت ہو تو وہ اُس خاص خوش نما خمار آلودہ حالت کو رغبت اور خوشی کے ساتھ دیکھے۔

ہر چند آغازِ جوانی میں خود بینی اور خود نمائی آئینہ سامنے لائی ہو، لیکن آگے چل کر بلند نظری کے باعث اُسی آئینے میں اُس کو خدا بینی اور خدا نمائی کے جلوے بھی نظر آنے لگے۔ وہ اپنی کم زوری کو جانتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ خود بینی اور خود نمائی تھوڑی بہت ہر انسان میں ہے، اور بعض حالت میں اعتدال کے ساتھ کچھ انسانی سوسائٹی کی زینت اور ترقی کے لیے یہ کم زوری ضروری بھی ہے۔ پس وہ کسی کو انصافاً آئینہ دیکھنے سے سختی کے ساتھ منع نہیں کر سکتا تھا۔ وہ لوگوں کو اس جائز خواہش کے پورا کرنے کی صرف اجازت ہی نہیں دیتا، بلکہ اُن کو تاکید کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ خیال کے کسی قدر بلند کرنے سے اِس ادنیٰ خواہش سے بھی کتنے فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ الانسان عالم اصغر۔ اِس قسم کے بلند صُوفیانہ اور حکیمانہ خیالات کے مخفی معانی پر آئینہ بہت کچھ روشنی ڈال سکتا ہے۔ کہتا ہے:۔

لے آئنے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ	صُورت میں اپنی قُدرتِ پروردگار دیکھ
خالِ سیاہ اور خطِ مشک بار دیکھ	زُلفِ دراز و طُرّۂ عنبر نثار دیکھ

ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ

اے گل، تو اپنے حسن کی آپی بہار دیکھ

آئینہ کیا ہے؟ جان، ترا پاک صاف دل
زلفِ دراز فہمِ رسا سے رہی ہے مل
اور خال کیا ہیں؟ تیرے سویدا کے رخ کے تل
لاکھوں طرح کے پھول رہے ہیں تجھی میں کھل
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل، تو اپنے حسن کی آپی بہار دیکھ

نرگس وہ کیا ہے؟ جان، تری چشمِ خوش نگاہ
گر سیرِ باغ چاہے تو اپنی ہی کر تو چاہ
اور سرو کیا ہے؟ یہ ترا قدِ دراز، آہ!
حق نے تجھی کو باغ بنایا ہے، واہ واہ!
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل، تو اپنے حسن کی آپی بہار دیکھ

بیدل نے بھی اس مضمون کو ایک مطلع میں کس لطف کے ساتھ ادا کیا ہے:-

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیرِ سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بچمن درآ

نظیر حوائج سے فارغ ہو کر منھ ہاتھ دھو کر چوکی کے فرش پر آن بیٹھا ہے۔ گو رومال سے منھ پونچھ چکا ہے لیکن اُس کو ہاتھ سے الگ نہیں کیا۔ خدمتگار نے آئینہ سامنے لا رکھا ہے۔ آنکھوں کے گرد کچھ تری رہ گئی ہے، اُس کو رومال کے گوشے سے دور کرتا ہے۔ بھنوؤں کے بال کچھ الجھ سے گئے ہیں اُن کو سلجھاتا اور ہموار کرتا ہے۔ بھیگی ہوئی مسیں مکرر بھیگی ہیں، اور اُن میں دونی بہار پیدا ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر تک نو دمیدہ بالوں کی نوکوں پر پانی کی ننھی ننھی بوندوں کی پُر لطف کیفیت میں وہ ایسا محو ہوتا ہے کہ اُس کے دل سے اُن کے دور کرنے کا خیال بالکل جاتا رہتا ہے۔ پھر وہ اس بیخودی سے چونکتا ہے اور عجلت کے ساتھ رومال کو مونچھوں تک

لے جاتا ہے۔ چہرے کی صفائی کے بعد وہ اپنے جمال پر بکر نظر کرتا ہے اور کتابی چہرے کی کتاب کو نظر ثانی سے زیادہ منظورِ نظر بناتا ہے۔ بالوں میں تیل ڈالتا ہے۔ کنگھی سے پہلے اُن کو سلجھاتا، پھر مانگ نکالتا، پھر اُس کی راستی کو آئینے میں جھک جھک کر ایک خاص اداسے پیشانی میں بل ڈال ڈال کر، بھنووں کو تان تان کر، نگاہ کو سمٹا سمٹا کر، دیکھتا ہے۔ اگر مانگ سیدھی نہیں نکلتی، دو دو تین تین دفعہ بالوں کو مُنھ پر لٹکاتا، جھاڑتا، اور دونوں بھنووں کے بیچ سے شہادت کی اُنگلی کو سیدھ میں لے جا کر سیدھی مانگ نکالتا ہے۔ پھر الگنی کی طرف رُخ کرتا ہے۔ شبینہ کپڑوں کو جسم سے دور کرتا ہے۔ نئے کپڑے بدلتا ہے۔ پھر نظر کبھی شانے پر ہوتی ہے، کبھی سینے پر۔ چُنی ہوئی آستینیں دامنِ گُل چیں بنی ہوئی ہیں۔ چُنے ہوے دامن سے پھول لپٹے ہوے ہیں۔ خوش وضعی کے اِس باغ میں بیٹھ کر وہ مُشک بو حقے سے دماغ کو معطر کرتا ہے۔ بعض زندہ دل احباب اُس سے ملنے کو آگئے ہیں۔ اُن کے ساتھ بیٹھ کر کچھ ناشتا کرتا ہے۔ پھر اپنے ہاتھ سے نہایت سلیقے سے پان بنا کر اُن کو بھی کھلاتا ہے، آپ بھی کھاتا ہے۔ بات کرتا جاتا ہے اور کبھی کبھی نظر بچا کر ہونٹوں کی مصنوعی سُرخی کو بھی دیکھ لیتا ہے۔ باتوں میں اس کے لباس و پوشاک سے زیادہ بناؤ ہے۔ ہر فقرہ زعفرانِ زارِ کشمیر ہے۔ احباب ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ جاتے ہیں۔ نقلوں پر نقلیں ہو رہی ہیں۔ لطائف کی کوئی انتہا نہیں۔ پھبتیوں کا کوئی شمار نہیں۔ ہر ایک شخص ضلع جگت کا پادشاہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر نظیر کے آگے کسی کی چلتی نہیں۔

شاذ ہی کوئی منحوس دن ایسا ہوتا ہوگا جس میں نظیر کے ہاں احباب تشریف نہ لاتے ہوں۔ کیوں کہ اُس کے ہاں خوش گپیوں کی ایسی چاٹ تھی کہ بے عذرِ قوی خوش مذاق اور زندہ دل نوجوان اِس چاشنی کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ لیکن آدمی ہی تو ہے۔ اگر کسی سبب سے کبھی وہ حضرات نہ آتے تو نظیر بہ تقاضائے اُنس مُضطر ہو کر خود جاتا۔ اگر گھر میں ملتے تو اُن سے بیٹھ کر دو ہی باتیں کرتا، نہیں تو اُن کی خیریت دریافت کر کے

چلا آتا - اور بعض روز اگر نہ جا سکتا تو گھر میں بیٹھ کر کتابوں سے جی بہلاتا - کتابیں جو اس زمانے میں اُس کے پیش نظر رہتی تھیں اُن سے جُدا گانہ تھیں جو وہ مکتب میں پڑھا کرتا تھا - ہر چند مکتب میں بھی بعض دواوین اُس نے پڑھے تھے مگر اب وہ کہاں مزہ دے سکتے تھے - کچھ تو جبلت میں عشق و عاشقی - اُس پہ جوانی کی تائید - اب لگا وہ دن رات عاشقانہ پُرجوش خیالات میں محو رہنے - باتیں بھی کرتا تو عشق و حُسن کی اور کتابیں بھی پڑھتا تو عشق و حُسن کی - مثنویاں وہ زیادہ دیکھتا تھا جن میں عشق و محبت کی داستانیں اُس کے شوق کو اُبھار کر جُدائی کی مُصیبتوں میں ڈال کر جذب صادق کے انوکھے نیا ل بور پر اُس کو وصل کے مزوں سے آشنا کرتی تھیں - دواوین کی وہ زیادہ مُزاولت رکھتا تھا جن میں غزلوں کی خیالی بزم میں اُس کو معشوق سے نت نئے طریقے سے مکالمے کا لطف حاصل ہوتا تھا - وہ ہر شاعر کو اپنے دلی خیالات کا ترجمان پاتا تھا - بازار گیا ہی - کوئی حسین عورت اُس کو نظر آ گئی ہی - اُس کی نرگسی آنکھیں اُس کے دل کو تڑپا گئی ہیں - گھر میں دیوانوں کی ورق گردانی کرتے کرتے وہ دیکھتا ہی کہ کسی غزل میں ہو بہو اُسی حسین کی رنگیں تصویر کھنچی ہوئی موجود ہی - کسی شب کو کسی جادو نظر کے حُسن کی یاد میں شب کی تنہائی نے اُس کو بہت ستایا ہی اور اُس کی آنکھوں سے مایوسی کے جھونکوں نے نیند کو اُڑایا ہی - وہ دوسرے ہی دن صبح کو اُٹھ کر اپنی تمام رُوداد شبینہ کسی شاعر کی بیاض میں بعینہ قلم بند پاتا ہی - اُس زمانے تک اُردو کی شاعری نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی - گو سودا اور میر مطلع شُہرت پر آفتاب و ماہتاب کی طرح چمک رہے تھے لیکن فارسی کے شعرا کے آگے ان کا چراغ جلنا مُشکل تھا - اُردو کے گنتی کے دو چار شاعر فارسی شعرا کی ایک پوری رجمنٹ کو کیوں کر بھگا دے سکتے تھے - اُردو والوں کے ہزار دو ہزار ورق دواوین فارسی کے کُتب خانے کے کُتب خانے پر کیوں کر غالب

ہم تجھ سے اِسی روز کو روتے تھے نظیر، آہ! کیوں تو نے پڑھا عشق و محبت کا رسالا؟

آسکتے تھے۔ حبِ وطن، جدت پسندی، اور تفنن کی وجہ سے گو اردو کے استادوں کا کلام بھی لوگ دیکھتے تھے لیکن شیراز کی خلری[1] کے آگے ہندوستان کے ٹھرّے[2] کا رنگ کب جم سکتا تھا۔ نظیر کی مزاولت میں اُس زمانے میں زیادہ تر اس قسم کی کتابیں رہتی تھیں۔ خمسۂ نظامی۔ خمسۂ جامی۔ خمسۂ خسرو۔ دیوانِ حافظ۔ دیوانِ وحشی۔ دیوانِ خسرو۔ نل دمن۔ دیوان نورالعین واقف۔ دیوانِ نظیری۔ دیوانِ بیدل۔ دیوانِ ہلالی۔ دیوانِ سعدی دیوانِ صائب۔ دیوانِ ناصر علی۔ کلیاتِ نعمت خانِ عالی۔ دیوانِ انوری۔ ظفرنامہ ہاتفی۔ لیلیٰ مجنونِ ہاتفی۔ وغیرہ وغیرہ۔

کبھی کبھی وہ تفنناً اُردو کے شعرا کا کلام بھی دیکھ لیتا تھا۔ جو اشعار یا غزلیں اُس کو پسند آتی تھیں اُن کو زبانی کر لیتا تھا اور اکثر بزمِ احباب میں اُن کی بدولت حسنِ بیان کو چمکاتا اور اپنے دلی خیالات کو پُر زور طور سے بیان کرتا تھا۔ دیوانوں میں چوں کہ اکثر ایک ہی مضمون کی بار بار تکرار ہوتی ہے۔ کہیں سیکڑوں ورق اُلٹنے کے بعد کوئی نیا مضمون یا نیا خیال دکھائی دیتا ہے، اس لیے دیوان کا دیکھنا کوئی بہت دل چسپ کام نہیں ہے دو چار دیوانوں کے دیکھنے کے بعد طبیعت تکرارِ مضامین سے گھبرانے لگتی ہے اور آخر تفنن پیدا کرنے کے لیے کسی اور شاخِ ادب کی طرف جھکنا پڑتا ہے۔ مثنویوں میں گو دواوین کی طرح ایذا رساں تکرار نہیں لیکن غور کرو تو وہ بھی ڈھلی ہوئی سب ایک ہی سانچے کی ہیں۔ مضامین گو کتنے ہی مختلف ہوں مگر کینڈا سب کا ایک ہی ہے۔ وہی حمد، وہی نعت، وہی سراپا۔ وہی فراق۔ وہی عاشق کے مصائب۔ وہی مصیبت کے بعد وصال۔ ہر مثنوی میں اُنھی مضامین کو تھوڑے تفاوت سے کون ذہین اور طبّاع آدمی لذت اور خوشی کے

---

[1] شیراز میں خلر ایک قریہ ہے۔ وہاں کی شراب بہت عمدہ ہوتی ہے۔ قاآنی نے اپنے قصائد میں اس شراب کا اکثر ذکر کیا ہے۔

[2] ٹھرّا۔ دیسی اور خراب شراب۔ کم نشے کی گھٹیا اور سستی شراب جسے چار خاکروب وغیرہ پیتے ہیں۔

ساتھ دیکھ سکتا ہے؟ - پھر مزہ یہ کہ ایک ہی قصّے کو مختلف اساتذہ نے قلم بند کیا ہے - گو ہر ایک کے بیان میں اُس کی خصوصیتِ خیالی کی وجہ سے کوئی خاص لُطف ہو لیکن مضامین میں کوئی خاص جدّت یا اضافہ نہیں - پچھوڑی ہڈیوں کو نمک مرچ لگا کر مُکرّر کون چچوڑ سکتا ہے - خلاصہ یہ کہ مثنویاں بھی دس بیس کے بعد اجیرن ہو جاتی ہیں - انھی اسباب سے نظیر کی اسٹڈیؔ[۱] ہی میں کبھی کبھی بڑی بڑی قصّے کی کتابیں بھی کُھلتی تھیں - وہ عمرو عیار کی عیاریوں کو ضرب المثل کے طور پر سُنتا تھا - امیر حمزہ کی داستان کا ہاتھ آنا کوئی مشکل امر نہ تھا - کسی دن وہ اس کتاب کو لے آیا ہے - شوق کے ہاتھوں سے کھولتا ہے - تفریح کی نگاہ سے دیکھتا ہے - کبھی اظہارِ حیرت کرتا ہے کبھی متاسّف ہوتا ہے - کہیں مُسکرانے لگتا ہے - کہیں کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے - الف لیلہ کی شُہرت سے بھی اُس کے کان بھر رہے تھے - کہیں سے فارسی نُسخہ لے آیا ہے اور عربی خیالی پرستان میں عشق و عاشقی کی ایک وسیع اور پُر بہار اور حیرت انگیز آبادی پاتا ہے - گو بہت سی بستیاں ہیں لیکن ایک دوسرے سے اُن کی سرحد اس طرح ملی ہوئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ کُل بستیاں ایک ہی شہر کے مختلف آباد اور پُر رونق محلّے ہیں - کُتب بینی کے مُسافر کو اصلا امکان نہیں ہوتی اور اس آسانی سے اِس بڑی آبادی کے ہر گوشے کی سیر کر لیتا ہے گویا وہ تختِ سلیمان پر سوار تھا - صنارسنکوس کی پُر منفعت شُہرت اُس کو بوستانِ خیال کی طرف لے جاتی ہے اور خیال کی طلسمات آفریں قوّتِ نامیہ اپنے سرسبز گُل بوٹوں کی بہار دکھاتی ہے -

چوں کہ دہلی میں پیدا ہوا ہے جہاں ہر در و دیوار سے آثارِ صنا دیدِ عجم پیدا ہیں بقولِ عُرفی ؎ از نقش و نگار در و دیوارِ شکستہ ❊ آثار پدیدست صنادیدِ عجم را ❊ اُس کو طبعی طور پر سلاطین کے کارناموں کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے - فیروز شاہ کی لاٹ دیکھتا ہے - کیوں کر نہ پوچھے کہ فیروز شاہ کون تھا؟ - شاہجہاں کی جامع مسجد

---

[۱] وہ کمرہ جو کتب بینی اور مشاغلِ مطالعہ کے لیے مخصوص ہو -

دیکھتا ہی کیوں کر نہ پوچھے اِس کا بانی کون تھا؟ - قُطب کی لاٹ - حوضِ شمسی - ہُمایوں کا مقبرہ ان میں سے ہر ایک پُکار پُکار کر اُس کو تاریخ کی طرف بُلا رہا ہی -

انشاے ابوالفضل - رُقعاتِ عالمگیری - وغیرہ نیم تاریخی کتابوں کا تعلق کچھ پیشتر سے اُس کے دل میں آہستہ آہستہ تاریخی دُنیا کا شوق پیدا کر چکا تھا - جوانی میں وہ شوق قوت پکڑ کر اُس کو تاریخی کوچے میں تلاش و تفحص کے پانوء سے دوڑاتا ہی - ابوالقاسم فرشتہ سے ملتا ہی - جہانگیر سے ملاقات کرتا ہی اور اُس کی زبان سے اُس کے حالات سُنتا ہی - تیمور سے ہم کلام ہوتا ہی اور اُس کے عجیب و غریب خوابوں اور اُس کے متعلق بزرگانِ دین کی مختلف کرامات اور پیشین گوئیوں پر عش عش کرتا ہی - گو اُن قصے کہانیوں کی طرح یہ کتابیں ہر جگہ چنداں دل چسپ نہیں، لیکن جہاں واقعات معمولی سطح سے بلند ہونے لگتے ہیں تو خیالی آنکھوں کو ایک خاص لُطف حاصل ہوتا ہی - گویا بڑے بڑے واقعات اُس خوش نمائی سے چشمِ متخیلہ میں نظر آتے ہیں جیسے مسلسل چوٹیاں خوش نما پہاڑوں کی ہوں جو دور سے اپنا سُرمئی جلوہ دکھاتی ہوں - ہر چند ابتداً میں انقلابات سلطنت سے وہ چنداں عبرت حاصل نہیں کرتا - زیادہ تر وہ عشق و محبت کے قصوں کی تلاش میں رہتا ہی - جہانگیر کے عہد کو اُس مقام پر زیادہ شوق سے پڑھتا ہی جہاں اُس کے عشقی تعلقات نور جہاں سے پیدا ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایک رنگین افسانہ ہو جاتے ہیں - علاءالدین کے دور کو وہ اُس مقام پر زیادہ دل چسپی سے مطالعہ کرتا ہی جہاں وہ چتور گڑھ کی رانی کو اپنے قبضے میں لایا چاہتا ہی - یا جہاں اُس کا بیٹا خضر خاں دول رانی کے ساتھ عشق کی شطرنج کھیلتا ہی اور مشکل مشکل چالیں چلتا ہی - لیکن کچھ نہ کچھ اُس کا دل عبرت سے ضرور متاثر ہوتا ہی، چنانچہ وہی تخمِ عبرت آگے چل کر شاداب کونپلیں نکال لاتے ہیں اور نشو و نما پا کر جاں فزا بہار دکھاتے ہیں ::

گر شاہ سر پہ رکھکر افسر ہوا، تو پھر کیا؟
اور بحر سلطنت کا گوہر[لہ] ہوا، تو پھر کیا؟
ماہی، علم، مراتب، پر زر ہوا، تو پھر کیا؟
نوبت، نشاں، نقارہ در پر ہوا، تو پھر کیا؟
سب ملک سب جہاں کا سرور ہوا، تو پھر کیا؟

کیا رکھ کے فوج، لشکر کی سلطنت پناہی
پھیری دہائی اپنی لے ماہ تا بہ ماہی
جب آن کر فنا کی سر پر پڑی تباہی
پھر سر رہا نہ لشکر، نہ تاج بادشاہی
دارا و جم و سکندر اکبر ہوا، تو پھر کیا؟

یا ذات میں کہائے نامی، اصیل، ذاتی
جمشید فر کے پوتے، نوشیرواں کے ناتی
تھے آپ مثلِ دولہا اور فوج تھی براتی
جب چل بسے تو کوئی پھر سنگ تھا نہ ساتی
ملک و مکاں خزانہ لشکر ہوا، تو پھر کیا؟

یا راج بنسی[عہ] ہو کر دنیا میں راج پایا
چتور گڑھ[سہ] ستارا[ٹہ]، کالنجر[ھہ] آ بنایا
جب توپ نے اجل کی آ مورچہ لگایا
سب اڑ گئے ہوا پر کوئی نہ کام آیا
گڑھ، کوٹ، توپ، گولہ، لشکر ہوا، تو پھر کیا؟

لہ اس مصرعے میں علی گوہر کی طرف ایک مخفی اشارہ ہے۔ علی گوہر شاہ عالم کا نام تھا۔

عہ راج بنسی شاہی خاندان کا آدمی۔ راجہ کے خاندان کا۔ راجپوت قوم کا نام۔

سہ چتور گڑھ اودے پور میں ایک مقام ہے۔ یہاں راجپوت راجاؤں کا ایک مشہور خاندان قائم ہوا جو غایت شرافت سے اپنے آپ کو آفتاب نسب خیال کرتا ہے اور سورج بنسی کے لقب سے ملقب ہے۔ اس خاندان کے راجہ اپنے تئیں رام کی اولاد سے جانتے ہیں۔ سب سے پہلے چتور گڑھ کے قلعے پر سامون نے حملہ کیا مگر اس کا حملہ ناکام رہا۔ علاؤالدین نے حملہ کر کے اس پر فتح حاصل کی۔ اس فتح کے بیسیوں قصے بن گئے ہیں انھی میں آلا اودل بھی ہے۔ دوسری فتح اکبر نے حاصل کی۔

ٹہ ستارہ وہ جگہ ہے جہاں رام راجا قلعہ جنجی سے بھاگ کر متحصن ہوا تھا مگر اورنگ زیب نے سنہ [illegible]ء میں بذاتِ خاص اس کا محاصرہ کر کے چوتھے مہینے میں فتح کر لیا۔ تاریخ فتح ستارہ [illegible] اپریل سنہ [illegible]ء ہے۔

ھہ کالنجر بوندیل کھنڈ کا ایک نہایت ہی مضبوط قلعہ جس کے محاصرے میں شیر شاہ کی جان گئی۔

کتنے دنوں یہ غُل تھا، نواب ہیں، یہ خاں ہیں — یہ ابنِ نجیب زادی، یہ عالی خانداں ہیں
جاگیر و مال منصب گو آج ان کے ہاں ہیں — دیکھو تو آک گھڑی ہیں نہ نام نہ نشاں ہیں

دو دن کا شور، چرچا، گھر گھر ہوا، تو پھر کیا؟

کہتا تھا کوئی دیکھو، یہ ہیں امیر[۵۱] خاں جی — اور یہ ہیں خانخاناں، اور یہ ہیں شیر خاں[۵۲] جی
پنجہ اٹھا قضا کا جب آئے شیر خاں جی — پھر کس کے میر خاں ہیں کس کے وزیر خاں جی

عُمدہ، غنی، تونگر، بازر ہوا، تو پھر کیا؟

کہتا تھا کوئی گھوڑا ہے نامدار خاں کا — یہ پالکی، یہ ہاتھی ہے ذوالفقار خاں[۵۳] کا
آیا قدم اجل کے جب تیس مار خاں[۵۴] کا — خر بھی کہیں نہ دیکھا پھر شہسوار خاں کا

جھپان[۵۵]، میگ ڈنبر در پہ ہوا، تو پھر کیا؟

کہتا ہے کوئی ڈیوڑھی ہے خان مہرباں کی — یہ باغ یہ حویلی ہے مخلدار خاں[۵۶] کی
جب راج نے قضا کی کرنی بسولی[۵۷] ٹانکی[۵۸] — اک اینٹ بھی نہ پائی ہر گز کسی مکاں کی

رنگیں محل، سنہرا گھر، در ہوا، تو پھر کیا؟

---

۵۱ امیر خاں محمد شاہ رنگیلے کا مصاحب تھا۔ عمدۃ الملک اس کا خطاب تھا۔ بادشاہ کا بہت ہی منہ چڑھا تھا۔ اس کے سیکڑوں لطائف مشہور ہیں چنانچہ وہ پوت سپوت کپوت والا لطیفہ بھی اسی کا ہے جس میں محمد شاہ کے سوال پر خود بدولت کو توپوت قرار دیا برہان الملک کو سپوت اور اپنے تئیں کپوت۔

۵۲ شیر خاں ایک عالی خاندان افغان تھا۔ ہندوستان کے سلاطین اسلامیہ میں خاندان سور کا قائم کرنے والا یہی ہے۔ ہمایوں کے مقابلے میں لڑا اور مختلف لڑائیوں میں اس کو شکست دے کر ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا۔ پانچ برس اس نے نہایت دھوم دھام سے سلطنت کی ۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء چتوڑ فتح کر چکا تھا۔ کالنجر کی فتح کی طیاریاں تھیں کہ قضا کی میگزین نے اس کے دھوئیں اڑا دیے۔

۵۳ ذوالفقار خاں اورنگ زیب کا نہایت ہی چست و چالاک اور قابل سپہ سالار تھا۔ ۱۶۹۸ء میں قلعہ جنجی اسی کے ہاتھ سے فتح ہوا۔

۵۴ تیس مار خاں اصل میں وہ آدمی جس اکیلے نے تیس کو مار کر خطاب خانی حاصل کیا ہو۔ ترم خاں۔ ترم باز۔

۵۵ جھپان ایک قسم کی عماری نما پالکی جس کا سفر دپہاڑوں پر رواج ہے۔

۵۶ دلی میں مخلدار خاں کا باغ شہر کے باہر چھاؤنی میں واقع ہے جیسا کہ غالب کے ایک فارسی کے رقعے سے ظاہر ہوتا ہے۔

۵۷ بسولی اینٹیں گھڑنے کا اوزار۔ تیشۂ معمار۔

۵۸ ٹانکی سنگ تراشوں کے ایک اوزار کا نام۔ ٹرخانی، چھینی۔

کتنوں نے بادشاہی کیا کیا خطاب پایا — مُہریں بڑی کھُدائیں، سکّہ بڑا بنایا
جب آن کر فنا نے نام و نشاں مٹایا — وہ نام اور وہ سکّہ ڈھونڈا کہیں نہ پایا

دو دن کا مُہر چھاپا در پہ ہوا، تو پھر کیا؟

جاگیر میں کسی نے زر ریز مُلک پایا — کر بند و بست اپنا نظم و نسق بٹھایا
لیکن سندِ اجل کا جب فوج دار آیا — اک دن میں حکم و حاصل سب ہو گیا پرایا

ہانسی، حصار، ٹھٹھا، بھکّر ہوا، تو پھر کیا؟

کہتا تھا کوئی لشکر ہی طرّہ باز خاں کا — یہ خیمہ شامیانہ ہی شہنواز خاں[51] کا
آیا کٹک[52] اجل کے جب یکہ تاز خاں کا — سر بھی کہیں نہ پایا پھر سرفراز خاں[53] کا

سردارِ سر بخشی بڑھ کر ہوا تو پھر کیا؟

محض تاریخی خشک دفاتر سے اُکتا کر کبھی کبھی وہ شاعرانہ تاریخی تصانیف کی طرف بھی رُخ کرتا ہے جن میں واقعات کے ضمن میں واقعاتِ عجیبہ اور معارکِ غریبہ کا ایک شاعرانہ دلچسپ پیرایے میں ذکر ہوتا ہے اور جن میں اکثر اوقات واقعاتِ تاریخی سے زیادہ واقعاتِ عشقیہ چمکائے جاتے ہیں اور رزم سے زیادہ بزم رنگیں کر کے دکھائی جاتی ہے۔ ممکن نہیں کہ وہ تاریخ اور ادب دونوں کا مذاقِ مشترک رکھ کر جوانی کے پُر جوش زمانے میں شاہنامے کی رنگین اور دلکش داستانوں سے باز رہا ہو۔

[51] شہنواز خاں ناصر جنگ والیِ ریاستِ حیدرآباد کا وزیر یا مدار المہام تھا۔ غلام علی آزاد کا معاصر ہے۔ علمی قابلیت خاصی رکھتا تھا۔ شعر و سخن سے بھی اُس کو ذوق تھا۔ ایک شہنواز خاں عبد الرحیم خانخاناں کا بیٹا بھی تھا۔

[52] کٹک فوج۔

[53] سرفراز خاں شجاع الدین کا بیٹا اور مرشد قلی خاں کا پوتا تھا۔ ۱۷۳۹ء میں باپ کا جانشین ہوا۔ نادر شاہ کا حملہ بھی اسی زمانے میں ہوا تھا۔ جب وہ ہند سے لوٹ مار کر چلا گیا تو علی وردی خاں صوبہ دارِ بہار نے محمد شاہ کے وزیر کو کچھ دے کر بنگالے کی صوبہ داری کی سند حاصل کی۔ حصولِ سند کے بعد فوج لے کر مرشد آباد پر چڑھ آیا۔ سرفراز خاں گولی سے مارا گیا۔ علی وردی خاں اُس کی جگہ تخت پر بیٹھا اور خطبہ سکہ جاری کیا اور حسبِ عہد دہلی کو ایک کروڑ نقد اور ستر لاکھ کے جواہرات بطور نذر روانہ کئے

کُتب بینی ہو اور جُوانی کا زمانہ، پھر جوانوں کے مذاق کی نہایت شوخ رنگیں کتابیں بعض اوقات تخلیہ میں کی ہیں محض تعجب ہی تعجب ہے۔ ہر چند بطورِ درس بہارِ دانش کے کچھ اجزا پڑھ گیا ہے لیکن اُس کی تمام حکایتیں ہنوز اُس کی نظر سے نہیں گزریں۔ اور اگر گزری ہیں تو اُن کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔ اب اس کتاب کو پھر نکالتا ہے اور عورتوں کے چِترَ[۱] کی حکاتیوں کو غور سے پڑھتا ہے۔ رات کا آنا اور دن کا جگمگانا اسی ایک مضمون کو ہر جگہ ایک نئے طور پر پاتا ہے۔ وصال کی حالت کی تعبیر مختلف دل چسپ اور دل آویز کنایوں میں معاینہ کرتا ہے۔ ان فقرات کو مزا لے لے کر پڑھتا ہے اور گوہرِ بے بہا سمجھ کر حافظے کے بکس میں محفوظ طور پر رکھ لیتا ہے۔ وہ چِتر کی حکاتیوں کو اپنے احباب کی محفل کے گرم کرنے کو یاد رکھتا ہے اور اُن کو بعض اوقات موقع سے بیان کر کے اُن کو حیرت میں ڈال دیتا ہے اور کبھی بعض ذہین دوست سے کوئی چِتر کی تازہ نقل بھی سُن لیتا ہے اور پھر دیر تک مزے مزے کی باتیں ہوتی ہیں۔ ذکر ہی ذکر میں دوسری اسی قسم کی کتاب کا حال معلوم ہوتا ہے یہ مشتاق ہوتا ہے اور بڑے اصرار سے اُس کی کسی دوست پر فرمایش کرتا ہے۔ اسی طرح آئے دن ایک نہ ایک نئی کتاب رنگین مذاق کی اُس کے ملاحظے میں گزرتی ہے۔ اور رنگین علمِ مجلس کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اُس کے پاس جمع ہو جاتا ہے۔

اس قسم کی کُتب بینی کا اثر اُس کے کلام کے بعض حصے پر بہت نمایاں طور پر پھیلا ہوا ہے۔ وصل۔ اشنا خلاص۔ آندھی۔ نارنگی۔ بعض ہولی۔ ازاربند۔ رم جھرا اور کایستھ وغیرہ اسی قسم کے کلام میں داخل ہیں۔

اس سے زیادہ ہم نظیر کو اسٹڈی میں بند رکھنا پسند نہیں کرتے۔

---

[۱] چِتر۔ چلتر، فریب، مکر، چال، چھل چھل بٹا۔

کتنا ہی شوقِ علم کیوں نہ ہو لیکن اُس سے یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ وہ دن رات ورق گردانی ہی میں مصروف رہے گا۔ کھانے کا وقت آگیا ہی۔ آخر وہ کچھ کھایا بھی چاہے۔ روٹی دال سامنے آتی ہی اور پیٹ میں پڑ کر آنکھیں سی کھول دیتی ہی۔

جب ملی روٹی ہمیں سب نورِ حق روشن ہوئے
رات دن شمس و قمر، شام و شفق روشن ہوئے
زندگی کے تھے جو کچھ نظم و نسق، روشن ہوئے
اپنے بیگانوں کے لازم تھے جو حق، روشن ہوئے

دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

وہ جو اب کھاتے ہیں باقر خانی، کُلچہ، شیرمال
ہیں وہ خاص الخاص درگاہِ کریم ذوالجلال
یہ جو روٹی دال کا گردن میں ہم رکھتے ہیں جال
جب ملی روٹی وہیں ہم ہوگئے صاحب کمال

دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

*
* *

روٹی کا اب ازل سے ہمارا تو ہی خمیر
رُوکھی ہی روٹی حق میں ہمارے ہی شہد و شیر
یا پتلی ہووے موٹی، خمیری ہو یا فطیر
گیہوں، جُوار، باجرے کی جیسی ہو، نظیر

ہم کو تو سب طرح کی خوش آتی ہیں روٹیاں

خوابِ نیم روز سے وہ ہوشیار ہوا ہی۔ منھ ہاتھ دھو کر پھر بارِ ثالث آئینے کنگھی سے ملاقات کر رہا ہی منتظر ہی کہ تمازتِ آفتاب میں کمی آئے تو پوشاک بدل کر سیرِ بازار کو نکلے۔ بہ تدریج دو تین یار آشنا بھی پاس پڑوس سے

آگئے ہیں۔ گپیں چھڑ گئی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بڑے بڑے زور سے ہنسی کی آواز بلند ہوتی ہے۔ لیجیے آفتاب اب مغربی اُفق سے بہت قریب ہے۔ دھوپ میں زردی آگئی ہے۔ وہ تیزی باقی نہیں رہی۔ شوقین جیوڑے ایک ایک دو دو کر کے اپنے گھر سے بن سنور کر نکل رہے ہیں۔ نظیر بھی بعض ہم مذاق زندہ دل دوستوں کے ساتھ ایک خاص شان سے نکلا ہے۔ گو لباس میں جوانی کے مذاق نے کچھ تکلّف کیا ہے مگر اس تکلّف میں بھی ایک سادگی ہے۔ سڑک پر جا رہا ہے کہ ایک طرف سے ایک نالکی چلی آرہی ہے۔ "ہٹو، بڑھو" کی آواز بلند ہے۔ کوئی امیر بڑی شان سے اُس کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔ نوکر صُراحی حُقّہ لیے جلو میں دوڑے آتے ہیں۔ امیر صاحب کے مُنحنی قویٰ اور نالکی کی ہیئت کذائی پر اُس کو نعمت خانِ عالی کی وہ مشہور پھبتی یاد آتی ہے۔ دوستوں کا خیال وہ اُس نقل کی طرف پھیرتا ہے۔ اور آپ بھی ہنستا ہے اور اُن کو بھی ہنساتا ہے۔ جوہری بازار سے اُس کا گزر ہوتا ہے۔ وہاں بڑے بڑے مہاجن اور سیٹھ اپنی اپنی دُکانوں میں بیٹھے بہی کھاتا پھیلائے ہوئے ہیں۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے بچّے گورے گورے ہاتھوں میں سونے کے کڑے، کانوں میں بالی جھمکائے اُن کے پہلو میں بیٹھے اپنے کسی معصومانہ کھیل میں مصروف ہیں۔ یا کسی اپنے ہمجولی کے ساتھ اُچھل کود رہے ہیں۔

کتنے اسی بازار میں زر کے ہی پیشہ دار ہیں	بیٹھے ہیں کر کر کوٹھیاں، زر کے لگے انبار ہیں
سب لوگ کہتے ہیں انھیں یہ سیٹھ ساہوکار ہیں	
ہیں فرش کوٹھی میں بچھے تکیے لگے ہیں زرفشاں کچھ پیٹھ[۵۱] کچھ پر پیٹھ[۵۲] کی آتی ہیں باتیں درمیاں	بہیاں کھلی ہیں سامنے، لکھتے ہیں لکھی کاردار لاکھوں کے لکھتے درشنی، سو سیکڑوں کی ہنڈیاں

۵۱ پیٹھ = مثنیٰ۔ نقل۔ گم شدہ ہنڈی کی نقل۔

۵۲ پرپیٹھ = مثنیٰ کی نقل۔ دوسرا مثنیٰ۔ گم شدہ ہنڈی کی تیسری نقل۔ تیسرا روپہ۔

کیا کیا متی اور سود کی کرتے سدا تکرار ہیں

کچھ مول کا مذکور ہی کچھ بیاج[۵۱] کا ہی ٹھکٹھکا
پھیلاؤ میں تیرج[۵۲] کی، بیجک[۵۳] کا چرچا ہو رہا
دلال ہنڈی، بیٹھ کے، باھمن پرکھے سدھ سوا
آڑت بٹھلاتے ہر جگہ، چٹھی لکھانے جا بجا

کچھ رکھنے والے کے پتے، کچھ جوگ[۵۴] کے اقرار ہیں

تھوڑی سی پونجی جن کی ہی، بیٹھے ہیں وہ بھی لے کے یاں
ایدھر لگے دس بیس کے ادودھر دھری ہیں کوڑیاں
اور جو ہیں حاذق پونچھیے، وہ کوڑیوں کی تھیلیاں
کا مدھون پہ رکھتے ہیں واں لگتی جہاں ہیں گدڑیاں

دیکھا تو یہ سب پیٹ کے دھندے ہیں اور بستار[۵۵] ہیں

اسی بازار میں ایک طرف سے ایک نہایت بانکے ترچھے سپاہی بل دار چیرہ باندھے، اور اس پر طُرّہ جگمگائے ہوئے ایک بانکے کے ساتھ چلے آرہے ہیں۔ دونوں زمین پر اس غرور کے ساتھ قدم رکھتے ہیں جیسے رستم کے پوتے ہوں۔ ایک ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ رہا ہی تو دوسرا القا کبوتر بنا ہوا ہی۔ زمین کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ بانکے صاحب الگ مونچھوں کو تاؤ دے رہے ہیں سپاہی صاحب الگ ڈاڑھی کو چڑھا رہے ہیں۔ وہ اگر خانہ جنگی لڑ کر بدن میں ٹانکے کھانے کا ذکر کر کے دوت دات ہانکتا ہی، تو یہ کھیتوں میں جا کودنے اور لاکھوں تیس بھگانے اور پھر بے داغ نکل آنے کا تذکرہ کر کے تعلّی کی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہی۔

---

۵۱ بیاج وہ اضافہ جو ایک جنس کے بدلے میں اُسی جنس سے لیا جائے جیسے روپے کے بدلے روپیہ پیسے کے بدلے پیسہ۔ گیہوں کے بدلے گیہوں کا زیادتی کے ساتھ مبادلہ ہو۔ مسلمان اُس کو بیاز بولتے ہیں۔
۵۲ تیرج ایک مُطول اور مفصل فردِ حساب کا خلاصہ۔
۵۳ بیجک وہ کاغذ جس میں مال کی تعداد خرچہ قیمت خرید اور تفصیل درج ہو۔ روانہ شدہ مال کی فہرست یا فرد۔
۵۴ جوگ۔ وہ شخص جس کے نام ہُنڈی کی جائے۔
۵۵ بستار۔ پھیلاؤ۔ وسعت فراخی۔ کشادگی۔ طول کلامی۔ تفصیل۔ تشریح (عورتیں بالضم بولتی ہیں) پھیلاوٹ۔ تقسیم عمل بانٹ۔ حساب کا عمل یا حل۔

نظیران کی لمبی چوڑی باتیں سن کر مسکراتا ہے۔ چلتے چلتے وہ آخر ایک ایسے مقام میں پہنچا ہے جہاں ہر روپیہ ہر درجے اور مرتبے کی قمریاں اپنی اپنی کابکوں میں بیٹھی لوگوں کو اپنی اداؤں سے رجھا رہی ہیں۔ کسی کا کوئی معزز آشنا سامنے سے گھوڑا اُڑاکر نکل گیا۔ کسی کا کوئی دل لگی کا یار راکٹ دکھا کر چلا گیا۔ جانے پہچانے لوگوں سے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہو رہی ہیں۔ کسی بڑھیا نائکہ نے وسعتِ اخلاق سے کسی پرانے ملاقاتی کو پیچھے کے نیچے پکار کر ٹھہرالیا ہے۔ مزاج پوچھ رہی ہیں۔ اُن کے مدتوں سے نہ آنے کی شکایت فرما رہی ہیں "آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔ دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ ہم غریبوں کے ہاں کیوں آنے لگے"۔ بڑے میاں معذرت کرتے جاتے ہیں۔ ترددات دنیاوی کا ایک دفتر کھل گیا ہے۔ "لڑکا بیمار تھا۔ خدا کے گھر سے پھرا ہے۔ بھائی پر ایک مقدمہ دائر ہو گیا تھا۔ مہینوں میں اُس سے نجات ہوئی۔ خود میں مسہلوں کے عذاب میں تھا۔ جب سے وہ مرضِ مبارک ہوا چیت کے چیت مسہل لینا پڑتا ہے۔ نہ لوں تو تمام بدن پھوڑے پھنسیوں سے بھر جائے۔ ایک عذاب میں ہوں"۔ ایک دوسرے کوٹھے پر ایک دوسرا سین ہے۔ چند نوجوان چھوکریاں جمع ہیں۔ ایک ایک اُن میں کی آفتِ روزگار ہے۔ ان کے بیچ میں ایک مضحک صورت کے پرانے بوالہوس بیٹھے ہوئے ہیں۔ زمانۂ جوانی میں اُنھوں نے بہت عیش کیا ہے اور اپنی دولت بھی اسی عیش میں پھونک ڈالی ہے۔ بڑھاپے میں نہ عیش کی قوت ہے نہ سامان۔ مگر چسکا پڑا ہوا ہے۔

بوڑھے ہوئے، پر حُسن کی چاہت نہیں چھُٹتی	اور دل سے بھی محبوب کی اُلفت نہیں چھُٹتی
آنکھوں سے یہ دیدار کی لذت نہیں چھُٹتی	سب چھُٹ گیا پر دید کی یہ لت نہیں چھُٹتی

بے ویسی صحبت کے جی کیوں لگنے لگا۔ معمول بموجب آ گئے ہیں۔ چھوکریوں کو ایک خاصہ مضحکہ ہاتھ آیا ہے۔

منھ دیکھتے ہی کہتی ہیں سب "آؤ بڑے جی   کیا آئے ہو یاں کرنے کو پیری و مریدی؟
کیا آئے ہو حضرت ہمیں قرآن پڑھانے   ہنس ہنس کوئی پوچھے ہے نمازوں کے دوگانے
ٹھٹھے سے کوئی پھینکے ہے تسبیح کے دانے

کھینچے ہے کوئی ہاتھ، کوئی پکڑے ہے لکڑی   ٹپے کہیں، اور موچھیں کہیں جاتی ہیں پکڑی
ڈاڑھی کو پکڑ کھینچ کوئی جھاڑے ہے مکڑی

نقلیں کوئی اُن پوپلے ہونٹوں کی بناوے   چل کر کوئی کُبڑے کی طرح قد کو جھکاوے
ڈاڑھی سے کئے اُنگلی کو لالا کے نچاوے

نظیر اُس بازار سے گزرتا ہے جہاں خربزے اور جالیوں کا انبار لگ رہا ہے۔ آموں کا ڈھیر ہے۔ ہندوؤں کی عورتیں بڑے گھیر کا لہنگا۔ چولی پہنے۔ دُلھن کی طرح گھونگھٹ نکالے، ایک خاص ادا سے چھم چھم کرتی ہوئی خریداری کے لیے آجا رہی ہیں۔ اُن میں بعض کی حسین کلائی اُس کے دل میں شوق کی گدگدی پیدا کرتی ہے۔ خمار آلودہ آنکھوں کی گھونگھٹ کے اندر سے ترچھی آڑی نگاہیں تیرِ نیم کش بن کر جگر کے پار ہوتی ہیں۔ نظیر گو اُن سے نہیں کہتا مگر دل ہی دل میں سو دفترِ شوق لکھ چلتا ہے۔ اور بار بار اُس کی طبیعت کے پُرجوش بحر میں یہ شعر عالمِ حسنِ طلب میں موزوں ہوتا ہے:-

اک دم کو آگئے ہیں منھ مت چھپالے ہم سے
ٹک ہنس کے اوپری رو آنکھیں لڑالے ہم سے

بازار میں ایک گوشے میں گاہکوں کا بہت ہجوم ہے۔ کوئی رنگیلی کنجڑن چٹکیلی پوشاک پہنے نارنگیوں کا بیوپار کر رہی ہے۔ نارنگیوں سے زیادہ لوگ اس کی نارنجی پوشاک اور رسیلی آنکھوں پر لٹو ہیں۔ وہ شوخ بھی

اپنی آنکھوں کی ترازو میں نہایت پھرتی سے لوگوں کے شوق کو تول رہی ہے۔ ہر کو اُس کے اشتیاق کے مطابق نارنگی دکھاتی ہے۔ کبھی بے ساختگی سے آنچل ڈھلک جاتا ہے۔ کبھی کسی چیز کے اُٹھاتے وقت آپ سے انگیا چڑھ جاتی ہے۔

سامنے اپنے وہ بازار سا گونوں کا لگا	دم بدم چھیڑ سے کہتی ہے یہ انگیا کو دکھا
’’تم نے پیسے کی کبھی ہم سے نہ لی نارنگی‘‘	

روز کی ہواخوری اور سیرِ بازار نے نظیر کی معلوماتِ حُسن و عشق میں ایک خاص وسعت پیدا کی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ حُسن کی کہربائیت کم و بیش ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے اور تھوڑی بہت اس کی نکیلی چوٹ ہر دل کو لگتی ہے۔ کبھی کبھی جھونپڑوں سے بعض ایسی صورت کو جھانکتے دیکھتا تھا جس سے نوابوں اور امیرزادوں کے دلوں میں ہل چل مچ جا سکتی تھی۔ وہ بعض اوقات سُنتا تھا کہ بعض بیگمات جھروکے سے جھانکتے جھانکتے کسی کی اُلفت کی جھونک میں کسی جھونپڑے میں جابراجیں۔ باپ کالے کوسوں اپنی نوکری کے جھگڑوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ ماں پروسے کی بیوی اُس کو باہر کی کیا خبر۔ میاں نظیر پر جوانی کی آفت سوار۔ ایک پلٹن نوجوان دوستوں کی ہر وقت زیرِ کماں۔ دن رات شہرِ عیش و تفریح پہ دھاوے رہتے تھے۔ آدمی شب و روز میدانِ کارزار میں رہے اور بال بال محفوظ رہے۔ کبھی کوئی چرکا نہ کھائے۔ کوئی گولی ذرا پہلو سے چھلتی ہوئی بھی نہ نکل جائے، ممکن نہیں۔ نظیر کا دل بھی عشق کی چوٹ سے محفوظ نہیں رہا۔ اُس نے اپنی سیر میں ایک نہیں بیسیوں دفعہ بعض ایسی صورت دیکھی جس کو دیکھ کر وہ تلملا تلملا کر رہ گیا ہے۔ لیکن چوں کہ قلب پر قابو رکھتا تھا، اور مضبوط اُصول اور مضبوط ارادے کا آدمی تھا اُس نے عنانِ اختیار ہاتھ سے نہیں دی۔ مگر آخر ضبط کی کوئی انتہا بھی ہے۔ ایک جگہ فقط آنکھیں متوالی تھیں۔ دوسری جگہ اِس متوالی کے پاس بھنوؤں کی کھچی ہوئی کمانیں، اور پلکوں کے

سُڈول اور لمبے نُکیلے تیر بھی تھے۔ تیسری جگہ زُلفوں کی لمبی کمند بھی لٹک رہی تھی۔ چوتھی جگہ وار روکنے کو دو قیامت کی ڈھالیں بھی تھیں۔ وہ کون سُورما ہے جو اتنے ہتھیار دیکھ کر بھی ہتھیار نہ رکھ دے۔ نظیر کے بھی آخر پائے ثبات لڑکھڑائے۔ بے اختیاری شوق میں ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے بعض خاص محرمِ راز کو بُلایا ہے۔ اُن سے تخلیے میں وہ رُک رُک کر اپنے عشقی حالات بیان کر رہا ہے۔ اقرار کرتا ہے کہ اب ضبط کی طاقت نہیں۔ پوچھتا ہے کہ مُلاقات کی کیا شکل؟ محرم اُس کو تسکین دیتا ہے۔ کچھ تدبیریں پیش کرتا ہے۔ نظیر نا آزمودہ کاری کی وجہ سے اُن کے قبول کرنے سے ہچکچاتا ہے۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے کوچہ دل دار کی طرف رُخ کرتا ہے۔ وہ دوست جو کسی قدر تجربہ کار ہے ساتھ ہوتا ہے۔ دہنے بائیں دیکھ کر کھڑکی میں در آتا ہے۔ دل کی دھڑک کے ساتھ سیڑھیوں کو طے کر کے اوپر پہنچتا ہے۔ جھیپتا ہوا لبِ فرش تک جاتا ہے۔ گھبراہٹ میں جوتی پائوں کی اُتارتے ہی مُنتشر ہو جاتی ہے۔ اُس شاہدِ نظیر فریب کو خبر ہوتی ہے۔ سَونار سے سر نہوڑائے گردن جُھکائے آتی ہے۔ عجب ادا سے بندگی کرتی ہے۔ نظیر تھراتی ہوئی آواز سے جواب دیتا ہے۔ چلکے ہوے چہرے کے ساتھ مزاج پوچھتا ہے۔ خود شوق کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ دوست اُس کی زبان بنتا ہے۔ تبسّم کے ساتھ کچھ دبی زبان سے کلماتِ انکسار بیان ہوتے ہیں "میں کس لائق ہوں۔ آپ لوگ مجنوں کے جھروکے سے دیکھتے ہیں" شکریہ ادا ہوتا ہے "میری بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ غریب خانے پر تشریف لائے" حُقّے کی دعوت ہوتی ہے۔ چلتے وقت عطر اور پان دیا جاتا ہے۔ عاشق کچھ پیش کش کرنا چاہتا ہے۔ قبول نہیں ہوتا۔ وعدہ لیا جاتا ہے کہ "پھر تشریف لائیے گا۔ بھول نہ جائیے گا" مکتبِ عشق میں یہ نظیر کی بسم اللہ تھی۔ چوں کہ ذہین تھا اور فنِ عشق سے ازلی مناسبت لے کر آیا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس فن میں بھی ایسی ترقی کی کہ بڑے بڑے اُستاد اس کا لوہا ماننے لگے۔ شاہدوں میں اُس کی بڑی قدر تھی۔ اُن کے نکاتِ حُسن اس پر جیسے

کھلے تھے مشکل ہی کہ دوسروں پر کھلیں۔ ہر ایک نکتے کی پہنچ کر داد دیتا تھا اور کان کے رستے سے ان کے دلوں میں سما جاتا تھا۔ پھر شعر و سخن کی چاٹ الگ تھی۔ ظرافت کی چاشنی جدا۔ اس کے آتے ہی حسین چہروں پر مارے شگفتگی کے تازہ گلاب کھل جاتے تھے۔ گل کی طرح جاموں میں پھولی نہیں سماتی تھیں۔

میں نے بڑی تلاش سے نظیر کی ایک معشوقہ کا پتا لگایا ہی۔ نام اس کا موتی ہی۔ گو نظیر نے صاف اس کی رنگت نہیں بتائی۔ اس کا قد و قامت نہیں دکھایا۔ لیکن اس کا کوئی بناؤ اس نے ہم سے نہیں چھپایا۔ وہ ہنستی ہی تو روکتا نہیں۔ باتیں کرتی ہی تو ٹوکتا نہیں۔ پان کھاتی ہی تو کھانے دیتا ہی۔ مسی لگاتی ہی تو لگانے دیتا ہی۔ گلا کھول کھول کر دکھاتا ہی کہ موتیا کے ہار کس قدر زیب دیتے ہیں۔ بازو اور کلائی کھول کھول کر دکھاتا ہی کہ بازوبند اور گجرے کس قدر موزوں ہیں۔ ایک ایک زیور کا حسن دکھاتا ہی اور داد لیتا ہی۔ زیوروں کی خوشنما جھنکار اور زمزمہ سنانے کو وہ اس شاہدِ رعنا کو ناز سے دو چار قدم چلنے کی بھی اجازت دیتا ہی۔ چہرے پر پسینے کی بوندوں کی بہار دکھانے کو کبھی وہ اس سے بال بال میں موتی بھی گندھواتا ہی۔ اور کسی معشوقہ سے قطع نظر کی جائے تو کی جائے مگر اس سے قطعِ نظر ممکن نہیں۔ نظیر نے اس کی تصویر یوں کھینچی ہی:۔

رہے ہیں اب تو پاس اس شوخ کے شام و سحر موتی	جبیں پہ موتی، اور سر میں ہیں موتی، مانگ پر موتی
ادھر جگنو، ادھر کچھ بالیوں میں جلوہ گر موتی	بھرے ہیں اس پہ ری میں اب تو یا رو سر بسر موتی

گلے میں، کان میں، نتھ میں، جدھر دیکھو ادھر موتی

کوئی اس چاند سے ماتھے کے ٹیکے میں اچھلتا ہی	کوئی بندوں سے مل کر کان کے نرموں میں ہلتا ہی
لپٹ کر دھکدھکی میں کوئی سینے پر مچلتا ہی	کوئی جھمکوں میں جھومے ہی کوئی بالی میں ہلتا ہی[۵۱]

[۵۱] قدما نے ہلنا بفتح ہا بھی باندھا ہی۔ چنانچہ میر نے اپنے شکار نامے میں لکھا ہی:۔ ؎ لگی گولی پڑنے، نہ پھر چل سکا + نہ جاگہ سے اٹھ سکا، نہ ٹک ہل سکا + دیگر ؎ کیوں گردن ہلال ابھی سے ڈھلک چلی + ابرو تو اک طرف پلک اس کی نہیں ہلی + سودا ؎ ممکن ہی تیر خوردہ تڑپھ کر سنبھل سکے + مارا تری نگہ کا جگہ سے نہ ہل سکے +۔

یہ کچھ لذت ہی جب اپنا چھداتے ہیں جگر موتی

کبھی وہ ناز میں ہنس ہنس کر جو کچھ باتیں بناتی ہی
ادا و ناز میں چنچل عجب عالم دکھاتی ہی
تو اک اک بات میں موتی کو پانی میں بہاتی ہی
وہ سُمرن موتیوں کی اُنگلیوں میں جب پھراتی ہی
تو صدقے اُس کے ہوتے ہیں پڑے ہر پور پر موتی

غلط ہی اُس لبِ رنگیں کو برگِ گل سے کیا نسبت
اُداہٹ کچھ مسی کی، اور اُس پر پان کی رنگت
کہ جن کی ہی عقیق اور تپنے اور یاقوت کو حسرت
وہ ہنستے ہیں تو کھلتا ہی جواہر خانۂ قدرت
ادھر لعل اور اُدھر نیلم، ادھر مرجاں اُدھر موتی

کبھی جو بال اپنے میں وہ موتی پروتی ہی
بدن بھی موتی، اور سر پانوں سے پہنے بھی موتی ہی
نزاکت سے عرق کی بوند بھی مکھڑے کو دھوتی ہی
سراپا موتیوں کا پھر تو اک گچھّا وہ ہوتی ہی
کہ کچھ وہ خشک موتی، کچھ پسینے کے وہ تر موتی

گلے میں اُس کے جس دم موتیا کے ہار ہوتے ہیں
نہ تنہا رشک سے قطراتِ شبنم دل میں روتے ہیں
چمن کے گل سب اُس کے وصف میں موتی پروتے ہیں
فلک پر دیکھ کر تارے بھی اپنا ہوش کھوتے ہیں
پہن کر جس گھڑی بیٹھے ہی وہ رشکِ قمر موتی

وہ زیور موتیوں کا، واہ! اور کچھ تن وہ موتی سا
سراپا زیب و زینت میں وہ عالم دیکھکر اُس کا
پھر اُس پر موتیا کے ہار، بازو بند، اور گجرا
جو کہتا ہوں "ارے ظالم، ٹک اپنا نام تو بتلا"
تو ہنس کر مجھ سے یوں کہتی ہی وہ جادو نظر "موتی"

کڑے، پازیب، توڑے[لہ] جس گھڑی آپس میں لڑتے ہیں
تو ہر جھنکار میں کس کس طرح باہم جھگڑتے ہیں
کسی دل سے بگڑتے ہیں، کسی کے جی پہ اڑتے ہیں
کڑے سونے کے کیا، موتی بھی اُس کے پانو پڑتے ہیں
اگر باور نہ ہو دیکھو ہیں اُس کے کفش پر موتی

خفا ہو اِن دنوں کچھ روٹھ بیٹھی ہے جو ہم سے وہ
تو اُس کے غم میں جو ہم پر گزرتا ہے سو مت پوچھو
چلے آتے ہیں آنسو، دل پڑا ہے ہجر میں غش ہو
وہ دریا موتیوں کا ہم سے روٹھا ہو تو پھر یارو
بھلا کیوں کر نہ برساوے ہماری چشم تر موتی

شفق میں اتفاقاً جیسے سورج ڈوب کر نکلے
دیا ابرِ گلابی میں کہیں بجلی چمک جاوے
بیاں ہو کس طرح سے آہ! اُس عالم کو کیا کہیے
تبسم کی جھلک میں یوں جھمک جاتے ہیں دانت اُس کے
کسی کے یک بیک جس طور جاتے ہیں بکھر موتی

ہمیں کیوں کر پری زادوں سے بوسوں کے نہ ہوں لہنے
جڑاؤ موتیوں کے اِس غزل پر وارئیے گہنے
سخن کی کچھ جو اُس کے دل میں ہے الفت لگی رہنے
نظیر اس ریختے کو سن وہ ہنس کر یوں لگی کہنے:
"اگر ہوتے تو میں دیتی تجھے اک تھال بھر موتی"

اِس کا تجویز کرنا مشکل ہے کہ گو یہ شخص کاجل کی کوٹھری میں لباس دامن دار پہن کر مدتوں جایا کیا مگر ساتھ اس کے اُس کا دامن، اُس کی آستین دھبوں سے پاک رہی۔ خود اُس کے زمانے میں لوگوں کی اُس کی نسبت مختلف رائیں تھیں۔ بُرے لوگ جن سے زمانہ بھرا پڑا ہے اُس کو یقیناً ایک چھٹا ہوا شہدا جانتے تھے۔ اُس کے شاہدانِ بازاری کے ہاں زیادہ آنے جانے کی تاویل سوا اس کے اُن کے ذہن میں کوئی تھی ہی نہیں کہ وہ اُن سے

لہ توڑا زنجیر گلو خواہ پا جو بطور زیور اکثر عورتیں پہنا کرتی ہیں۔

ناپاک تعلقات رکھتا تھا۔لیکن جن کو اُس کے ساتھ خصوصیت تھی، اُس کے دن رات کے جلیس تھے۔وہ دیکھتے تھے کہ وہ ایک خاص حد سے زیادہ کسی شوخ رنگیں ادا سے مُخالطت نہیں کرتا۔اُن کو تعجب بھی ہوتا تھا کہ باوجود طرفِ ثانی کے التفاتِ زائد کے یہ سبقتِ زائد کیوں نہیں کرتا۔بعض دفعہ اس کی خوش قسمتی پر رشک کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "تم پر عورتیں مرتی ہیں اور تم کو کچھ التفات نہیں۔کاش ہم کو یہ موقع ملتا تو پھر تم دیکھتے کہ کیا ہوتا ہوتی"۔ وہ اس قسم کی باتوں پر مُسکرا دیتا۔احباب اُس کے دیکھتے تھے کہ بعض دل رباؤں کے ساتھ اُس کو خاص شیفتگی ہے۔اُن کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کو وہ حد سے زیادہ پسند کرتا ہے۔اُن کی صحبت میں ہر موقعِ فرصت پر بیٹھا ملتا ہے۔تخلیے کی صحبتیں بھی اُن سے رہتی ہیں۔اختلاط کی پینگیں بھی بہت بڑھی ہوئی ہیں۔چٹکی کر رہا ہے۔انگلیاں چٹخا رہا ہے۔سر میں تیل ڈال رہا ہے۔تلوا سہلا رہا ہے۔ہتیلی کو نرم نرم اُنگلیوں سے دبا رہا ہے۔مگر کسی موقعِ عام پر اُن کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں نہیں جھپکتیں۔وہ ہر ایک موقع پر اُن سے آنکھ میں آنکھ ڈال کر بہ نہایت کشادہ پیشانی سے باتیں کر سکتا ہے۔تاڑنے والے اپنے فن کے قواعد کی رو سے اُس کو عشقی محکمے میں مجرم قرار دے نہیں سکتے، گو بدگمانی کبھی کبھی یوں ہی کچھ کانوں میں پھونک دیتی ہے۔

نظیر کے بعض رندانہ کلام سے لوگ ایسا استنباط کر سکتے ہیں کہ وہ شاید عشق کی انتہائی ذلیل اور ناپاک حالت تک پہنچا ہو۔چنانچہ اُس کی اُس غزل کے پڑھنے پر جس کا مطلع یہ ہے:-

دیکھ کر کُرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی	دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی

تھوڑی دیر کے لیے مجھ کو بھی ایسا شبہہ پیدا ہوا تھا۔غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل نظیر نے کسی دوست کی فرمایش سے عالمِ جوانی میں لکھی تھی۔اُس دوست کو کسی رنگیں لباس شاہدِ بازاری سے کسی خاص زمانے میں تعلق تھا اور تعلق انتہائے بے تکلفی کو پہنچ کر بعض مبارک امراض کا بھی مُوجب ہوا تھا

مزاج تو ان کافروں کے نہایت نازک ہوتے ہیں۔ کسی دن کسی چیز کی فرمایش کی۔ وہ چیز تو بھیجی گئی مگر جس عورت کے ہاتھ بھیجی گئی وہ کوئی نہایت چالاک اور عیار ماماتھی، رستے میں کھا گئی، اور وہاں جا کر کچھ جھوٹ سچ بات بنا دی۔ تحقیق کی فرصت کس کو، اور ہو بھی تو اتنی تاب کہاں۔ بگڑ کر فوراً منع کر دیا کہ" فلاں شخص ہماری ڈیوڑھی میں قدم رکھنے نہ پائے۔ ورنہ ہم سے کوئی برا نہیں" نظیر کے ہاں دوڑے ہوے پہنچے" یار غضب ہوا۔ وہ کٹنی تحفہ لینے آئی تھی۔ وعدہ کر کے آؤں اور نہ بھیجوں، یہ کیوں کر ہو سکتا تھا۔ مگر نہیں معلوم اُس کم بخت نے کیا کیا کہ اُن کو نہیں ملا۔ اب وہ بگڑی ہوئی ہیں۔ کوئی تدبیر ایسی کرو کہ اُن کی رنجش مٹے" نظیر نے قلم اُٹھایا اور فوراً ایک شوخ غزل لکھ دی۔ نظیر کے تخلّص نے اثرِ مطلوب کی ضمانت کی۔

ممکن ہے کہ اس غزل کو خود نظیر کے سر مڑھا جائے، لیکن انسان کی فطرت کے خلاف ہے کہ اپنے عیوب کو اس اعلان کے ساتھ بیان کرے۔ اگر کسی شخص کو کوئی مرض ہو بھی تو اس آزادی کے ساتھ اُس کو بیان نہیں کر سکتا۔

اور تو کیا ہے مگر ملکے سے اک سوزاک کی	ہے ہمارے پاس بھی اب تک نشانی آپ کی

علاوہ بریں ہم اُس کے تمام کلام میں ایک خاص اخلاقی اثر پاتے ہیں جو صاف بتاتا ہے کہ وہ ایک پاک اور صاف اور گہرے سرچشمے سے آیا ہے۔ ہزلیات میں گو اُس کے رندوں کا گہرا تجربہ شامل ہے لیکن اُس کے اوراخلاقی خیالات کی قوت اور گہرائی اس امر کا تصور بھی نہیں کرنے دیتی کہ وہ تجربے اُس کے ذاتی ہیں۔

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ	ہے زمیں اُن کی اور اُن کا آسماں سب سے الگ
پاک ہیں آلایشوں سے، بندشوں سے بے لگاؤ	رہتے ہیں دُنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

وہ بزمِ عیش میں ایک مقام پر لکھتا ہے کہ "ایک دل فریب شوخ میرے ہاں آئی۔ میں نے اُس کی طرف

خطاب کرکے یہ شعر پڑھا:-

کرم کردن با حوالِ غریباں		زدل داراں زدل داری تواں گفت		

تھوڑی دیر کے بعد وہ اُٹھ کھڑی ہوئی - میں نے اُس کی آستین پکڑی - اُس نے کہا "اب میرا ٹھہرنے کو جی نہیں چاہتا" میں نے کہا "میرا تو جی چاہتا ہی" اُس نے کہا "اگر تمھارا یہ جی چاہے کہ بوسہ لوں" میں نے کہا "میں تو پارسا ہوں" اُس نے کہا "اگر تم رند ہو جاؤ" میں نے کہا "ابھی تک تو ہوا نہیں - آیندہ کی خدا جانے" اُس نے کہا "تمھاری نظر سے تو رندی اب بہت قریب ہی" وہ تو چلی گئی مگر میں اس خیال پر بہت دنوں تک ہنستا رہا -
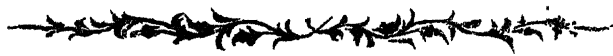
نظیر کی میلے ٹھیلوں میں شرکت

نظیر جس مزاج کا آدمی تھا وہ کبھی اپنے آپ کو میلے ٹھیلوں سے الگ رکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ انسانی حالات اور خیالات سے حکمت اور عقل حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ انسانی تھیسٹر کا ایک دور اندیش اور صاحب نظر تماشائی تھا۔ وہ ڈراپ سین کے اُٹھنے پر اپنی آنکھیں کسی طرح بند رکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ رغبت اور نفرت رشک اور حسد عشق و محبت کے معاملات سے تفصیلاً واقف ہونا چاہتا تھا۔ بچوں کی معصومانہ خوشی اور اُن کی معصومانہ طلب اور خواہشیں۔ بوڑھوں کی متانت اور سنجیدگی اور قدرتی قناعت۔ عورتوں کا غرورِ حُسن اور شوقِ نمایش۔ جوانوں کا اکڑ بَل۔ سب اُس کو اپنی طرف مشغول کر لیتے ہیں۔ تیراکی کا میلا ہو۔ کنکوے کا میلا ہو۔ کبوتر بازی کا میلا ہو۔ دوالی ہو۔ ہولی ہو۔ بلدیو جی کا میلا ہو۔ کوئی تقریب ہو کسی طرح کا تیوہار ہو سب میں اس کو جانا۔ اور پوری طرح عاقلانہ لطف اُٹھانا۔

میں دیکھتا ہوں کہ وہ ایک دفعہ خود برج جا کر ہولی کی سیر دیکھ رہا ہے:۔

یہ سیر ہولی کی ہم نے تو برج میں دیکھی
کہیں نہ ہووے گی اس لُطف کی میاں ہولی
کوئی تو ڈُباہی دامن سے لے کے آ چولی
کوئی تو مُرلی سجاتا ہے کہ "کنہیا جی"

ہے دھوم دھام یہ بے اختیار ہولی میں

گھروں سے سانوری اور گوریاں نکل چلیاں
گُھنگھٹ اوڑھنی، اور مست کرتی اچپلیاں

جدھر کو دیکھیں اُدھر مچ رہی ہیں رنگ رلیاں[51] | تمام برج کی پریوں سے بھر رہیں گلیاں

مزا ہی، سیر ہی، در ہر کنار ہولی ہیں

جو کچھ کھاتی ہی ابلا[52] بہت پیا یاری | چلی ہی اپنے پیا پاس لے کے پچکاری
گلال دیکھ کے پھر چھاتی کھول دی ساری | پیا کی چھاتی سے لگ گئی وہ چاؤ کی ماری

نہ تاب دل کو رہی، نے قرار، ہولی میں

جو کوئی سیانی ہی اُن میں، تو کوئی ہی ناکند | وہ شور بور تھیں سب رنگ سے نپٹ یک چند | میں
کوئی دلاتی ہی ساتھن[53] کو یار کی سوگند | کہ "اب تو جامہ و انگیا کے ٹوٹے ہیں سب بند

پھر آ کے کھیلیں گے ہو کر دو چار ہولی میں"

آگرے کی ہولی یوں دیکھتے ہیں:-

ایک لونڈا خوش رو جس کے چہرے پر گلاب کی پتّیاں کھلی ہوئی ہیں، سب سے آگے ہی، اور سیکڑوں لونڈے پیچھے ہیں۔ جتنے ہیں سب کا کپڑا چھڑکواں رنگا ہی۔ یہ گل رُخوں کا غول آگے ہی۔ منوا بھی ہیں۔ پھر ان کے پیچھے عاشقوں کا غول ہی۔ یہ بھی ہزاروں ہیں۔ عیش و تفریح کے رنگ میں سب ڈوبے ہوئے ہیں۔ خوشی کی بہاریں دکھاتے چلے جا رہے ہیں۔ میاں نظیر بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ پہلے گوکل پورے پہنچے۔ پھر نائی کی منڈی اور سید خاں کی منڈی سے گزرتے ہوئے عالم گنج میں داخل ہوئے۔ وہاں سے شاہ گنج پہنچے۔ پھر تاج گنج آئے

۵۱ رنگ رلیاں کھیل تماشا۔ ہنسی چہل۔ مذاق۔ ٹھٹھا۔ ٹھٹھول۔ عیش و نشاط۔ عیش و عشرت۔ مزہ لطف۔ خون سے پھر اُن کی رنگیں ہم نے گلیاں دیکھیاں + رنگ محلوں میں جنھوں نے رنگ رلیاں دیکھیاں۔ (ظفر)

۵۲ ابلا۔ شاہد نازک اندام۔

۵۳ ساتھن۔ ساتھ والی۔ ساتھ کی عورت۔

پھر کناری بازار میں رونق افروز ہوئے۔ وہاں سے موتی کٹرے آئے۔ پھر نیل منڈی اور پنی گلی پہنچے۔ غرض تمام شہر کا چکر لگا آئے۔

میاں نظیر فرماتے ہیں کہ "چوک، چارسو جہاں گئے ہر جگہ اس قدر بھیڑ پائی کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ اور ہر طرف ایک رنگین باغ کِھلا ہوا ہے"۔

بلدیوجی کا میلا[۱] - جاڑے کے دنوں میں آگرے کے قرب میں ہندوؤں کا یہ میلا بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے۔ جس طرح ہمارے صوبہ بہار میں چھتر کا میلا ہے۔ قریب قریب آگرے میں یہ بلدیوجی کا میلا ہے۔ بلدیوجی کا جہاں مندر ہے وہاں سے دو دو کوس تک باغ اور جنگل سب لوگوں سے بھر جاتے ہیں۔ ہزاروں بساطی اپنی سوداگری کی بساط بچھائے گہنے اور مالا بیچ رہے ہیں:۔

اتنے لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہیں آ	جو کہ تل دھرنے کی نہیں ہے جا
لے کے مندر سے دو دو کوس لگا	باغ و بن بھر رہے ہیں سب ہر جا

لاکھوں بکتے ہیں گہنے اور مالا

ہزاروں جنس کی دکانیں لگ رہی ہیں۔ موتی، مونگا خریدنا چاہیے اُس کی بھی کمی نہیں۔ آئینہ کنگھی لینا چاہیے اُس کی بھی افراط ہے۔ حلوائی ایک طرف پیڑے، لڈو، جلیبی، اور گٹے بیچ رہے ہیں۔ کھٹک کولے، نارنگی، سنگترے کی بہاریں دکھا رہے ہیں۔ کہیں مٹی اور کاٹھ کے کھلونے بک رہے ہیں کہیں کا چھن بیٹھی بیر چنوا رہی ہے۔

[۱] میرے ایک مخدوم میرزا محمد علی بیگ جو آگرے میں مدتوں سے وکالت کرتے ہیں اور وہیں اُن کا وطن بھی ہے اس میلے کی نسبت عبارت ذیل تحریر فرماتے ہیں: "میلہ بلدیوجی از ایں شہر بفاصلہ تخمیناً ہشت فرسخ مے شود۔ قصبۂ کوچکے بایں نام در ضلع متھرا است۔ ہندو با معبدے آنجا ساختہ اند و ایں معبد بسیار قدیم ہست۔ نمی دانم کہ مے شود مگر ہر سال یک مرتبہ مے شود۔"

لاکھوں بیٹھے بساطی اور منہار	اپنا سب گرم کر رہے بازار
چُوڑی، بنگڑی[۵۱] کی اک طرف جھنکار	نوگرہی، پوتھ، انگوٹھی، چھلے، ہار

٭

سیکڑوں رنگ رنگ کی چھڑیاں	پھول گیندوں کے ہار کی لڑیاں
عیش عشرت کی لُٹ رہیں دھڑیاں[۵۲]	دال موٹھیں، منگوچھی، اور بڑیاں
ہر طرف کھل رہے گُل وریحاں	ہار، بدھی، مٹھائی، اور پکوان

باجے انواع طرح کے بج رہے ہیں:-

اک طرف نو بتیں جھنکاریں[۵۳] ہیں	جھانجھ، مردنگ، راس دھاریں ہیں
جھانجھ، مردنگ، دف بجاتے ہیں	راس منڈل بھجن سُناتے ہیں

دُور دُور سے راجہ رجواڑے آئے ہیں۔ پالکی، ہاتھی، گھوڑے۔ رتھ بک رہے ہیں۔ مول تول ہو رہا ہے جوگی، بیراگی، گیانی، دھیانی ہر قسم کی خلقت کا ہجوم ہے۔

یہاں نظیر مولویوں کے فتوے کو کیا مانیں، اور تکفیر کو کیا جانیں۔ گو ہندوؤں کا میلا ہے مگر اپنی اصلی خوش نیّتی سے عقل اور شعور سیکھنے کے لیے آگئے ہیں۔ پہلے تو وحدۃ الوجود کی عینک لگا کر ہر طرف اُسی ایک معبود کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ پھر میلے کی تفصیلات پر حکیمانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ لوگوں کا جُوق جوق ہر طرف سے آنا،

---

۵۱ بنگڑی = ایک قسم کی کانچ کی بل دار چوڑی۔
۵۲ دھڑی پنسیری۔ دھڑیوں بافراط بکثرت پُوری طرح سے اٹھائے لطف بھلا کر اُسے گھڑیوں مزے لوٹے مستی الیدہ
لب کے ہم نے بھی دھڑیوں مزے لوٹے۔ (نکہت)
۵۳ جھنگار نوبت کی آواز نوبت کی ٹکور۔

خرید و فروخت کے بازار کا گرم ہونا، مندر کی طیّاری، صحنِ مندر کی نفاست، اس کے گنبد کی رفعت، مکلّف پردوں کا دروازہ پر چھوٹا ہونا۔ کنڈ پہ نہان کا ہونا۔ یہ سب باتیں تو خیر ہر معمولی نگاہ دیکھ سکتی ہے (مگر یہ کچھ اس سے بھی سوا دیکھ رہے ہیں جو معمولی آنکھ دیکھ نہیں سکتی) ان کی آنکھیں عبرت کے روزن سے ڈکٹو کا کام کر رہی ہیں۔ لوگوں کو کیا خبر کہ ایک شاعرانہ مذاق کا ڈکٹو ہمارے ساتھ ہے۔ وہ میلے کے ہجوم سے استفادہ کر کے اپنے مختلف اغراض کے حصول میں سرگرم ہیں۔ مگر ان کے تمام افعال ان کی نوٹ بک میں درج ہو رہے ہیں۔

کہیں عاشق نظارے مار رہیں ہیں
کوئی انبوہ میں رہا ہے کچل
کتنے کرتے ہیں جست کود اچھل

سونگا ہوں کی جیت ہار رہیں ہیں
کوئی دھکوں میں کر رہا ہے دل دل
کتنے کہتے ہیں مور چھل جھل جھل

"رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے۔ الخ"

کوئی تو کر رہا ہے چھل بٹے[۵۱]
ہر طرف گلبدن رنگیلے ہیں
بات کے ترچھے اور کٹیلے ہیں
خشک، تر، نرم، سوکھے، گیلے ہیں

کوئی چڑھاتا ہے کھیر کے چٹّے[۵۲]
نک پلک غنچہ لب سجیلے ہیں
دل کے لینے کو سب ہٹیلے ہیں
ٹیڑھے، بل دار، اور نکیلے ہیں

[۵۱] چھل چھند، چلتر، بھگل یا کھنڈ۔ بٹا مداریوں کے وہ گول گول ڈھکنے جس میں گولیاں رکھ کر غائب کرتے ہیں۔ چھل بٹے فن فریب مکر و خدع دم اور دھوکا۔

[۵۲] چٹا یا چٹھا چاٹ سے ماخوذ ہے۔ اصل میں اس غذا کو کہتے ہیں جو معمولی غذا کے علاوہ تبدیل ذائقہ کے لیے پکایا کرتے ہیں۔ مثلاً فیرنی۔ کھیر۔ یاقوتی رسم ہند کے مطابق چوں کہ یہ چیزیں اکثر میٹھی ہوتی ہیں اس لیے چٹھے کا اطلاق میٹھی چیزوں پر ہونے لگا چٹھے کا میٹھے کے ساتھ مل کر ایک اصطلاح خاص بن جانا یہ بھی اسی کی دلیل ہے چٹھے مٹھوں کا مزہ پڑنا دونوں کی چاٹ لگنا کھٹے میٹھے کا مزہ پڑنا۔

جوڑے بھی سرخ، سبز، پیلے ہیں ⁘ پیار، الفت، بہانے، حیلے ہیں

کوئی چنچل چلے ہے ٹھمکی چال ⁘ کچھ وہ پتلی کمر، وہ لمبے بال

آنکھوں میں حسن کے نشے رنگ لال ⁘ مصری، ماکھن کے ہاتھوں اوپر تھال

کچھ وہ پوشاک، کچھ وہ حسن و جمال ⁘ مالنوں کا زیادہ اُن سے کمال

ڈال دیں ہار کا گلے میں جال ⁘ بدھی[۱] ہو کریں صاف دل کو نکال

ٹوٹے پڑتے گنواری اور گنوار ⁘ جس گنواری کو چلیے دھکا مار

گر کے دے گالی، یوں کہے ہے پکار:- ⁘ "کیسو اٹھلا[۲] چلے ہے داڑھی جار"

مٹی اور کاٹھ کے کھلونے ڈھیر ⁘ کوئی لیوے ہے کوئی دیوے پھیر

کوئی کمھاری کے کر رہا ہتھ پھیر ⁘ کوئی کاچھن سے چُن رہا ہے بیر

کوئی کنجڑن سے لڑ رہا منھ پھیر ⁘ کوئی بنیے کو مارتا ہے سیر

گالی، ڈُگ، مار کوٹ سانجھ سویر ⁘ لاٹھی پاٹھی ہے، شور، غل اندھیر

سیکڑوں رنگ رنگ کی چھڑیاں ⁘ پھول گیندوں کے ہار کی لڑیاں

کہیں چھوٹیں انار، پھلجھڑیاں ⁘ کہیں کھلتی ہیں دل کی گلجھڑیاں

کہیں الفت سے انکھڑیاں لڑیاں ⁘ کہیں باہنیں گلے میں ہیں پڑیاں

عیش و عشرت کی لُٹ رہیں دھڑیاں ⁘ دال موٹھیں، منگوچھی، اور بڑیاں

---

[۱] بدھی وہ پھولوں کا ہار جو بیاہ شادی میں دولہا کے گلے اور بغلوں میں حائل وار باہم متقاطع ڈالتے ہیں۔ یہاں بدھی میں ایک خفیف ایہام بھی ہے۔

[۲] اٹھلانا تکلف سے چلنا ناز و انداز سے چلنا مٹک کر چلنا۔ جان کر اَن جان بننا (اصل میں اینٹھ اینٹھ کر چلنا)۔

لگ رہی بھیڑ اس قدر ٹھٹھ ہو — راہ آگے کو اور نہ پیچھے کو
جو جہاں تھا وہیں پھنسا پھر وہ — جس کو کھینچے ہیں، گر پڑے ہی سو
بیٹھے کہتے ہیں کھا کے دھکوں کو: — "جے مہاراج، رام رام بھجو"
اور گنور دل پکار کر ہو ہو — اب تو لٹھ ڈار ہی لگانے کو

ناچ اور رنگ کے کھڑا کے ہیں — گھنگرو اور تال کے جھنا کے ہیں
نقلیں، قصّے، کہانی، ساکے[۵۱] ہیں — کھنڈ، دوہرے کبت کتھا کے ہیں
کہیں آغوش کے لپا کے ہیں — کہیں بوسوں کے سو جھپا کے[۵۲] ہیں
تھرتھری دانت پر کڑا کے ہیں — تپہ جاڑے کے سو جھڑا کے[۵۳] ہیں

کوئی آکر بہانے اور مِس[۵۴] سے — مل رہا ہی ملا ہی دل جس سے
ہوتے ہیں آملاپ جس تس سے — لڑ رہا ہی کوئی کہیں رِس[۵۵] سے
کوئی کھویا گیا ہی مجلس سے — کوئی چلائے پوچھے کس سے
کہنی بازوؤں میں لگ رہے گھسّے — اور دھکا پیل اور گھماں گھسّے
نازنیں ہیں وہ سانوری، گوری — جن کی نازک ہر اک پری پوری

---

[۵۱] یہاں ساکے سے وہ داستانیں مُراد ہیں جو کچھ ہندو ایک جگہ بیٹھ کر اپنے نامور بہادروں کے متعلق دل بہلانے کے لیے گا گا کر بیان کرتے ہیں مثلاً آلا اودل کی لڑائی۔ کنور برج کے معرکے۔ ساکے ہندوؤں میں شاہنامہ اور داستانِ عنتر اور داستانِ امیر حمزہ وغیرہ کے قائم مقام ہیں —

[۵۲] جھپاکا جلدی سے کوئی کام کرنا۔

[۵۳] جھڑاکا۔ جھپٹ۔ جھڑپ۔ ہلکی سی لڑائی۔ دو دو چونچیں۔ دو دو ہاتھ۔

[۵۴] مِس۔ مکر فریب دغا۔

[۵۵] رِس۔ غضب غصّہ خفگی ناراضی آزردگی ہٹ ضد اڑ۔

کرنے کے چتون نگاہ کی ڈوری
دھوم ناز و ادا جھکا جھوری[۵۲]
گھونگھٹوں میں ہیں کر رہی چوری
خلق آتی ہے سب جڑی جٹری
کوئی دوڑے ہے ہاتھ لے لکڑی
جیب[۵۳] کتری کہیں گئی پکڑی
چور نے تاک لی کہیں پگڑی

دل کو چھینے ہیں سب براجوری[۵۱]
برج میں جیسے مچ رہی ہوری
چوری کیسی کہ صاف سرزوری
چیز رکھتے ہیں باندھ کر جکڑی
"دوڑیو چور لے چلا گٹھڑی"
کہیں ٹوٹی دُکان اور ہٹڑی[۵۴]
سو تماشے، ہنسی، خوشی، پھکڑی

نہ چور کی تاک ہی کہیں پکڑی

ہر چند نظیر کی نواسی نے بیان کیا کہ میاں نظیر میلے میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ لیکن خود اُن کی تصانیف میں شواہد اس کے خلاف میں موجود ہیں۔ اُن کے قول کی توجیہ یوں ہوسکتی ہے کہ شاید بڑھاپے میں اُنھوں نے جانا آنا ضعفِ پیری کے سبب چھوڑ دیا ہو۔ نظیر نے ایک پوری کتاب لکھی ہے جس میں فقط اُنھوں نے اپنے میلے ٹھیلوں میں شریک ہونے کا حال قلم بند کیا ہے اور جو دلچسپ واقعات اُن کو پیش آئے ہیں اُن کو سیاہی کے آبِ حیات سے بقائے دوام بخشی ہے۔ اس کتاب کا نام بزمِ عیش ہے۔ شاید آگرے سے زیادہ دوسرے شہر میں میلے بھی نہ ہوتے ہوں۔ ہر چھوٹی سی بات پر وہاں ایک میلا ہو جایا کرتا ہے۔ تیراکی کے میلے ہیں۔ کنکوے[۵۵] کے میلے ہیں۔

[۵۱] براجوری۔ زبردستی دھینگا دھینگی۔
[۵۲] جھک جوری دھینگا مشتی چھین جھپٹ ہاتھا پائی توڑا مروڑی نوچا کھسوٹی۔
[۵۳] جیب کتری جیب کترنے کا آلہ۔
[۵۴] ہٹڑی تصغیر ہاٹ چھوٹی سی دُکان۔
[۵۵] کنکوے کے میلے کے متعلق میرے مخدوم میرزا محمد علی بیگ کیل آگرہ یوں تحریر فرماتے ہیں: "پتنگ بازی ہر شخص در خانۂ خود می کند و ہر سال بجاہائے مختلف مردم مجتمع شدہ یک روز یا دو روز باہم پتنگ بازی می کنند نام آں مجمع نرجلامی باشد در میدان مے روند و بہ تلہائے بلند باین کار مشغول می شوند۔"
ایک دوسرے آگرے کے دوست سے یوں معلوم ہوا: "پتنگ کے میلے کو نرجلا کہتے ہیں۔ نرجلا تاج گنج کے روضے میں بھی ہوتی ہے پیر گیلانی میں بھی ہوتی ہے (پیر گیلانی وہ مقام ہے جہاں حضرت ابوالعلا کا مزار ہے) شہر سے کوس ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر ایک مقام ہے جوگی بھوگی۔ وہاں بھی ہوتی ہے۔ بڑا میدان ہے۔ کوسوں تک پیچ چلے جاتے ہیں۔"

کبوتر بازی کے میلے ہیں - پھر خدا جانے کاہے کے میلے ہیں - کاہے کے میلے ہیں -

قبل اس کے کہ میں بزمِ عیش دیکھوں خود کلیات نظیر سے اس کا پورا ثبوت ملتا تھا کہ نظیر سے کوئی میلا چھوٹنا نہ تھا - چاہے ہندوؤں کا ہو - چاہے مسلمانوں کا - بزمِ عیش کے دیکھنے سے اُس خیال کی تصدیق ہوئی آغازِ کتاب میں نظیر میلوں کی کثرت کو یوں لکھتے ہیں :-

اس شہر میں انواع قسم کے مجمع اور فرحت افزا میلے ہوتے ہیں - ہر ایک میلے کا نام مشہور ہے اور ہر کے لیے ایک جگہ مقرر ہے - میلے کے دن تماشائی بکثرت جمع ہوتے ہیں - کچھ لوگ زرّیں پوشاک پہن پہن کر چاندنی پر رونق افروز ہیں - مسندیں بچھائے بچھائے رنڈیاں کہیں تبسم سے گلزار کھلا رہی ہیں - اور کہیں ٹہل ٹہل کر سروِ رواں کی بہار دکھا رہی ہیں - گانے بجانے والوں کا بھی ہر طرف ہجوم ہے - پان سے جس کا دیکھو مکھڑا لال ہے - ہاتھ میں پھولوں کے گجرے پڑے ہوئے ہیں - کہیں شراب کا دَور چل رہا ہے - حقے چل رہے ہیں - سودے والے بھی اپنا بازار جمائے ہوئے ہیں -"

دسہرے[1] کے دن کی ایک نقل یوں لکھتے ہیں :-

کہ صبح کے وقت میں جمنا کے کنارے پہنچا - دیکھا کہ میلا لگا ہوا ہے - گوری گوری صورتوں کی بہار صبح کی صباحت سے زیادہ پیاری - اور نہانے میں اُن کا پانی سے بھیگا ہوا جسم شبنم سے بھیگے ہوئے پھول سے زیادہ خوش نما - کنارے برہمن اپنی بساط بچھائے بیٹھے ہیں - اور تلک[2] کی چیزوں سے اُن کی بساط رنگین ہو رہی ہے

---

[1] دسہرہ جیٹھ کے مہینے کی دسویں تاریخ جس میں گنگا اشنان کرنے سے صاحبانِ ہنود کے اعتقاد کے موافق گناہ دھوئے جاتے ہیں - اسوج (آسن) کے مہینے کی دسویں تاریخ کا بڑا بھاری تیوہار جس میں نوروز پہلے سے پوجا وغیرہ کرتے اور اخیر دن دیوی کی مورتی میسو جھانجی سانجی وغیرہ کو دریا میں گراتے ہیں اور چونکہ رام چندر جی نے انہی دنوں میں راون پر چڑھائی کرکے فتح پائی تھی اُن کی لیلا رچاتے اور بڑی خوشی مناتے ہیں -

[2] تلک قشقہ ٹیکا وہ نشان جو ہندو لوگ صندل یا رولی یا سیندور وغیرہ کا لگاتے ہیں - رُولی ایک قسم کی سُرخ اور خشک چیز جس کا ہندو لوگ تلک لگاتے اور اُسے ہلدی پھٹکری اور ترشی سے بناتے ہیں - کمکو -

رتھوں کی چھتری جگمگا رہی ہے اور زریں زین گھوڑوں کی پیٹھ پر چم چم کر رہے ہیں۔

عیاں ہر جا بہارِ جامہ زیباں	نمایاں نازو حسنِ دل فریباں
صفِ اہلِ تماشا زینت افزا	ہمہ اسبابِ خوش وقتی مہیا
بر دے نیلگنبد از زمین بہرہ	نہ بے فرحت فزا روزِ دسہرہ

ایک صنم جو نہایت گورا چٹا تھا ہاتھ دھو کر پیشانی پر قشقہ کھینچ کر اپنے گھر کو چلا۔ اُس سے بات کرنے کے شوق میں مَیں بھی اُس کے پیچھے ہو لیا۔ جب میری طرف نگاہ کی میں نے کہا "اے دل آرام جے سیتا رام"۔ مسکرایا اور پوچھا "کیا چاہتے ہو"۔ کہا "عرضِ حال"۔ کہا "فرماؤ"۔ میں نے کہا "سری رامچندر نے لنکا فتح کی اور تمھارے سورما حسن نے میرے دل کا گڑھ

بود در زور دلِ من راون	رام کر دند بتاں رام کی سوں"

پوچھا "اس بات کا گواہ"۔ میں نے کہا "ہنومان"۔ ہنسا اور گھر تک مجھ سے باتیں کرتا ہوا ساتھ گیا۔

جس راجہ کے ہاں یہ متعلق تھے۔ اُس کے ہاں بڑی دھوم سے راس[1] کا جشن ہوتا تھا۔ اور اکثر کچھ تو تعلقِ دربار کے سبب اور کچھ شوقِ جبلّی کے باعث اُن کو اُس جشن میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ایک شب میں مجمعِ عالی (راجہ کے ہاں کا جشن مُراد ہے) میں پہنچا۔ دیکھا کہ راس کی بڑی تیاریاں ہیں چاندنی سفید، نہایت بڑی، دور تک وسعت کے ساتھ بچھی ہوئی ہے۔ لوگ عمدہ عمدہ پوشاک پر تزئین پہنے

[1] راس کھیل ناچ تماشا جیسا سری کرشن نے گوپیوں کے ساتھ کیا تھا جسے راس لیلا بھی کہتے ہیں چنانچہ اب تک کاتک اور اگہن میں راس دھاری اس کھیل کی نقل کیا کرتے ہیں۔

ہوئے قرینے سے بیٹھے ہیں۔ آداب کے ساتھ گفت گو ہو رہی ہے۔ راس[۵۱] دھاریوں کی زیب و زینت قابلِ دید
بوٹی بوٹی اُن کی ناز سے پڑی پھڑک رہی تھی۔ چمکیلے لباس کی محبوبی بیان نہیں ہوسکتی۔ اور جڑاؤ مکٹ
کی سر پر جگمگاہٹ تحریر میں نہیں آسکتی۔ معلوم ہوتا ہے سُورج کی کرنیں اُس سے نکل رہی ہیں۔ پھر زہرہ جبیں
سکھیاں اور اُن کے زریں پیراہن۔ نرت اس قسم کا ہوتا تھا کہ ناگاہ ناچنے لگے اور بھجن[۵۲] اس طور پہ گایا جاتا
تھا کہ ہر زبان کو ہر بھجن کی رٹ لگ جائے۔ آواز میں جادو۔ اور ساز کے میل میں عقل و ہوش کی ترقی
تبکرارِ ہر لیلا ہماں خیالِ پیشینیہ در آئینۂ دیدہ مُہیا و باظہارِ ہر کردار ہموں تصورِ شانِ رادھکا[۵۳] و شوکتِ کنھیا
بصدائے بانسری ادائے نند کشورن۔ و برسمِ چھاک آوری نیاز گوپیان و نازِ مدن موہن۔ نہاں گردیدنِ
نند لال چناں کہ ہر سکھی بدم سردی دربیانے کہ "ہیں ہم دوانی پھر دی" و عیاں شدن مدن گوپال چنیں کہ ہر
گوپی بجوشِ دلی درصدائے کہ "میں ہر پائی"۔ بعضے بوصولِ جھانکی[۵۴] مصروفِ الطافِ کنج بہاری۔ و اکثرے
بحصولِ درشن مشغولِ گفتن "بلہاری"[۵۵]۔ دلہا فرحت امتزاج، و برزبانہا "جی مہاراج"۔

چناں خوش حال گردیدم، کہ در دل		نشاط و عیش و عشرت کرد منزل	

[۵۱] راس دھاری وہ ناچنے والے لڑکے جو کرشن جی اور اُن کی گوپیوں کے کیس کی نقل کرتے ہیں۔
[۵۲] بھجن خدا کی تعریف کے گیت دیوتاؤں کی تعریف کے گیت۔
[۵۳] رادھا رادھکا کرشن جی کی ایک نہایت پیاری گوپی کا نام۔ فقرۂ بھجن۔ رادھا کرشن بول تیرا کیا لگے گا مول۔
[۵۴] جھانکی دید نظارہ دیدبازی لیلا نمایش روپ جو پردے کے اندر سے بھر کر باہر دکھاتے ہیں۔ سوانگ تماشا۔
[۵۵] بلہاری قربان تصدق صدقہ داری نثار۔
کنھیا جی کی اس کا تک میں ہوتی ہے۔ کنھیا جی کی راس یعنی ایک قسم کی لیلا جس میں ایک شخص کنھیا بنتا ہے۔ سُرخ لباس بر میں زریں مکٹ سر پر۔ ہاتھوں میں بانسری
ایک لونڈا رادھکا بنتا ہے۔ کچھ لونڈے سکھیاں اور گوپیاں بنتی ہیں۔ کنھیا جی نرت کرتے ہیں۔ پھر حلقہ بنا کے ہاتھ جوڑ کے ناچتے ہیں۔ اکثر کسی کو پکڑ لیتے ہیں پھر کسی کو
چھوڑ دیتے ہیں سکھیوں سے رمز و کنایے کرتے ہیں۔ مردنگ اور جھنجری بج رہی ہے۔ گھنگرو جھنک رہے ہیں۔
کشن کے مختلف نام ہیں۔ بلدیوجی۔ ہر۔ سیکشن۔ سیام۔ من ہرن۔ مُراری۔ موہن۔ نول کشور۔ بہاری۔ سیام برن۔ اوتاری۔ کنھیا
مُرلی دھر۔ من موہن۔ کنج بہاری۔ گوپال۔ منوہر۔ گھنشام۔ اٹل۔ بنواری۔ نند لال۔ نول گردھاری۔ شنکر۔ مُرلیا والے۔ مدن متوارے۔ نند دُلارے
کشن ہندوؤں کے عقیدے میں گویا خدا ہیں۔

برائے دیدنِ راس کمل نین	بیایم بعد ازیں بالرّاس والعین

شاید مشکل سے کوئی شاعر مسلمان ایسا نکلے گا جس کے کلام میں اس طرح ہندوؤں کے میلوں اور تقریبوں کی بلا تعصب آزادی اور نیک نیتی کے ساتھ تعریف ہو۔ اِس سے ظاہر ہی کہ نظیر کتنا بڑا غیر متعصب آدمی تھا۔ اور نہ صرف یہی بلکہ یہ بھی کہ اُس کو شاعری کا مفہوم کس قدر صحیح معلوم تھا۔ شاعر اگر مذہبی تعصبات کو دخل دے تو گویا وہ اپنے فن کے پہلے اصُول سے قطع نظر کرتا ہی۔ شاعر کا کام یہ نہیں ہی کہ فقط کسی خاص مذہب کے لوگوں کے مرغوبات و منفورات سے واقف ہو۔ اور فقط اُسی ایک مذہب کے لوگوں کو خیالی تفریح بخشے۔ بلکہ اُس کا موضوع عموماً نوع انسانی کی طبیعت ہی۔ عید کی تقریب کے بیان سے جو مسرت اور تفریح کہ کسی مسلمان کے دل میں پیدا ہوسکتی ہی وہ ہرگز کسی ہندو کے دل میں ہو نہیں سکتی۔ گو کتنے ہی عُمدہ الفاظ اور مُحاورات میں کیوں نہ ہو اِس لیے کہ اِس تقریب سے اُن کے کسی گزشتہ یا آئندہ مسرت کو بخطِ مستقیم تعلّق نہیں ہی۔ بخلاف اِس کے اُن کی کسی تقریب کا اگر بیان ہو تو وہی اثر بلکہ شاید بعض موقع پر اُس سے زائد اثر پیدا کرسکتا ہی۔ کنھیا جی کی راس۔ مہادیو جی کا بیاہ۔ بلدیو جی کا میلہ۔ وغیرہ اِن کا صرف نام ہی ہندوؤں کے لیے ایک طلسمِ مسرت ہی، اِس لیے کہ اُن کی ہزاروں اُمنگیں اور حوصلے اِن تقریبوں سے متعلق رہی ہیں اور رہیں اور نہیں معلوم کتنے زمانے تک متعلق رہیں گی۔ پس جس صورت میں کوئی شاعر ہندوؤں کو خوش کرنا چاہے تو تھوڑی دیر کے لیے ہندو بن بیٹھے۔ وہی روزمرے بھی استعمال کرے۔ کہ خصوصیات زبان سے بھی ایک کیفیت غیر محسوس طور پر قلب میں پیدا ہوتی ہی۔ راس۔ مکٹ۔ نرت۔ مکھ بلاس۔ برن۔ چندرما روپ۔ سروپ۔ اِن میں سے ہر لفظ کسی نہ کسی رگِ نشاط کو حرکت میں لاتا ہی، اور آہستہ آہستہ ایک اچھا زمزمہ خوشی اور خوش کیفی کا دل میں پیدا کر دیتا ہی۔

اسی بنیاد پر نظیر مواقعِ عشرتِ انسانی کے بیان میں کسی خاص مذہب کی قید نہیں رکھتا۔ اور بلا تعصب بیان کرتا ہے۔ کہ ہر مذہب کا آدمی اُس سے متلذذ ہو سکے۔

کچھ ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ نظیر کے دل میں وحدۃ الوجود کا مسئلہ بڑے زور سے جما ہوا تھا اور وہ ہر شی کو مظہرِ صفاتِ الٰہی و ذاتِ باری جانتا تھا۔ اور ہر ذرے میں اُسی کا جلوہ ظہور مانتا تھا۔ پس مہادیو، کرشن وغیرہ اُس کے نزدیک کیوں کر قابلِ نفرت ہو سکتے ہیں جن کی ذات بروایت ہنود مظہر کرامات بھی تھی۔ نظیر اصل میں کبیر، گرونانک وغیرہ کے عقیدے کا آدمی تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو افراط و تفریط کے عالم میں جانتا تھا۔ اور صلحِ کُل کا جویا تھا۔ صلحِ کل بھی پھر اس طریقے سے کہ سب ایک ہی صانع کے بنائے ہوئے ہیں۔ آدمی آدمی سب برابر۔ عداوت کی وجہ کیا۔ مذہب میں جو فرق ہے وہ الفاظ کا فرق ہے معانی سب کے ایک ہیں۔ ہنود جس کو اوتار کہتے ہیں مسلمان اُسی کو پیمبر کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے نظیر کو ہندوؤں کی بھی بہت صحبت رہی تھی اور اُن کے علما کے خیالاتِ تصوف سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ اس لیے کہ تا وقتے کہ مدتوں آدمی ہندوؤں میں نہ بیٹھا ہو، اُن کے محاورات اس بے تکلفی کے ساتھ باندھ نہیں سکتا۔ اور اتنے دل نشیں حالات قلم بند نہیں کر سکتا۔

دریا کی سیر میں تو ہم نے میاں نظیر کو کلیات میں بھی مصروف دیکھا ہے۔ تیراکی کا میلا یاد ہوگا۔ قدمتین میں بھی ایک جگہ وہ دریا کے شوق کی لہریں دکھاتے ہیں۔ وہ روز عام نہان کا تھا۔ میلا قابلِ دید تھا۔ پیدل جانا منظور نہیں۔ سواری موجود نہیں۔ ناچار ایک دوست سے بذریعۂ خط کے رتھ منگوا بھیجی۔ اُن دنوں بگھی اور فٹن کا رواج نہ تھا۔ بڑے بڑے اُمرا رتھوں پر سوار ہوتے تھے۔ اور رتھوں میں بڑی تیاری کی جاتی تھی۔ چاندی سونے کے کلس۔ مخمل کی چھتری۔ ہزار ہزار روپے جوڑی کے گجراتی بیل۔ رقعہ

سیر دریا

طلب یوں شروع ہوتا ہے:—

مُحیطِ بخشش و بذل استقامت
ملاذ و منبعِ احساں سلامت

چو شوقِ صحبتِ رنگیں نگارم
ہمانا موج دریا در شمارم

مگر بعد از سلامِ الفت آرا
بنوکِ خامہ آرم مدعا را

کہ امروز از برائے غسلِ دریا
جہانے حاضر، و خلقے است یکجا

چنیں مجمع نباشد جائے دیگر
بجوش آمد مگر دریائے دیگر

نظر نامے رسد یکسر بہارست
چمن بر ساحلِ دریا نثارست

ز غسلِ مرداں و بازیِ آب
بہر سو شوخیِ گرداب بیتاب

ز عکسِ گلعذاراں آبِ دریا
برنگِ نہرِ گلشن در نظرہا

بساحل بسکہ مہ رویاں عیانند
شکارِ دامِ الفت ماہیانند

بفرحت قطرہ زن ہر موجِ آب ست
مِیِ مقصود در جامِ حباب است

بہارِ حسن و آبِ بحر در جوش
بہم پہلو بہ پہلو، دوش بر دوش

چو بر دریا چنیں رنگیں بہارست
دلم از بہرِ آں پر بے قرارست

دریں صورت، نظر بر بے قراری،
عطا سازند تھر بہرِ سواری

چو زاں مجمع ہمہ شادند امروز
کنم من ہم دلِ خود عشرت اندوز

کہ باشد دیدنِ عالم غنیمت
اگر یک لحظہ باشد دم غنیمت

نظیر اکنوں ندارد غیر ازیں یاد
کہ باشد خانۂ الطاف آباد

بزمِ عشرت میں شرکت:-

کسی عشرت کی بزم میں ایک شوخ دل فریب کے ناچ سے میں لطف اٹھا رہا تھا۔ اس کے کانوں کے جھمکے اس طرح سے جھوم رہے تھے کہ ہزاروں بے قراریاں دل میں پیدا ہوتی تھیں۔ اور بازو کے بانک[۱] اپنی قربت کے سبب دونوں ہاتھوں سے تسلیم نیاز چاہتے تھے۔ میں نے دونوں کی تعریف یوں موزوں کی ؎ جنبش جھمکۂ تو مے سازد ٭ خاطرِ آرمیدہ را بیتاب ٭ ؎ بانک بر بازوے تو، اے سیمتن، از حسن خم ٭ می نماید ایں کہ من ہم بانکپا نِ ظرفہ ام ٭ سن کر وہ عورت بہت ہی خوش ہوئی۔

	ہر دسہرے میں بھی یوں گو فرحت و زینت نظیر پر دوالی[۲] بھی عجب پاکیزہ تر تیوہار ہے	

در شبِ دوالی کہ بلطفِ آں در و دیوار مجلی و نگاریں می شود، و ہر بام و بر آمدہ زیبا و رنگیں۔ نازنیناں بلباس درخشاں، و الفت گزنیاں بکامِ دلِ شاداں۔ در بازار بازارِ زینت، و ہر دکاں دکانِ رونق۔ دکاندارانِ مسرور۔ و نظارگیان پر سرور۔ چراغاں صفِ ترصیع بستہ، و لمعاتِ آں بسوّیت پیوستہ (ابیات) ز شیرینی دکانہا زینت ارقام ٭ عیاں سیم دگر با پستہ بادام ٭ فراواں خوش دلی در ہر قیاسے ٭ نمایاں جا بجا کھیلین بتاسے ٭ کسے خرما[۳] طلب از لطف یابی ٭ کسے مسرور بر فی و گلابی ٭ کسے دیداز

[۱] بانک ایک قسم کا زیور جو ہندنیاں پاؤں میں اور مسلمانیاں بازو پہ پہنتی ہیں۔ بانک فن سپہ گری میں سے ایک ورزش کا نام ہے جسے بکیتی کہتے ہیں اور اسے کٹار نما ٹیڑھی چھریوں سے بیٹھ کر یا لیٹ کر کھیلتے ہیں۔

[۲] دوالی ہندوؤں کا ایک مشہور تیوہار جس میں لچھمی کی پوجا ہوتی اور بہت سی روشنی کی جاتی ہے۔ یہ تیوہار کاتک کی پندرہ تاریخ کو ہوتا ہے۔ اس میں ہندو کثرت سے جوا کھیلتے ہیں اور چور چوری کو نکلتے ہیں۔ ان کے اعتقاد میں آج کی جیت سے برس روز تک جیت رہتی ہے۔

[۳] خرما چھوہارا کھجور یا لوشاہی ایک قسم کی مٹھائی۔

تلنگنی[۵۱] دل فریبی؛ کسے خوش حال از لطفِ حلبی؛ کسے مشغول مکدو سیو مٹھری؛ کسے گجرے بکف، بر دوش ہٹھری؛ کسے را اسپ خواہش ورتنگ و تاز؛ کہ گیرد اسپِ خوش رنگ و پُراز ساز؛ کسے را دل دریں اُمیّد داری؛ کہ گیرد فیل با زرّیں عماری؛ کسے تکرار درگھڑ بہل خوشتر؛ کسے را بحثِ طوطی بہر دیگر؛ کسے بہر خیالِ طبعِ عالی؛ گرفت از شوق فانوس خیالی؛ بریں اشیاے بازی طُرفہ وبہ؛ خریداراں فراہم از کہ و مہ؛ از مہ طلعتے ملاقات گردید و ہم سخنی دست داد۔ گفت "حسن ایں چراغان چہ قدر" گفتم "چناں کہ شمع دیان بمشاہدۂ آں، یا چراغ افروزہ مراد از دیدن ایشاں" متبسّم گردید۔

سلونو

ہندوؤں کا ایک تیوہار ہی سلونو۔ اس تیوہار میں برہمن ہاتھوں میں راکھی باندھتے پھرتے ہیں۔ اور زردھان کی کوپلیں بانٹتے ہیں۔ نظیر تو ہندو مسلمان سب کے ہوا خواہ ہیں۔ اُن کو اس تیوہار سے بھی لطف اُٹھانا۔

چلی آتی ہی اب تو ہر کہیں بازار کی راکھی[۵۲]	سنہری، سبز ریشم، زرد، اور گلنار کی راکھی
بنی ہی گو کہ نادر، خوب ہر سردار کی راکھی	سلونو میں عجب رنگیں ہی اُس دلدار کی راکھی

نہ پہنچے ایک گُل لو یار جس گُلزار کی راکھی

عیاں ہی اب تو راکھی بھی، چمن بھی، گُل بھی، شبنم بھی	جھمک جاتا ہی موتی، اور جھلک جاتا ہی ریشم بھی
تماشا ہی اہا ہا ہا! غنیمت ہی یہ عالم بھی	اٹھانا ہاتھ پیارے، واہ وا! ٹک دیکھ لیں ہم بھی

۵۱ تلنگنی ایک قسم کی شیرینی جو نہایت پتلی شیشے کی شکل کی بنائی جاتی ہی۔ اس میں خربزے کے بیج کالی مرچیں کھانڈ ڈال کر قوام پکاتے اور اُس کے کوزے بنا لیتے ہیں۔ ابتدا میں بیجوں کے بجائے تل ڈالا کرتے تھے اور اسی وجہ سے اس کا نام تل انگنی رکھا تھا۔

۵۲ راکھی ہاتھ کی رکھشا یعنے محافظت کرنے والا۔ وہ رنگین تاگا یا ایک خاص وضع کا چمک دار کنگن جو ہندو لوگ سلونو کے تہوار پر ہاتھوں میں برہمنوں سے بندھواتے یا بہن اپنے بھائی کی کلائی میں باندھ دیتی ہی تاکہ وہ بلیات سے محفوظ و مصئون رہے۔

تمھارے موتیوں کی، اور زری[۵۱] کے تار کی راکھی

مچی ہے ہر طرف کیا کیا سلونو کی بہار اب تو
ہر اک گلرو پھرے ہے، راکھی باندھے ہاتھ میں خوش ہو
ہوس جو دل میں گزرے ہے، کہوں کیا، آہ! میں تمکو
یہی آتا ہے جی میں، بن کے باہمن[۵۲] آج تو یارو
میں اپنے ہاتھ سے پیارے کے باندھوں پیار کی راکھی

ہوئی ہے زیب و زینت اور خوباں کو تو راکھی سے
و لیکن تم سے، اے جاں! اور کچھ راکھی کے گل پھولے
دوانی بلبلیں ہوں دیکھ، گل چننے لگیں تنکے
تمھارے ہاتھ نے، مہندی نے، انگشتوں نے، ناخن نے
گلستاں کی، چمن کی باغ کی، گلزار کی راکھی

ادا سے ہاتھ اٹھتے میں گلِ راکھی جو ہلتے ہیں
کلیجے دیکھنے والوں کے کیا کیا، آہ! چھلتے ہیں
کہاں نازک یہ پہنچے، اور کہاں یہ رنگ ملتے ہیں
چمن میں شاخ پر کب اس طرح کے پھول کھلتے ہیں
جو کچھ خوبی میں ہے اُس شوخِ گل رخسار کی راکھی

پھریں ہیں راکھیاں باندھے جو ہر دم حسن کے تارے
تو اُن کی راکھیوں کو دیکھ، اے جاں! چاؤ کے مارے
پہن زُنّار اور قشقہ لگا ماتھے اوپر بارے
نظیرؔ آیا ہے باہمن بنکے راکھی باندھنے پیارے
بندھا لو اُس سے تم ہنس کر اب اِس تیوہار کی راکھی

بزمِ عیش میں فرماتے ہیں:- سلونو عجب لطف رکھتا ہے کہ نمک سے شکر نکالتا ہے۔ ے نمایاں عالمے بازینت و شاں ؛ ز راکھی زیبِ ہر ساعد فراواں ؛ ازاں راکھی کہ در دستِ بتاں ہست ؛ بہارِ طرفہ

۵۱ زری سنہری تار سونے کے تار چاندی کے تار جن پر سونے کا ملمع ہو۔

۵۲ بامن یا باہمن ہندوؤں کی نہایت افضل ذات برہما کے ویدوں کا عالم۔ صحیح برہمن ہے۔

بہرِ عاشقاں ست :: ایک دفعہ سلونوہی کے دن ایک برہمن کے ساتھ، جس کی ہمرازی کا ٹیکا دل کی پیشانی پر اور دمسازی کا زُنار خاطر کے کندھے پر رکھتا تھا، ایک صنم کے گھر گیا۔ جب راکھی کی بہار اُس کے ہاتھ میں دیکھی تو یہ شعر پڑھا۔ راکھی اگرچہ باہمگی سازی کند لیکن بجُز دست بتاں نازی کند ہنسا اور کہا، مصرع تو راکھی باندھنے کے لیے آئے، تم کس لیے آئے؟ میں نے کہا "دل باندھنے کے لیے"۔ بہت ہنسا۔

بسنت[1] کا زمانہ بھی عجب جوش انگیز زمانہ ہوتا ہے۔ آفتاب دکھن کے سفر سے پھر مہربانی کے سامان کے ساتھ پلٹتا ہے۔ نباتات وحیوانات میں تازہ زندگی آتی ہے۔ شاخوں پر سبز، حریری کونپلیں نمودار ہوتی ہیں۔ ٹہنیوں پر چڑیوں کے طلسم انگیز نغمے سنائی دیتے ہیں۔ دلوں میں اُمنگ زور کرتی ہے اور خوشی اور عیش کے فوارے کو خوش نما طور پر اُچھالتی ہے۔ نیچر کا بہار راگ غم اور کلفت کے اُداس بن میں اِس سرے سے اُس سرے تک آگ لگاتا ہے۔ فطرتی شاعر خیال کی شاخ پر بیٹھ کر کویل سے زیادہ مست ہوتا ہے اور پپیہے سے زیادہ دل آویز اور طلسم انگیز تانیں سُناتا ہے۔

بسنت کا زمانہ آگیا ہے۔ گلابی جاڑا پڑتا ہے۔ اعتدال کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی ہیں طبیعتیں جو سردی کے اثر سے ڈوبی ہوئی تھیں، آہستہ آہستہ اُبھرنے لگی ہیں۔ قُدرتی جوش ترنم کا ہر سر میں ہورہا ہے۔ وہ دیکھیے میاں نظیر بیٹھے گنگنا رہے ہیں۔ کچھ آزادوں کا سا لہجہ معلوم ہوتا ہے، مگر راہ اچھی ہے:۔

جب پھول کا سرسوں کے ہوا آکے کھلنتا		اور عیش کی نظروں سے نگاہوں کا لڑنتا	

[1] بسنت ہندی چھ رُتوں میں سے ایک رُت کا نام ہے جو چیت سے بیساکھ تک رہتی ہے۔ موسم بہار۔ وسط مارچ سے آخر مئی تک کا موسم۔ وہ میلہ جو موسم بہار میں بزرگوں کے مزار اور دیبی دیوتاؤں کے استھانوں پر سرسوں کے پھول چڑھا کر کرتے ہیں۔

ہم نے بھی دل اپنے کے تئیں کر کے نچنتا | اور ہنس کے کہا یار سے اے لکڑ بھونتا[۵۱]

سب کی تو بسنتیں ہیں پہ یاروں کا بسنتا

اک پھول کا گیندوں کے منگا یار سے بجرا[۵۲] | دس من کا لیا یار گندھا ہاتھ کا گجرا
جب آنکھ سے سورج کی ڈھلا رات کا کجرا[۵۳] | جا یار سے ہنس کر یہ کہا "ای مرے رجرا[۵۴]"

"سب الخ"

تھے اپنے گلے میں تو کئی من کے پڑے ہار | اور یار کے گجرے بھی تھے اک دھوں[۵۵] کی مقدار
آنکھوں میں نشے مے کے اُبلتے تھے دھوا دھار | جو سامنے آتا تھا یہی کہتے تھے للکار:

"سب الخ"

پگڑی میں ہماری تھے جو گیندوں کے کئی پیڑ | ہر جھونک میں لگتی تھی بسنتوں کے تئیں ایڑ
ساقی نے بھی مٹکے سے دیا منہ کے تئیں بھیڑ | ہر بات میں ہوتی تھی اسی بات کی آ چھیڑ

"سب الخ"

پھر راگ بسنتی[۵۶] کا ہوا آن کے کھٹکا | دھونسے[۵۷] کے برابر وہ لگا باجنے[۵۸] مٹکا

۵۱ اس لفظ کی کوئی تحقیق نہ ہو سکی۔ دونوں نسخوں میں لکڑ بھونتا لکھا ہے۔ آزادوں کے لہجے میں لڑکے کو لکڑا اور لکڑے کو تخفیف لکڑ کر لیا ہو تو عجب نہیں اور بھونتا دل کو بھانے والا۔ اے لکڑ بھونتا یعنی اے خوش ادا لڑکے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اکڑ بھونتا ہو اور انقلاب تصحیف سے موجودہ قالب میں در آیا ہو۔ اکڑ بھونتا اکڑ بھوں یا اکڑ فوں کا آزادانہ لہجہ۔
۵۲ بجرا ایک بڑی قسم کی گول اور خوش نما کشتی جس میں امیر لوگ بیٹھ کر سیر کرتے ہیں۔
۵۳ کجرا کاجل کا آزادانہ لہجہ۔
۵۴ رجرا راجہ کی تصغیر آزادوں کی گرامر کے مطابق۔
۵۵ دھوں ایک بیس سیر کا وزن۔ آدھا من صحیح ادھون ہے۔ دھیلے کی طرح الف یہاں بھی تخفیف میں آیا۔
۵۶ بسنت سری راگ کی چوتھی راگنی۔
۵۷ دھونسا دمامہ بڑا نقارہ۔
۵۸ باجنے بجنے کا لہجہ آزادانہ۔

دل کھیت میں سرسوں کے ہر اِک پھول سے اٹکا | ہر بات میں ہوتا تھا اسی بات کا لٹکا

"سب الخ"

جب کھیت پہ سرسوں کے دیا جا کے قدم گاڑ | سب کھیت اٹھا سر کے اوپر رکھ لیا جھجھاڑ
محبوب رنگیلوں کی بھی اک ساتھ لگی جھاڑ[1] | ہر جھاڑ سے سرسوں کے بھی کہتی تھی یہی جھاڑ

"سب الخ"

خوش بیٹھے ہیں سب شاہ و وزیر آج، اہا ہا! | دل شاد ہیں ادنیٰ و فقیر آج، اہا ہا!
بُلبُل کی نکلتی ہے صفیر آج، اہا ہا! | کہتا ہی پھرتا ہے نظیر آج، اہا ہا!

"سب کی تو بسنتیں ہیں پہ یاروں کا بسنتا"

اب جوش میں کسی قدر اعتدال آیا تو پھر یوں گاتے ہیں:-

نکلے ہو کس بہار سے تم زرد پوش ہو | جس کی نوید پہنچی ہے رنگِ بسنت کو
دی بر میں اب لباسِ بسنتی کو جیسے جا | ایسے ہی تم ہمارے بھی سینے سے آ لگو
گر ہم نشے میں بوسہ کہیں، دو۔ تو لطف سے | تم پاس منھ کو لا کے، یہ ہنس کر کہو کہ "لو"
بیٹھو چمن میں نرگس و صد برگ کی طرف | نظّارہ کر کے عیش و مسرت کی داد دو
سُن کر بسنت مطرب زرّیں لباس سے | بھر بھر کے جام پھر مئے گل رنگ کے پیو
کچھ قمریوں کے نغمے کو دو سامعے میں راہ | کچھ بلبلوں کا زمزمۂ دل کشا سنو

مطلب ہے یہ نظیر کا یوں دیکھ کر بسنت

[1] جھاڑ تار سلسلہ قطار تسلسل۔

ہو تم بھی شاد، دل کو ہمارے بھی خوش کرو

ایک یار سے تو یوں مزے مزے کی باتیں ہوئیں - اب دوسرے صنم تشریف لاتے ہیں:-

مل کر صنم سے اپنے ہنگام دل کشائی ۔۔۔ ہنس کر کہا یہ ہم نے "ای جاں بسنت آئی"

سنتے ہی اس پری نے گل گل شگفتہ ہو کر ۔۔۔ پوشاک زرفشانی اپنی وہیں رنگائی

جب رنگی آئی اس کی پوشاک پر نزاکت ۔۔۔ سرسوں کی شاخِ پرگل پھر جلد اک منگائی

اک پنکھڑی اٹھا کر نازک سی انگلیوں میں ۔۔۔ رنگت کو اس کی اپنی پوشاک سے ملائی[1]

جس دم کیا مقابل کسوت سے اپنی اس کو ۔۔۔ دیکھا تو اس کی رنگت اس پر ہوئی سوائی

پھر تو بصد مسرت، اور سو نزاکتوں سے ۔۔۔ نازک بدن پر اپنے پوشاک وہ کھپائی

چمپے کا عطر مل کر موقع سے پھر خوشی ہو ۔۔۔ سیمیں کلائیوں میں ڈالے کڑے طلائی

بن ٹھن کے اس طرح سے پھر راہ لی چمن کی ۔۔۔ دیکھی بہارِ گلشن پھر طرب فزائی

جس جس روش کے اوپر جا کر ہوا نمایاں ۔۔۔ کس کس روش سے اپنی آن و ادا دکھائی

کیا کیا بیاں ہو جیسے چمکی چمن چمن میں ۔۔۔ وہ زرد پوشی اس کی، وہ طرزِ دل ربائی

صد برگ نے صفت کی، نرگس نے بے تامل ۔۔۔ لکھنے کو وصف اس کا، اپنی قلم اٹھائی

پھر صحن میں چمن کے آیا حسن و خوبی ۔۔۔ اور طرفہ تر بسنتی اک انجمن بنائی

[1] تانیث فعل باوجود اظہارِ علامتِ مفعول اور اساتذہ کے کلام میں بھی ہے۔ میرزا رفیع السودا فرماتے ہیں:- ڈالی بازار جو سودا نے متاع دل کو ÷ لٹ گئی دیکھتے ہی جنس خریدار کی طرح ÷۔

مولوی عبدالقادر سورۂ بروج کے ایک فائدے میں لکھتے ہیں:- پھر شہر میں ہر محلے کے آگے کھائی کھدوائی۔ اُسے آگ سے بھری۔

یہ محاورہ اب بھی زبانوں پر ہے۔

اُس انجمن میں بیٹھا جب ناز و تمکنت سے
گلدستہ اُس کے آگے ہنس ہنس بسنت لائی
کی مُطربوں نے خوش خوش آغازِ نغمہ سازی
ساقی نے جامِ زریں بھر بھر کے مے پلائی

دیکھ اُس کو اور وہ محفل اُس کی نظیرؔ ہر دم
کیا کیا بسنت آکر اُس وقت جگمگائی

دوسرا راگ سُنیے - ایک یار کی ڈیوڑھی پر جاکر گا رہے ہیں :-

جوشِ نشاط و عیش ہے ہر جا بسنت کا
ہے طرفہ روزگار طرب زا بسنت کا
باغوں میں لطفِ نشو و نما کی ہیں کثرتیں
بزموں میں نغمہ خوش دلی افزا بسنت کا
پھرتے ہیں کر لباس بسنتی وہ دل بَراں
ہے جن سے زرنگار سراپا بسنت کا
جا در پہ یار کے یہ کہا ہم نے صبح دم:
"اے جاں، ہے اب تو ہر کہیں چرچا بسنت کا
تشریف تم نہ لائے جو ہو کر بسنتی پوش
کیسے گُناہ ہم نے کیا کیا بسنت کا"
سُنتے ہی اس بہار سے نکلا کہ جس کے تئیں
دل دیکھتے ہی ہو گیا شیدا بسنت کا

اپنا وہ خوش لباس بسنتی دکھا نظیرؔ
چمکا یا حُسنِ یار نے کیا کیا بسنت کا

یہ تو ہندی راگنیاں ہوئیں - اب بعض عجمی مقام سُنیے :-

زہے بسنت کہ آغازِ سرمایۂ بہارست و شروعِ پیرایۂ برگ و بار - بُلبل بہوائے بوسہ پائے گُل سراز زیرِ بال برکشید و قُمری بتمنّائے نظّارۂ بالائے سرو از کُنجِ آشیاں پرید - شاخِ گلبن از غُنچہ و گُل زیبِ خمیدن یافت و شمشاد و صنوبر باہتزازِ صبا زینتِ چمیدن - نسیمِ سحری شگفتگی افزود - و بادِ بہاری چہرۂ خُرّمی نمود

نہالِ شوق بوفورِ بالیدن۔ وشاخِ تمنّا مسرورِ نودمیدن۔ حسن آرایش، وعشق بافزایش۔ نغمہ سازان بسرائیدنِ بسنت طرب فزا وترنم پردازان ترانۂ عندلیباں ہم صدا۔ ہر جا بزمِ نشاط، وہر مکان محفلِ انبساط

	دلہا بہزار شادمانی		از جوشِ بہار زر فشانی	
	سامانِ ہزار دل کشائی		وزکثرتِ خلعتِ طلائی	

وقتے بروزِ بسنت بہرِ نظارۂ نازنینانِ نوبہار ودل فریبانِ بسنتی شعار برآمدم۔ چوں واردِ کوچہ گردیدم۔ چندیں نازنینِ بسنتی لباس را بہ سازِ طرب دیدم مسرور شدم وگفتم ؎ چہ جاے خیر چنین ست ایں لباسِ بسنت ✣ کہ دل بجلوہ رُبا ید زدستِ سادہ[۱] بسنت ✣ تبسّم کردند وبجاے تر صّدِ زر متوجہ شدند۔

۱؎ سادہ بے وقوف ہو وہو بھوند وبھولا بھالا سیدھا سادہ میر۔ ہر صبح جو خورشید ترے منہ پہ چڑھے ہی ✣ ایسا نہ ہو یہ سادہ کہیں جی سے اُتر جاے ✣ ایضاً کوئی سادہ ہی اُس کو سادہ کہے۔ لگے ہی ہمیں وہ تو عیار سا۔ سادہ بسنت اُلّو بسنت۔

نظیر دہلی سے آگرے جاتا ہے

ابھی تک نظیر دہلی میں تھا۔ مگر اب سین بدلتا ہے۔ دہلی جہاں وہ پیدا ہوا جہاں اُس نے پرورش پائی جہاں
وہ جوان ہوا اُس کو ایک تازہ اور بڑی آفت کا سامنا ہے۔ نادر[1] کو اپنی خون ریزیوں کا سکّہ بٹھا کر گئے ہوئے
زیادہ زمانہ نہیں ہوا۔ ظالم کی عمر کوتاہ گو وہ اس جہان سے جا چکا ہے مگر احمد شاہ دُرانی اُس کا جانشین موجود ہے
اُس کے دو حملے متواتر ہو چکے ہیں۔ گو پہلے حملے میں سرہند[2] کے میدان میں محمد شاہ کی خوش قسمتی سے احمد شاہ
اُس کے بیٹے کے ہاتھ سے شکست کھا کر اُس کو لوٹ جانا پڑا تھا مگر محمد شاہ کی آنکھ بند ہوئے[3] پیچھے اب تو وہ
لاہور اور ملتان دونوں کو دبائے بیٹھا[4] ہے۔ بادشاہ[5] سلامت ایک نامرد مگر منہ چڑھے خواجہ سرا کے مارے جانے
سے اپنے وزیر اعظم صفدر جنگ (صوبہ دار اودھ) سے بیزار ہیں اور انتقام کی تدبیریں سوچ رہے ہیں۔
غازی الدین اگرچہ صفدر جنگ ہی کا بڑھایا ہوا ہے اور سپہ سالاری کے رتبے کو اُسی کا پہنچایا ہے۔ مگر اس
نامردانہ کام میں پادشاہ کا دست و بازو بنتا ہے۔ اس اختلاف کے سرچشمے سے شہر میں خون کی ندیاں بہتی
ہیں۔ ہولکر آن کر ان ندیوں پہ پُل باندھتا ہے۔ صفدر جنگ مصلحت وقت سمجھ کر کنارے ہو جاتا ہے گو بادشاہ

---

[1] نادر کا حملہ ۱۷۳۹ء میں ہوا تھا۔

[2] احمد شاہ نے دُرّانی کو مارچ ۱۷۴۸ء میں میدان سرہند میں شکست دی تھی۔

[3] محمد شاہ اپریل ۱۷۴۸ء میں مرا۔

[4] دُرّانی کا دوسرا حملہ ۱۷۵۱ء میں ہوا تھا۔

[5] احمد شاہ

پہلے سے آنکھیں کھوئے بیٹھا تھا مگر جب غازی الدین کی بے اعتدالیوں سے اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے اور چشم نمائی کے لیے شہر سے باہر جاتا ہے تو بجز حضراس کے کہ کامیابی اُس کو آنکھیں نکالنے کا موقع دے شکست خود اُس کی آنکھیں نکلواتی ہے[51]- اور اہل نظر سے آیۂ فاعتبروا یا اولی الابصار پڑھواتی ہے- عالم گیر ایک ناتجربہ کار شخص اس کا جانشین ہوتا ہے- غازی الدین اس سے وہ کام لیتا ہے جو کٹھ پتلی والے کٹھ پتلیوں سے لیتے ہیں- اپنے حریف صفدر جنگ کے مرنے کے بعد آپ وزیر اعظم بنتا ہے- مگر اس بڑے عہدے کی عزت سنبھال نہیں سکتا- ظالمانہ کارروائیاں اُس کی اہل لشکر کو بیزار کرتی ہیں- اور انھیں کے ہاتھ سے اُس کو سروپا برہنہ سڑکوں پر گھسٹواتی ہیں- اپنی سنگ جانی سے بچ نکلتا ہے اور سنگ دلی سے تمام باغیوں کو خون میں نہلاتا ہے- پھر دماغ جو چلتا ہے تو درّانی کے مقابلے کے حوصلے ہوتے ہیں- پنجاب تشریف لے جاتے ہیں اور درّانی کے جانشین کو غرفش دکھاتے ہیں- درّانی ایسے کتوں کو کب خاطر میں لاتا ہے- بجلی کی طرح اٹک پار اُترتا ہے- اور جنگی سونٹے سے ان کی خبر لیتا ہے- یہ دُم دبا کر انقیاد و اطاعت کے خیموں میں گھستے پھرتے ہیں[52]-

اہل دہلی جن کی نگاہوں کے سامنے نادر کی تصویر لباس خونی میں پھر رہی ہے اُن کے دلوں کا اس وقت کیا حال ہوگا- اُس قیامت صغرٰے کو ابھی پورے اٹھارہ برس نہیں ہوئے- لوگوں کے دلوں سے ابھی عزیزوں کے داغ نہیں بھولے- سیکڑوں مکان ابھی تک بے مکیں پڑے ہوئے ہیں- آباد نہیں ہوئے- ہزاروں عورتیں ہنوز اپنے لُٹے ہوئے زیوروں کو رو رہی ہیں پورے بن نہیں چکے- نظیر کو گو نادر کے حملے کے

---

[51] احمد شاہ ۱۷۵۴ء میں تخت سے اُتارا گیا اور اسی سال اُس کی آنکھیں نکلوا دی گئیں- غازی الدین نے نکلوائیں-

[52] یہ ۱۷۵۶ء کا واقعہ ہے- درّانی کا تیسرا حملہ یہی ہے جس میں وہ دہلی آیا اور نادر شاہ کے واقعۂ خوں ریزی کو تازہ کر دیا-

وقت ہوش نہ تھا مگر ہوش سنبھلتے ہی وہ اُس کی ہوش اُڑانے والی داستانیں سننے لگا۔ چشم دید بیان کرنے والوں
کی گزشتہ خوف کے تصور سے پھٹی ہوئی آنکھیں اور اوپر کو کھنچی ہوئی بھنویں اُس کے آغاز عمر کے توہم آمیز
دل پر نقش کالحجر ہو گئی ہیں۔ عجب نہیں اگر وہ گہوارے میں بھی نادر کے تذکروں سے ڈرایا گیا ہو۔ نادر کو وہ
آدمی سے کچھ زیادہ اور دیو سے کچھ کم سمجھتا ہی اور کیوں کر نہ سمجھے کہ گھر کی عورتیں اُس کا نام سُنتے ہی کانپ
اُٹھتی ہیں۔ اُن کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور قریب قریب اُن پر وہ عالم طاری ہوتا ہی جو
تسلیط کے وقت آسیب زدوں پر ہوتا ہی۔

دُرّانی کے دہلی آنے کی خبریں شہر میں گرم ہیں۔ بقول عقلائے فرنگ۔

بُری خبروں کے لگ جاتے ہیں پر سے

یہ خبریں بُرائی کے اُنھی ضرب المثل پروں سے اُڑتی پڑتی نظیر کے گھر میں بھی پہنچی ہیں گھر کی عورتوں کے
دل تو وہ تھے کہ اگر لوگ جھوٹوں بھی کہتے تو وہ سچ جانتیں چہ جائے کہ یہاں تو بدقسمتی سے خبر بھی سچ تھی۔ سُنتے
کے ساتھ سب کے ہوش جاتے رہے۔ عورتوں کا بڑا بنک ہی زیور۔ اس پر پنڈول کا پہرہ بٹھایا گیا۔ شاید یہ
پھر انادر کے حملے کے وقت بھی مُفید ہوا ہو۔ اور نظیر سے بُلا کر کہا گیا کہ بابا یہ شہر اب رہنے کے قابل نہیں۔ تم
کو کیا خبر۔ تم اس مصیبت کو کیا جانو۔ ہم لوگ اپنی آنکھوں سے اُس ولایتی گدڑیے کے کرتوت دیکھ چکے ہیں۔
سوا پہر شہر میں لہو کی ندیاں بہتی رہیں۔ لوگوں کے سر کٹوروں کی طرح تیرتے پھرتے تھے۔ لوٹ مچی تو ایسی کہ دو
مہینے تک ولایتیوں نے دم نہ لیا۔ گھر گھر گھستے پھرتے تھے اور جان مال آبرو سب پر ہاتھ مارتے تھے۔ دُرّانی
بھی آخر اُسی کا چیلا ہی۔ یہ بھی زہری کا بجھا ہوا ہوگا۔ اُس دفعہ نہیں معلوم کیوں کر ہم لوگوں کا گھر بچ گیا۔
شاید غریبی آڑے آئی ہو۔ مگر اب کے بچنے کی کوئی شکل نہیں۔ جس طرح بنے یہاں سے جلد نکل چلو۔ شہر میں

بھاگڑ مچ چکی تھی۔ اس پر عورتوں کی اشک آلودہ تقریر۔ نظیر بے چین ہو گیا۔ فوراً جس طرح بن پڑا ایک بہلی جو سواری میسر ہوئی۔ دروازے پر لا کر کھڑی کی۔ گھر میں دو ہی عورتیں تھیں۔ ماں اور نانی۔ تیسرا آپ۔ نانی کے حواس کچھ تو بڑھاپے نے کھوئے تھے کچھ اس آفت کے تصور کی نذر ہوئے۔ وہ کیا کرتیں۔ البتہ ماں کسی قدر حواس میں تھیں۔ نظیر اور انھوں نے دونوں نے مل کر سارا اسباب سمیٹا۔ اور سواریوں پر ٹھکانے سے رکھا۔ گھر تھا تو خالی یہی تین تو ہوں گے نہیں۔ آخر لونڈیاں باندیاں نوکر چاکر بھی ہوں گے۔ چلنے لگے تو اچھا خاصا دس بارہ آدمیوں کا قافلہ تھا۔ یہ قافلہ آگرے کو روانہ ہوا۔ اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوئی کہ آگرے ہی کو کیوں اختیار کیا گیا۔ شاید کوئی قرابت مند پہلے سے وہاں ہوں۔ یا یہ خیال ہو کہ دہلی کے بعد اس سے بہتر ان دنوں کوئی شہر محفوظ و معمور نہ تھا۔ بہر حال کوئی سبب ہو۔ یہ لوگ بجناح استعجال آگرے پہنچے اور وہاں مٹھائی کے پل پر قیام کیا۔

بھاگ رہے چکی تھی۔ اُس پر عورتوں کی اشک آلود تقریر۔ نظیر بے چین ہو گیا۔ فوراً جس طرح بن پڑا رتھ بہلی ولی جو سواری میسر ہوئی۔ دروازے پر لاکر کھڑی کی۔ گھر میں دو ہی عورتیں تھیں۔ ما اور نانی۔ تیسرا آپ۔ نانی کے حواس کچھ تو بڑھاپے نے کھوئے تھے کچھ اس آفت کے تصور کی نذر ہوئے۔ وہ کیا کرتیں۔ البتہ ما کسی قدر حواس میں تھیں۔ نظیر اور اُنھوں نے دونوں نے مل کر سارا اسباب سمیٹا۔ اور سواریوں پر ٹھکانے سے رکھا گھر تھا تو خالی یہی تین تو ہوں گے نہیں۔ آخر لونڈیاں باندیاں نوکر چاکر بھی ہوں گے۔ چلنے لگے تو اچھا خاصا دس بارہ آدمیوں کا قافلہ تھا یہ قافلہ آگرے کو روانہ ہوا۔ اُس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ آگرہ ہے کیوں اختیار کیا گیا۔ شاید کوئی قرابت مند پہلے سے وہاں ہوں۔ یا یہ خیال ہو کہ دہلی کے بعد اُس سے بہتر اُن دنوں کوئی شہر محفوظ و معمور نہ تھا۔ بہرحال کوئی سبب ہو۔ یہ لوگ بجناح استعجال آگرے پہنچے اور وہاں سٹھائی کے پل پر قیام کیا۔

نظیر کی شادی

جب تک ہندوستان میں درانی کے قدم رہے کس کی شامت آئی تھی کہ شادی کا نام لیتا۔ تمام ملک میں ایک زلزلہ مچا ہوا تھا اور ہر طرف بے امنی پھیلی ہوئی تھی۔ آنے کو نظیر آگرے سے آیا مگر اس آفت نے اس کا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ آگرے کے قریب تک یہ بلا پہنچ چکی تھی۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ اس کے لشکر میں وبا پھیلی جس کی وجہ سے کچھ یوں ہی سا لوٹ کر جاٹوں کے ملک کو متھرا کے ایک مذہبی میلے میں کئی ہزار جوگیوں سنیاسیوں اور دوسرے ہنود کی بھینٹ لیتا ہوا وہیں اوپر اپنی ولایت کو لوٹ گیا۔

آدمی کی یہ بھی فطرت ہے کہ خطرہ اگرچہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو مگر جب وہ ٹل گیا تو پھر ایسا بے فکر ہو جاتا ہے گویا کبھی وہ خطرہ تھا ہی نہیں۔ طرفہ یہ ہے کہ جس قدر خطرہ بڑا ہوتا ہے اسی قدر زیادہ زور سے طبیعت انسانی کا خاصہ ظاہر ہوتا ہے۔

درانی کے حملے سے دلوں میں جو پریشانیاں پیدا ہوئی تھیں وہ انتہائی درجے کی تھیں۔ مایوسی کا یہ حال تھا کہ کم ہی اشخاص ایسے ہوں گے جو یہ نہ سمجھتے ہوں کہ ہم پر حضرت عزرائیل کا آٹھوں پہر سخت پہرا ہے۔ عالمِ تردد میں جب نفس تنگی کرنے لگتا تھا تو بعض اوقات خود اپنا جسم قبر بنکر فشار دیتا تھا۔ تنہا مکان میں بیٹھے ہوئے ہیں بیٹھے بیٹھے آنکھوں کے تلے یکایک اندھیرا چھا گیا۔ کانوں کو نکیرین کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ سوالات کا تار بندھا ہوا ہے۔ اور یہ ایک دو روز کی کیفیت نہ تھی۔ بلکہ مہینوں کا مشغلہ۔

مقامِ غور ہے کہ جب ان مصیبت مندوں کے سر سے وہ بلا ٹلی ہو گی تو پھر ان کے دلوں میں خیالاتِ

شکر کس زور سے آبھرے ہوں گے۔ کتنے ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھے ہوں گے اور کتنے سر سجدے میں جھکے ہوں گے کتنی چادریں کن کن مزاروں پر چڑھی ہوں گی اور کتنی منتیں کہاں کہاں اتری ہوں گی۔

لیکن کیا اُس صدمۂ عظیم کی تلافی کے لیے یہی معمول رسمی باتیں کافی ہو سکتی ہیں۔ ہرگز نہیں۔ پھر جو اپنے وقت کا ابن سینا ہی اپنا قانون لے کر آتا ہی اور غفلت کی معجون کھلا کر گزشتہ ہولناک واقعات کو دلوں سے یک قلم بھلا دیتا ہی۔ طفلانہ خوشیاں اور اُمنگیں آن بھرتی ہیں اور بے فکریوں کے مشغلے ہر طرف کثرت سے پھیل جاتے ہیں۔

نظیر کے گھر میں زیادہ تر عورتیں تھیں کچھ تو اُن کی جبلّت میں بزدلی کچھ سن کا تقاضا۔ ویرانی کے خوف سے جس قدر اِن کے دل چور رہوے تھے شاید کم کسی کے ہوے ہوں گے۔ تعجب ہی کہ اس اتنی مُدت تک زندہ کیوں کر رہیں۔ بہر حال جب اُس مصیبت کو جھیل گئیں تو اب تو خدا نے اچھے دن دکھائے۔ ابتدائی مراتبِ شکر وسپاس سے فراغت حاصل کر کے سب سے پہلے اِن کے خیالات نظیر کی شادی کی طرف رجوع ہوئے۔ نظیر جوان ہوا۔ تنہا گھبراتا ہوگا۔ کوئی دُلھن سلیقے کی مل جاتی تو اس کا دل بہلتا۔ لڑکے کی خبرگیری کچھ مردوں ہی سے خوب ہوتی ہی۔ ہم کیا جان سکتے ہیں کہ کہاں جاتا ہی کہاں آتا ہی شہر کا واسطہ ہی ہر طرح کی صحبت ہی۔ خدا جانے کس صحبت میں بیٹھ کر کیا ڈھنگ اختیار کرے۔ اس کے آبا یہاں ہوتے تو اس کو روکتے ٹوکتے۔ ہم پردے کی عورتیں کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ پرایا شہر ہی۔ اس میں ہم کو کون جانتا ہی ہم کو کون بیٹی دے گا۔

نظیر جب سے آگرے میں آیا تھا۔ ابتدا میں تو یہ بھی ترددات میں مبتلا رہا۔ نیا شہر تھا۔ دنیا کا بہت زیادہ تجربہ اُس کو نہ تھا۔ تمام انتظام نئے کرتے تھے۔ مکان کا نیا بندوبست۔ فرش فروش کا نیا بندوبست۔ پانی کے

لیے نیا سقا۔ کپڑوں کے لیے نیا دھوبی۔ خلاصہ یہ کہ خانہ داری کے تمام جُزئیات و کُلیات اُمور کا ازسرِنو انتظام۔ اِن جھگڑوں سے جب فراغت ہوئی تو رفتہ رفتہ اِس نے کام کے لوگوں سے تعارف پیدا کرنا شروع کیا۔ کُچھ تعارف تو انتظامِ خانہ داری کے ضمن میں بھی ہوا تھا مگر اُس میں کچھ اُس کے مذاقِ خاص کو دخل نہ تھا۔ اب یہ ایسے لوگوں سے تعارف پیدا کرنے لگا جن میں اس کی دل بستگی اور پسند کے لائق صفتیں موجود تھیں۔ کہیں سُنا کہ فلاں نوجوان نہایت ذہین اور طبیعت کا چالاک ہے۔ اُستاد اُس کے مداح ہیں اور شہر میں اُس کی بڑی تعریف ہے۔ فوراً کسی تقریب سے اُس سے جا ملا اور رسمِ آشنائی بڑھا کر مبادلۂ خیالات کرنے لگا۔ ہر چند ایک ذکی دوسرے ذکی اور ایک طبّاع دوسرے طبّاع کا جلد قائل نہیں ہوتا مگر غیر معمولی طبّاعی و ذکاوت کا کوئی کب تک انکار کر سکتا ہے۔ انصاف پسندی غالب آتی ہے اور نظیر کی اذکیا کی انجمن میں خود اذکیا کی زبان سے تعریف ہوتی ہے۔

اُن دنوں اظہارِ جودت کا ایک بہت بڑا موقع مشاعرہ تھا۔ میر تقی کی شاعری اوج پر تھی۔ تمام شہر اُن کا لوہا مانتا تھا۔ جس مشاعرے میں یہ شریک ہوتے اُس کا مہینوں تذکرہ رہتا۔ اکثر سخن فہم اور سخن سنج اُن کا نام سُن کر بشوق شریک ہوتے اور محظوظ واپس آتے۔ شرکاءِ مشاعرہ کے رنگین اور چیدہ اشعار ہر ایک کی زبان پر ہوتے۔

نظیر دہلی سے آیا تھا تو شعر کہتا ہوا آیا تھا۔ جوانی عاشقی کا گہرا رنگ اُس کے مزاج میں ٹھہر رہی تھی۔ طبیعت کی شوخی ہر وقت ایک تازہ گلدستہ سامنے لیے رہتی تھی۔ پہلے تو دو ایک دفعہ یوں ہی شریکِ مشاعرہ ہوا جب اپنے ہم عمر سخن گویوں کا رنگ ڈھنگ دیکھ لیا تو ایک دفعہ خود اس کے دل میں بھی خیال پیدا ہوا کہ لاؤ اب کے میں بھی تو کچھ لکھوں۔ اور لوگ لکھتے تھے تو اساتذہ کی تقلید کرتے تھے بڑی فکر سے لکھتے۔

ہفتوں میں غزل تمام کرتے - پھر اُستاد کے حضور لے جاتے - اُستاد کچھ شعر کاٹتے کچھ چھانٹتے - کسی شعر کی اصلاح فرماتے - بعض مُنھ چڑھے شاگرد کو دو ایک شعر اپنے خزانۂ طبیعت سے بھی عطا کرتے - گو اِس ترکیب معمولی واہ واہ سبحان اللہ سے اُن کے کان آشنا ہو جاتے تھے مگر کوئی غیر معمولی چرچا نہیں پھیلتا تھا - نظیر اپنا اُستاد آپ تھا - ہر چند تھوڑی بہت تقلید سے تو چارہ نہ تھا مگر طبیعت کی آزادی اور شوخی زیادہ تر اپنی طرف کھینچ کرلے جاتی تھی جس سے قوتِ ایجاد کو پھولنے پھلنے کا اچھا موقع ہاتھ آتا تھا - اسی عالم میں اس نے ایک شگفتہ اور لطیف غزل طیار کی - اتفاقاً کسی دلی دوست کو سُنائی تو وہ مُصر ہوئے کہ اس کو اب کے مشاعرے میں پڑھو اور ضرور پڑھو - تعریف کا میرا ذمہ - نظیر اس دوست کی صلاح سے پہلے تو انکسار سے ہٹیں باقی مگر خود نمائی دامن نہیں چھوڑتی بقولِ غنیمت ؎ پری رو تابِ مستوری ندارد * چو در بندی سر از روزن برآرد * آخر جاتا ہی - نظیر کو آئے ہوئے اتنا زمانہ ہو گیا تھا کہ کسی طرح میر صاحب تک بھی اس کا تذکرہ پہنچ گیا تھا - جب اس کی غزل کی تعریف کی گئی میر صاحب نے اپنے مقدس لبوں سے اظہار تبسم فرما کر ایک مربیانہ ادا سے یوں ارشاد کیا - ہاں بھئی - پڑھو اور ضرور پڑھو - گُلِ جدید لذیذ ولی کے چٹخارے تو مشہور ہیں -

دل کی دُھکڑ پکڑ اُس وقت قابلِ ملاحظہ تھی - مگر تعریف ہو چکی تھی - اتنا بڑا اُستاد شوق ظاہر کر چکا تھا پھر سوا پڑھنے کے چارہ کیا تھا - دل کو کڑا کر کے بند سے غزل کھولی - اور ہاتھ میں ورق کو مضبوطی سے تھام کر ایک نیم محجوب ادا سے لوگوں کی طرف مخاطب ہوا - چاروں طرف سے ارشاد ارشاد کا غُل تھا جس وقت نظیر نے یہ مطلع پڑھا ہی لوگوں کا عجب عالم تھا -

نظر پڑا اِک بتِ پری وش نرالی سج دھج نئی ادا کا	جو عمر دیکھو تو دس برس کی پہ قہر آفت غضب خدا کا

ختمِ غزل پر میر صاحب نے قریب بُلا کر پیٹھ ٹھونکی اور مکرر فرمایا عُمرت دراز باد -

جس مشاعرے کا یہ ذکر ہے اس میں گو میر صاحب نے بھی غزل پڑھی لوگوں کے دلوں میں نظیر کے اشعار نے تعجب کے خیالات اس کثرت سے بھر دیے تھے کہ کسی اور بات کی گنجائش ہی نہ تھی رنگ جمتا تو کیوں کر جمتا۔ اُن دنوں کے حافظے دفتر کے دفتر یاد رکھ سکتے تھے مگر ساتھ اس کے بھی بنظر مزید احتیاط کئی نقلیں لوگوں نے وہیں لیں اور کئی نظیر کے گھر پر آکر لے گئے۔ نظیر اپنی اس کامیابی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ جدھر جاتا تھا لوگوں سے داد پاتا تھا۔ جوان مرحبا اور حبذا کہتے تھے اور بوڑھے ماشاء اللہ چشم بد دور فرماتے تھے۔ شدہ شدہ اُس کی شہرت ملکوں کی گلی میں بھی پہنچی۔ وہاں ایک دہلی کے بادشاہی احدی رہتے تھے۔ اُن کا نام تو معلوم نہیں اور چنداں اُس سے غرض بھی نہیں مگر اُن کے ایک داماد تھے جن کا نام محمد رحمٰن تھا۔ احدی صاحب کی چوں کہ اللہ آمین کی ایک ہی بیٹی تھی اپنے داماد کو بہت چاہتے تھے۔ گویا ایک طور پر اُن کو خانہ داماد کر لیا تھا۔ اُن کے دو لڑکے تھے خیر الدین اور کریم الدین اور ایک لڑکی جس کا نام معلوم نہیں۔ یہ لڑکی اب اُس عمر کو پہنچی تھی جس میں بزرگوں خصوصاً بزرگ عورتوں کو بڑی فکر ہوتی ہے۔ خانہ دامادی کے سبب باپ تو بے فکری کے ساتھ دونوں وقت کھاتے اور دندناتے تھے مگر ماں اور نانی کو نیند نہ آتی تھی۔ احدی صاحب پر ہر حیلے بہانے سے تقاضے ہوتے کہ اس کی شادی کی فکر کرو۔ وہ بھی کہتے مجھے خیال ہے۔ فکر ہی میں ہوں کوئی ڈھب کا پیام آئے تو کہوں۔ اسی اثنا میں نظیر کی طباعیوں کا حال سُنا۔ کسی موقع پر جب وہ تاج بی بی کے روضے کی سیر کو باغ میں آیا تھا تو اُس کو دیکھا بھی تھا۔ احدی صاحب کے دل میں بڑے زور سے خیال آیا کہ ہم بھی دہلی کے ہیں اور اس لڑکے کا خاندان بھی دہلی کا ہے۔ کیا خوب ہوتا کہ یہ لڑکا ہم کو ملتا۔ شہر میں مشاطوں کی کیا کمی ہے۔ ایک کو بلاؤ دس دوڑی آئیں۔ احدی صاحب نے کسی مشہور مشاطہ کو بُلایا اور اُس سے اپنا عندیہ بیان کیا۔ اس نے کہا آپ فکر نہ کیجیے۔ یہ تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دو ہی چار روز کا ذکر ہے کہ خود لڑکے کی

ماں نے مجھ کو بلا کر بڑی منت اور سماجت سے کہا تھا ابھی کوئی لڑکی میرے ولی محمد کے لیے نہیں ٹھہرا دیتیں۔

مشاطہ احدی صاحب کے ہاں سے چل کر نظیر کے گھر آتی ہے اور یہاں اُس کی ماما نی پاس اپنا رنگ جماتی ہے دولہن کی صورت کی تعریف کرتی ہے۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ ہنر سلیقے کی بڑائی ہانکتی ہے۔ دسوں اُنگلیاں دسوں چراغ۔ حسب نسب کی خوبیاں جتاتی ہے۔ ان کے بزرگوں میں بڑے بڑے لوگ ہو گزرے ہیں۔ ملکوں کی گلی اُنھی کی آبادکی ہوئی ہے۔ پہلے ان لوگوں کا بڑا دور دورہ تھا۔ قوم کے مُغل تو ہیں ہی اور مُغل بھی کون چغتائی۔ اِن کی جواں مردی میں شک کس کو ہو سکتا ہے۔ ملک میں لڑائی تھی۔ بادشاہ حیران تھے۔ کوئی تدبیر بن نہ پڑتی تھی۔ آخر لوگوں نے نام تو یاد نہیں مگر اُن کے پرکھوں میں جو سب سے بڑے ہو گزرے ہیں اُن کا نام لیا۔ چھوٹتے ہی بلوائے گئے اور لڑائی پر روانہ ہوئے۔ کُل جمع اِن کے ساتھ دو سو سپاہی تھے اور غنیم کی طرف خدا جھوٹ نہ بُلوائے تو کم سے کم دو لاکھ۔ مگر اُن کی بہادری اور جرأت کے صدقے جائیے کہ دو گھنٹے میں پھر ایک کا بھی کہیں پتا نہ تھا۔ سچ ہے تلوار کی آنچ ایسی ہی ہوتی ہے غرض اسی دن سے اُن کو بادشاہ نے تمام فوج کا سردار کیا۔ اور یہ سپہ سالار کے نام سے مشہور ہوئے۔ مگر بیوی دولت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ اور نوکری موت کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ عروج دیکھ کر لوگ جلنے لگے۔ دراندازوں نے بادشاہ کے کان بھرے۔ بادشاہ تھے ذرا کان کے کچے۔ دم میں آ گئے۔ حاکم کا قہر اور گنگا کی لہر مشہور بات ہے فوراً حکم ہو گیا کہ کل صبح تک شہر چھوڑ دو نہیں بال بچے سب کولھو میں پلوا دیے جائیں گے۔ اس حکم کے بعد کھانا پینا کس کو خوش آ سکتا تھا۔ راتوں رات وہاں سے روانہ ہوئے اور آگرے ہی میں آکر دم لیا۔ اُسی زمانے سے پُرانی منڈی میں باغ خان عالم کے قریب ملکوں کی گلی میں آباد ہیں۔ پہلے تو بہت کچھ تھا مگر اب گئے گزرے

وقت میں بھی کسی کے محتاج نہیں۔ دُلن کو دے کر کھاتے ہیں اور شہر میں اِن کی بڑی آب و ہے۔
اِس طرح کی باتوں سے نظیر کی ماں نانی کو وہ ایک آن میں شیشے میں اُتار کر قول قرار لے کر پھر ملکوں کی گلی واپس جاتی ہے اور ہنستی ہوئی بڑے دھوے کے ساتھ انعام کا تقاضا کرتی ہے۔ سب آؤ بھگت اُس کو اُونچی پیڑھی پر بٹھاتی ہیں اور پان پہ پان اور زردے پر زردہ دیے جاتی ہیں۔ بی مشاطہ پھر اصل پیام سُناتی ہیں۔ اور ہنسی خوشی گھی شکر سے اُن کا مُنھ بھرا جاتا ہے۔
ابتدائی اُمور کے بعد پھر ضابطے کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔ نظیر کے گھر کی عورتیں نظیر کو اپنے ارادے سے مطّلع کرتی ہیں۔ وہ ایک خوش آیند ادا سے مسکرا کر شرماتا ہوا جواب دیتا ہے۔ جیسی آپ لوگوں کی خوشی۔ اِس رضامندی کے متعلق پیشیں گوئی کرنے والیاں داد لینے کو اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ کیوں بیوی! نہ کہتی تھی صاحب زادے آپ کے حکم سے باہر نہ ہوں گے۔ پھر کسی دن نظیر کو رقعے کی تکلیف دی جاتی ہے۔ گو اُس پہ جبر گزرتا ہے مگر کسی طرح اپنے حسب و نسب کا رجز سُنا کر رہتا ہے۔ ملکوں کی گلی میں تو ناموں کی ایک لمبی فہرست گئی ہوگی مگر مجھے اُن میں سے صرف دو ہی معلوم ہوئے۔ ایں ہم غنیمت است۔ وہ دو یہ ہیں۔ محمد فاروق۔ اور محمد سُلطان۔
رقعے کے بعد سخن ہارنے کی باری آئی۔ نوری دروازے سے نظیر کی ماں اور نانی دو ایک اَور پاس پڑوس کی عورتوں کو لے کر احمدی صاحب کے گھر پہنچیں اور تجاہلِ عارفانہ کے ساتھ سخن ہار آئیں۔ اِس لڑکی کو میں لوں گی۔ میں تم سے اِس لڑکی کو مانگتی ہوں۔ یہ لڑکی تم مجھے دو۔ بقول شخصے سن بھادوے مینہ یا ہلاوے۔ اُدھر سے بھی کچھ عاجزی انکساری کے کلمات کے ساتھ کہ ہم تُمھارے لائق تو نہیں ہیں۔ اِس لڑکی میں کیا ہے جس پہ تم ریجھی ہو۔ اظہارِ رضامندی کیا گیا۔ اور آخر تاریخ منگنی کی مقرر ہوگئی۔

منگنی کے ایک ہفتہ قبل سے راگ رنگ شروع ہوا۔ نظیر کے گھر میں الگ اور نظیر کی منگیتر کے گھر میں الگ۔ اگر اِدھر گھوڑیاں گائی جاتی تھیں تو اُدھر سہاگ۔ یوں منگنی کی خبر گھوڑیوں پر سوار ہوکر بڑے سہاگ سے نکلی اور گھر گھر پہنچی۔

خیر سے وہ منگنی کی سبھ گھڑی نیک ساعت بھی آہی پہنچی۔ نظیر رنگین لباس پہن کر دولہا بنتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لباس سے زیادہ آج کچھ اُن کی طبیعت رنگین ہو رہی ہے۔ اپنے احباب اور مستورات کے ساتھ خوش خوش دُلھن کے گھر تشریف لے جاتے ہیں۔ اور اندر باہر خوشی کا باغ لگا دیتے ہیں۔ عورتوں کے سواریوں سے اُترتے ہی چڑھاوے کے سامان گھر میں پھیل جاتے ہیں۔ سونے چاندی کے زیور۔ گوٹے پٹھے اور پھولوں کے گہنے۔ دُہری دُہری انگوٹھیاں۔ مصری کے کوزے۔ خوش نما سنگار دان۔ اُن میں سونے چاندی کے ورقوں سے مڑھی ہوئی پان کی بیڑیاں۔ دُلھن کے ہاتھ پر رکھنے کے لیے رُومالوں میں بندھے ہوئے روپے اشرفیاں گود میں ڈالنے کے لیے ناریل کھیلیں بتاشے لڈو۔ مٹکیوں میں بھری بھری کئی من شیرینی۔

اس سامان کے ساتھ گھر میں ایک خاص خوشی پھیل جاتی ہے۔ اب جس شخص کو دیکھیے اُس کی پیشانی ایک خاص روشنی سے چمکی ہوئی ہے۔ دلی اُمنگوں نے ہاتھ پانوں میں بھی پھرتیاں بھر دی ہیں۔ کوئی لپک کر اِدھر آتی ہے کوئی جھپٹ کر اُدھر جاتی ہے۔ زنان خانے کی پرانی دنیا میں نئی دنیا کی ہل چل ہے۔ اسی دنیا میں ایک نئی نویلی رنگیلی البیلی کسی گوشے میں بیٹھی ہے۔ لوگوں کی ہر آہٹ اُس کے دل میں بجلی کی لہریں پیدا کر رہی ہے۔ دل کیا ہے خاصا لیڈن جار ہے۔ دور کی آہٹ رفتہ رفتہ ایک ممتاز چاپ ہو جاتی ہے۔ سگھڑ سہاگنوں کا ایک خوش نما جھنڈ اندر داخل ہوتا ہے۔ سُرخ جوڑے سے شفق پھولتی ہے۔ گوٹے پٹھے سے بجلیاں چمکتی ہیں۔ زیورات سے تارے چھٹک جاتے ہیں۔ غرض ایک سادی خوزادی آرایش و زیبایش کے طلسم سے خاصی دُلھن بن جاتی ہے۔

سمدھنیں آنکھیں بچھائے باہر بیٹھی ہیں۔ دُلھن کی عمر ہی کیا ہے۔ پھول ہو رہی ہے۔ اس خوش بو پھول کو لوگ گود میں اُٹھا کر سمدھنوں کی گود میں لا رکھتے ہیں۔ سمدھنیں اَور کون نظیر کی ماں اور نانی۔ یہ دونوں رنگ ڈھنگ دیکھ کر جامے میں پھولی نہیں سماتیں۔ دلوں سے خوشی کی بلبل چہک کر لبوں پر آبیٹھتی ہے۔ اور "شادی مبارک" کا مبارک راگ بلند کرتی ہے۔ جہیز کے زیوروں پر چڑھاوے کے زیور تاروں بھری رات میں جگنو چمکاتے ہیں۔ شیریں لبوں کو مصری قندِ مکرر بناتی ہے۔ بیڑہ زمرّد سے لعل نکالتا ہے۔ ناریل کھیلیں تباسے لڈو بھری ہوئی گود میں حلوائی کی دکان کھول دیتے ہیں۔

گود بھری جا چکی تو گھونگھٹ کی گھٹا دور ہوئی۔ منہ چاند سا نکل آیا۔ آنکھیں ایک خاص ادا سے مُندی ہیں۔ چہرے پر اچھی خاصی تمتماہٹ ہے۔ بھولا پن رنگ لا رہا ہے۔ نیک بختوں کا بلائیں لینے کو جی چاہتا ہے۔ دلوں سے دعائیں نکل رہی ہیں۔ اُنگلیاں خیال کی چٹخ رہی ہیں۔ دونوں ہاتھوں میں رومال سے کھول کر روپے اور اشرفیاں رکھی جاتی ہیں۔ دہنے ہاتھ میں انگوٹھیوں کی بہار نظر آتی ہے۔ صدقے میں میراثنیں بھی کچھ پا جاتی ہیں۔ کہیں وہ نازک پھول کُملا نہ جائے اِس خیال سے اُس کو گود میں اُٹھا کر پھر کوٹھری میں رکھ آتی ہیں۔ عطر کی شیشیاں دل کھول کر اخلاق کرتی ہیں۔ پھولوں کے ہار گلے کا ہار ہوتے ہیں۔ شربت منہ میٹھا کرتا ہے۔ نقدی شکریہ ادا کرتی ہے۔ پھر اخیر میں چھالیا الائچی رخصت کے پان دیتی ہے۔

اندر کا حال تو سُن چکے۔ اب باہر کا حال سُنیے۔ برادری برابری مشہور بات ہے۔ جب دُلھن کو چڑھاوا گیا تو کیا دولھا کو نہ جاتا۔ نظیر بےچارہ مسافرت میں تھا۔ ہر چند اُس کی ماں نانی دہلی کا ہنر سلیقہ رکھتی تھیں مگر بے سروسامانی میں کیا کر سکتی تھیں۔ دُلھن کے نانا شہر کے رئیس تھے۔ قدیم گھرانا تھا۔ وافر آمدنی تھی۔ سب طرح کا اطمینان رکھتے تھے۔ بیگم صاحب بھی دل کی سخی تھیں۔ بڑے حوصلے سے دولھا کا چڑھاوا بھیجا۔

گوٹے اور پھولوں کے گہنے ایسے تھے کہ سب بے اختیار درود پڑھنے لگے۔ آنکھوں میں روشنی آئی۔ دماغ نے تازگی پائی۔ دوشالہ خاص کشمیر کا۔ ملاست میں ملائی نرمی میں ریشم۔ نقش و نگار میں قلم کار چھینٹ۔ رومال عدم میں طاق۔ دوسرے جوڑے کچھ مال نہیں تھے ارزانی کو اگر کچھ نہیں تو پشمینے کی شال نہیں۔ مردوں کو زیورات سے کیا کام۔ مگر نوشے کا ہاتھ خالی دیکھا نہیں جاتا۔ انگوٹھے کے لیے چاپ انگشتانہ ہے۔ چھوٹی انگلی کے لیے ایک مختصر سی انگشتری۔

نظیر نے گوٹے اور پھولوں کے گہنے تو پہنے نہیں بیٹھے بیٹھے پہنے۔ جب دوشالے کی باری آئی تو کھڑا ہونا پڑا۔ شگفتہ مزاجی کی صبح میں سہانی شفق پھولی۔ چاپ انگشتانے نے داہنے ہاتھ کے انگوٹھے کو دل میں بٹھایا اس خیال سے کہ نوشاہ بلاغت کا پادشہ تھا۔ انگشتری نے چھوٹی انگلی کو آنکھوں میں جگہ دی اس نظر سے کہ نو عروس فصاحت کی سہیلی تھی۔ رومال نے ہاتھ میں انداز کھلایا لقدنی سے نمایاں ہو کر گل اشرفی کی بہار دکھائی شگوفے کی شاخ سے سونے کے پھول جھڑنے لگے۔ پھر عطر کی خوشبو پھیلی۔ پان کا رنگ جما۔ شربت کے مزے ہوئے۔ چلیے منگنی ہو گئی۔ دہائی رکھی۔ سلامت۔ مگر ابھی تو رسموں کا تانتا بندھا۔ منگنی کے دوسرے ہی دن لکھنؤ کی گلی سے عورتیں چوبا لے کر نہالی کے محل پر جاتی ہیں۔ سامان کچھ اس قسم کے ہیں:۔

چوبے۔ پھولوں کے زیور۔ رومال۔ چاندی سونے کے ورقوں میں لپٹی ہوئی بیڑیاں۔ ایک چاندی کا کٹورا۔ کسی قدر شکر۔ سونٹھ۔ اور چاول کا بھوڑا۔

عورتیں ادھر گھر میں اتریں۔ ادھر نظیر کو بلوایا گیا۔ پیار کے ہاتھوں سے مسکرا مسکرا کر چھ نوالے کھلائے گئے۔ ساتویں نوالے پر بڑی ہنسی ہوئی۔ چوبے کے بعد چاندی کے کٹورے میں توتوں کا شربت آیا اور پلایا گیا۔ پھر پانوں کے بیڑے اور رومال ہاتھ پر رکھ دیے گئے۔ نظیر کی بہنیں کہاں تھیں کہ سونہیں بنتیں۔

اور اُس کے منہ میں بیڑا رکھتیں۔ خود سے کھا لیتا ہے اور پھر سب کو جھک جھک کر سلام کرتا ہے۔ سلام سے خوش ہو کر عورتیں کچھ پنجھاور کرتی ہیں۔ میراثنیں اور کر کمینیں منہ مانگی مُراد پاتی ہیں۔

احمدی صاحب کی طرف تو لوگوں کے دلوں میں شدت سے ارمان بھرے ہوئے تھے۔ اُن کو اُن کے طور پر چھوڑ دیا جاتا تو شاید چاؤ نکالنے کے لیے برس دو برس بھی شادی کا مذکور نہ کرتے۔ مگر نظیر کی طرف جلدی تھی۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ مسافرت کا عالم تھا۔ اُن کے پاس وہ سامان نہ تھا کہ ہر تقریب میں سو دو سو خرچ کرتے۔ دوسرے نظیر اچھی طرح جوان ہو چکا تھا۔ پرایا شہر تھا۔ کوئی مرد سر پر نہ تھا کہ دن رات اُس کے حالات کی نگرانی کرتا۔ ہر وقت خوف میں گزرتی تھی کہ کہیں بُری صحبتوں میں بیٹھ کر راہ سے بے راہ نہ ہو جائے۔ تیسرے کچھ یہ بھی مقصود تھا کہ جلدی بہو گھر آئے اور گھر آباد ہو۔ نظیر کی ماں شاید کچھ ٹھہر بھی جاتی۔ مگر اس کی نانی کہاں دم لینے دیتی تھیں۔ اُن کی زبان پہ دن رات یہی کلمہ تھا کہ زندگی موت کا ٹھکانا نہیں۔ سانس آئی آئی نہ آئی۔ کل کی کس کو خبر ہے۔ دنیا میں بہت رہ چکی اور سب ارمان نکل چکے۔ اب صرف ایک آرزو رہ گئی ہے کہ ولی محمد پروان چڑھے اور اُس کے سر سہرا دیکھوں۔ اسی مطلب کو وہ دن میں سو طرح سے ادا کرتی تھیں اور سب کا خلاصہ یہ ہوتا تھا کہ جو ہو آج ہی ہو جائے۔

غرض منگنی کے ساتھ ساعت رکھنے کی دُھوم ہوئی۔ کسی مسجد میں چانولوں کے طشت میں کچھ نقدی رکھی گئی۔ قرآن مجید کھولا گیا۔ پھر قرآن کو گردان کے تاریخ مقرّرہ کا اعلان کر دیا گیا۔ مسجد کے مُلّا نے طشت کا جائزہ لیا۔ حاضرین پان کا بیڑا اور بتاسے لے کر رخصت ہوئے۔ گڑ اندر بھیجا گیا۔

شام کو اُدھر دونوں طرف سے زردہ پکوا کر بانٹا گیا۔ اُدھر عورتیں شیرینی اور میوہ لے کر دولہا اور دولھن دونوں کے گھروں میں سواریوں پر سے اُترنے لگیں۔ ڈھولک نے میٹھے بولوں سے اُن کا خیر مقدم

کیا۔ اُنھوں نے خوشی میں آکر سریلی تانیں گوش زہرہ تک پہنچائیں۔ اور اب ساچق کے روز تک یہی معمول ہوا کہ روز آتیں اور گا بجا کر پھر اپنے اپنے گھر چلی جاتیں۔

جب نکاح کو صرف سات روز رہ گئے تو دولہا دلھن دونوں مایوں بٹھائے گئے۔ دولہا کا مایوں بٹھنا کچھ اُس کی ماں اور نانی ہی کو خوش آیا ہوگا۔ لیکن سچ پوچھیے تو مایوں بٹھنا تھا دلھن کا جس کا تصور ہمیں آج بھی خوش کر رہا ہے۔ اُن دنوں فوٹو کا رواج نہ تھا۔ مصور گھر میں گھسنے نہ پاتے تھے۔ فقط خیال کہاں تک نقاشی کرے۔ پھر بھی کچھ خوش نما خط و خال ہمیں دور سے نظر آتے ہیں۔ شباب طفلی پر چھپکا پڑتا ہے۔ طفلی شباب کو پرے دھکیل رہی ہے۔ ولایتی خون چمپئی رنگت پر شہاب چھڑک رہا ہے۔ مخموریت آنکھوں میں گلابی جھلکا رہی ہے۔ مسکراہٹ گالوں میں گڑھے ڈال کر گلاب کو کنوئے جھنکواتی ہے۔ ٹھوڑی اپنی نکیلی ترکیب سے سیب کے دل میں اُتری چلی جاتی ہے۔ بھنورا سے کالے کالے چمکیلے چٹکیلے ریشم کے لچھے سر سے اُلجھتے سلجھتے بکھرتے لہراتے پتلی لچکیلی کمر سے بالشت دو بالشت نیچے تک پانو پھیلاتے ہیں۔ ہم اس خوش نما تصویر کو بسنتی جوڑا پہنا کر کچھ نیک بختوں کے جھرمٹ میں ایک نائن کے ہاتھ میں چھوڑتے ہیں۔ اب وہ جانے اور اُس کا کام میوے اور پنڈیوں کے ناشتے اور دودھ کے چاے پانی میں ہم بھی شوق سے شریک ہو سکتے تھے مگر ابٹنا اندر پانو کب رکھنے دیتا ہے۔ خیر رخصت۔

دن جاتے کچھ دیر نہیں لگتی خصوصاً وہ دن جو خوشی کے ہیں۔ ان کو تو بجلی کے سے پر لگ جاتے ہیں ہم اس خیال میں پڑے سوتے تھے کہ ابھی پورے سات دن باقی ہیں مگر آنکھ جو کھلتی ہے تو دیکھتے ہیں نظیر کے گھر میں ساچق کے سامان ہو رہے ہیں۔ منتظمین سرگرم انتظام ہیں۔ قلی مزدوروں کا ہجوم ہے۔ آرایش کے سامان پھیلے ہوئے ہیں مشعل اور آتش بازی کے ٹوکروں پر ایک صاحب لٹھ لیے ہوئے پہرہ دے رہے ہیں

باہر سڑک پر گھوڑے ہنہنا رہے ہیں۔ تخت رواں کے آس پاس کچھ بہشت کی قمریاں اٹھلا رہی ہیں۔ روشن چوکی
اور تماشے والے اپنی دُھن میں ہیں۔ صحن میں جہاں عمدہ نقش و نگار کی مٹکیاں رکھی ہوئی ہیں کوئی صاحب تشریف لائے
اور ڈھکنوں کے کنول پر تیلی تیلی تبیاں چڑھا گئے۔ کسی طرف سے ایک خوش نما خوان چلا آتا ہے جس میں چار
شیشے نقاشی کے کام کے ڈنڈیوں کے رنگ سے بھرے ہوئے اور کچھ شیشیاں تیل عطر وغیرہ کی رکھی ہوئی ہیں
مُنہ اُن کا سلیقے سے گوٹے کے سُرخ کپڑے سے بند ہے۔ علاوہ ان کے سر پر باندھنے کے لیے کلاوے۔ مہندی
سرمہ۔ مسی۔ تیل ڈالنے کی پیالیاں۔ کنگھیاں اور دو انگوٹھیاں بھی ہیں۔ ساتھ ہی اس کے دو سادی مٹکیاں
چُونے سے لپی ہوئی مُنہ کلاوے سے بندھا ہوا۔ اُس پر آٹے کی مچھلیاں چپکی ہوئیں۔ دو چنچل چھبیلی کمر کو لے
کو مٹکاتی لا رہی ہیں۔ پوچھنے سے معلوم ہوا ایک میں گڑ کا گاڑھا شربت ہے اور دوسری میں دہی۔ دیکھتے ہی
دیکھتے وہ دیکھیے وہ چڑھاوے کے جوڑے کا خوان بھی پہنچ گیا۔ ایک جوڑا تو بہت ہی بڑی طیاری کا ہے اور
سِلا سِلایا طیار ہے مگر دوسرے جوڑے نے ابھی مقراض اور سوئی سے ملاقات بھی نہیں کی۔ گیارہ گز سُرخ ٹول
ہے جس کو سُہاگین سوہا کہتی ہیں اور پائجامے کے لیے سوا دو گز گلابی رنگ کی لیس کلاٹ اور سبز گلبدن کا تھان
جوڑے کے ساتھ زرنگار جوتی بھی ہے جس میں چاندی کے گھنگرو پڑے چھُن چھُن کر رہے ہیں اور وہ بیش بہا ازاربند
بھی جس پر خود نظیر کا یہ شعر صادق ہے:-

تھے چار توڑے موتی جو تولا ازاربند	گوٹا کناری بادلہ مقیش کے سوا

اُسی خوان میں وہ خوش نما لاٹ بھی قائم ہے جو ابرک پنّی گوٹے پٹھے اور کلابتوں کی وجہ سے بڑی جگمگا رہی
ہے۔ لاٹ نہیں یہ واقع میں سُہاگ کا طلسم ہے۔ تمام خوش بودار مصالح اس میں بھرے ہوئے ہیں۔ خود خوش بو
گواہ ہے۔ جوتری۔ جائفل۔ زعفران۔ چھوٹی بڑی الایچی۔ جو ڈھونڈھو سب موجود۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے

کہ اس میں دلھن کے پہننے کی سونے کی نتھ بھی ہے جس میں ایک نہیں تین تین چمکیلے سڈول موتی پڑے پاک دامانی کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ سہاگ پڑا جو آپ نے سنا ہو وہ یہی ہے۔ کچھ معلوم نہیں مطلب کیا ہے مگر ایک نیک بخت ایک ٹوکرے میں سوئے پالک کا ساگ بھی لا رہی ہے۔ لانے دو۔ میں نے نہیں دیکھا مگر لوگ کہتے ہیں کسی طرف دلھن کی گود بھرنے اور آراستگی کے لوازمات بھی ہیں۔ بہت مبارک

شہر میں مشہور ہے کہ آج نظیر کی ساچق نکلے گی۔ نوری دروازے سے خانِ عالم کے باغ تک دو رویہ انتظار نے اپنی کھڑکیاں کھول رکھی ہیں۔ جب شام کی سیاہی کسی قدر خوش نما طور پر پھیلی تو منتظمین میں ایک خاص سرگرمی آئی اور اس سرگرمی کے ساتھ مزدوروں اور قلیوں اور اسی درجہ کے اور لوگوں میں ایک خاص ہل چل پیدا ہوئی۔ بے جان چیزیں جو زمین پر پڑی تھیں وہ سروں پر پھرنے لگیں۔ مٹکیوں کے کنول آنکھوں کی طرح روشن ہوئے۔ اور ستاروں کی طرح جگمگانے لگے۔ درہمی برہم ہوئی۔ انتظام نے نظام پایا شکست خوردہ فوجیں سمٹ آئیں۔ ٹوٹی ہوئی صفیں جمنے لگیں۔ تلنگوں نے پرا باندھا۔ سواروں نے باگیں سنبھالیں بہشتی قمریاں تختِ رواں کے پنجرے میں ہو بیٹھیں۔ روشن چوکی پر راگنیوں کا جلوس ہوا۔ باجوں سے آسمان گونج اٹھا۔ مشعلیں ہر طرف شعلہ فشاں ہیں۔ ہوائیوں نے ستاروں کو چھیڑنا شروع کیا۔ دیپک مہتاب نے چاند سورج کو چار چاند لگائے۔ غبارے سیاروں کا خاکا اڑانے لگے۔ اناروں کے گل فشاں نورانی پیڑ قائم ہیں۔ جوہی کے منھ سے مسلسل پھول جھڑ رہے ہیں۔

غرض اس ٹھاٹھ اور طیاری سے نظیر کی ساچق روانہ ہوئی۔ تماشائیوں کے چہرے خوشی کے نور سے چمکنے لگے۔ راہ دیکھنے والی آنکھیں راہ کی طرح روشن ہوئیں۔ ہر چند برات نوری دروازے سے کہیں دور جا پہنچی ہے پھر بھی لوگ یہی کہتے ہیں کہ ابھی نوری دروازے سے باہر نہیں نکلی۔ نوری دروازہ ساتھ ہے اور شاید خانِ عالم کے

باغ میں اس کا بھی ملکوں کی گلی سے بیاہ ہونے والا ہی۔ خدا راس لائے۔
ملکوں کی گلی میں احدی صاحب کی ڈیوڑھی کے متصل تماشائیوں کے دل کچھ خاص کیفیت سے رنگے ہوے ہیں۔ اُن کی نگاہیں سرسری طور پر روشن نہیں ہوتیں۔ اُن کی آنکھوں سے دل جھانک رہے ہیں اور اُلفی کھڑکیوں سے آرزوں کا قافلے کا قافلہ نکلا چلا آتا ہی۔
کچھ ملا اور واعظ کا گھر تو تھا نہیں کہ احتیاط کی جاتی۔ خاصی طرح کڑھاو چڑھایا گیا۔ اصلی یا بنی ہوئی سوسنوں نے ایک ایک گلگلا اپنے ہاتھ سے چھوڑا۔ آٹے اور گڑ کے ساتھ اپنا اپنا نیگ لیا۔ ساتھ کے ساتھ میراثنوں نے اللہ میاں کی سلامتی پڑھی۔ اللہ میاں کے گیت سُنائے۔ پھر ایک کوری مٹکی آئی۔ شربت نے پیٹ بھر کر اس کی پیاس بجھائی۔ صندل نے منھ پر گلاب چھڑکا۔ ایک کلاوہ بندھی ہوئی بدھنی سہرا لٹکا کر سرتاج ہوئی۔ بدھنی کی ٹونٹی کے منھ میں سلامتی سے ایک پان کا بیڑا ابھی دبا ہوا ہی۔ اللہ میاں کی سنجری جو سُنا ہو وہ یہی ہی۔ گلگلے نہیں معلوم کس بات پر منھ پھلائے تھے۔ اللہ میاں کے رحم کو جوش آیا۔ چانول پسے اور مصری سے شیر و شکر ہوے۔ گو اس لیپ سے گالوں کا ورم تو دفع نہیں ہوا مگر پیشانی پر رضامندی کی چمک ضرور رہی۔ اپنا تو لوا قسم و اللہ کی تفسیر طباق کی محراب میں آٹے کا مُصلے بچھاے ہوے اللہ میاں کی چومکھ بیان کر رہی ہی جس کی چرب زبانی اور روشن بیانی ابین من الامس واظہر من الشمس ہی۔ خوش عقیدہ سُہاگنیں غش ہیں۔ اگر مثنوی شریف کی وہ شبان والی حکایت ٹھیک ہی تو ید بیضا کا چراغ یہاں بھی نہیں جل سکتا۔ خوش عقیدگی نے آنکھوں سے نیند کو اُڑایا ہی۔ بینک بختیں ہنسی خوشی جاگ رہی ہیں۔ بھینی بھینی رات اُن کی مُشک بو چوٹیوں اور معطر جوڑوں سے جاڑوں میں ہارسنگار کے جنگل کی چھانو ہو رہی ہی۔ لیجیے اب نور کا تڑکا ہوا۔ چراغ جھلملا کر رخصت چاہتے ہیں۔ ستاروں کی انجمن بھی بکھرا ہی چاہتی ہی۔ حسینوں کے منھ چاند ہیں مگر صبح کے چاند کی طرح پھیکے اور ماند۔

شب بیداری رنگ لا رہی ہے۔ کیا ہوا رنگ لاتی ہے تو لانے دو۔ کیا ایسے جاگتے نصیب روز آتے ہیں۔ مُلا صاحب باہر انتظار میں گھبرا رہے ہیں۔ کوئی نیک بخت ہو تو اُن کو بُلا لائے۔ نیاز کی چیزیں سب طیار ہیں۔ آئیں اور اللہ میاں کی سلامتی کی نیاز دے جائیں۔ لیجیئے مُلا صاحب بھی آ ہی گئے۔ بزرخ مبارک قابل دید ہے۔ کیا ہی عقیدت سے ہاتھ پھیلائے ہوئے زیر لب بڑبڑا رہے ہیں۔ اپنا رنگ جمانے کے لیے خواہ مخواہ بھی دیر لگا رہے ہیں۔ اجی حضرت کہیں جلدی اُٹھو بھی۔ اب تو عورتیں بھی گھبرا اُٹھیں۔ بڑے تقاضوں سے یہ فتنہ اُٹھا تو سہی مگر کچھ لے کر اُٹھا۔ چراغی کا دینا تو شائد ناگوار نہ گزرا ہوگا مگر نہیں معلوم کیوں۔ چلتے وقت حضرت پر گالیوں کی بوچھار خوب ہوئی۔

صبح سے دوپہر تک کچھ بہت زیادہ عرصہ نہ تھا۔ باتوں ہی باتوں میں گزر گیا۔ اب بی بی کے کھانے کی طیاری شروع ہوئی۔ چودہ طباقوں میں کھانا نکالا گیا۔ کورے برتن۔ سفید خشکہ۔ صاف دہی۔ شفاف شکر۔ شیریں میوہ۔ خوش بو ہار غرض ہر چیز سے پاک دامانی آشکار۔ بیوی زنیں جن کے حسب نسب میں کسی طرح کا فرق نہیں۔ جن کے چال چلن میں کسی قسم کا نقص نہیں۔ جن کے اخلاق بالکل شریفانہ۔ جن کی وفاداری و اطاعت ضرب المثل۔ حضرت بی بی کے ہاف روزے سے مُنھ کو نورانی کیے ہوئے خراماں خراماں آرہی ہیں۔ پیغمبر صاحب اور پیروں کے چار طباق الگ کئے گئے۔ بی بی کی صحنکیں ان نیک بختوں کے آگے رکھی گئیں۔ پہلے سنجیری کے شربت سے سبھوں نے روزہ کھولا۔ پھر کھانے میں شریک ہوئیں۔ کھانے کے بعد سرمہ۔ منہدی عطر کی باری آئی۔ منہدی کچھ تو ہاتھوں میں رچی۔ جو ہاتھوں سے بچی وہ گھل کر اور طرح کام آئی۔ سادہ دلی رنگ لائی۔ بی بی کا کھانا ہوا اور بی بی کے گیت نہ گائے جائیں کوئی کہنے کی بات ہے۔ عقیدت کی آوازیں بلند ہیں۔ سُنئے تو زہرہ بھی ریجھ جائے مگر آنے کی اجازت ہی نہیں۔

لوگوں کو یاد ہوگا دُلھن کے جوڑے کے ساتھ ساچق کے روز سوہے کے نام سے گیارہ گز سُرخ کپڑا بھی آیا تھا۔ اِس کپڑے کا نصف گز پہلے دُلھن کے گھر کی بیوی زنوں میں تقسیم ہو کر گزوں سرخ روئی حاصل کرتا ہے۔ مبارک وہ چوٹیاں جن میں اس کا موباف ہو۔ پھر باقی کتر بیونت کر وہی بیوی زنین اُسی وقت دُلھن کا سُوہا جوڑا سیتی ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد وہ منقّش شیشے جو ساچق کے دن سے بسنت کو بغل میں دبائے بیٹھے ہیں کھُلتے ہیں اور ایک ہی غوطے میں دُلھن کے جوڑے کو بسنتی کر دیتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے برات کی رات بھی آ ہی پہنچی۔ نظیر تو ساچق ہی کے دن سے سُسرال میں براج رہے ہیں چڑھاوا تو چڑھایا جا چکا ہے۔ اب برات کے جوڑے پر نظر ہے۔ جوڑے کی تفصیل مجھے معلوم نہیں۔ مگر اتنا دیکھتا ہوں کہ جوڑے کی کشتی ایک مکلّف خوان پوش سے ڈھکی ہوئی آ رہی ہے۔ آگے آگے میراثنوں کا جھُرمٹ ہے۔ ٹونے دل موہ لے رہے ہیں۔ دُلھن کے مُنہ سے کچھ اس طرح کے میٹھے بول سُنائی دے رہے ہیں:

ہریالے بنے لاڈلے پر میں ایسا ٹونا بناؤں گی۔
جب وے دیکھے مُکھ میرا ہی دیکھے میں تو سنگ لگائے پھروں گی

برات کا جوڑا جا چکا تو دُلھن کے والدِ بزرگوار اندر سے بُلائے گئے۔ ہرچند اِن کے دل میں بیٹی کی جُدائی کے خیالات تلاطم پیدا کر رہے ہیں مگر مصنوعی استقلال رومال سے گردِ ملال چہرے سے دور کرتا جاتا ہے۔ پیاری بیٹی کی صورت دیکھ کر استقلال کی گرفت سُست ہو جاتی ہے اور رومال ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ دل اُمڈ آتا ہے اور آنکھیں بھر آتی ہیں۔ ہرچند گلے میں رقت سے پھندے پڑے ہوئے ہیں مگر ایک ضروری فرض سر سے اُتارنا ہے چپ کیوں کر رہیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہاتھ پر روپیہ اور پنڈیاں رکھّیں اور لرزتی ہوئی آواز سے یہ فقرہ آویزۂ گوش کیا:۔

ای لڑکی۔ لے آج میں تیرے فرض سے ادا ہوا۔

قیامت کا فقرہ تھا۔ اس کے سننے کے بعد کسی کو یارائے ضبط نہ رہا۔ گرد و پیش جتنے تھے سب رو رہے تھے۔ باپ بیٹی کے رونے کو پھر کیا پوچھتے ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ بقول شاہ نصیر:

	یوں نہ برستے دیکھے ہوں گے رن کے کسی نے ساون بھادوں	

عین خوشی میں یہ منظرِ رقت شاید بعض طبیعت کو کسی قدر بے موقع معلوم ہو مگر فطرت انسانی یوں ہی ہے اور اُس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

اِدھر تو یہ سماں تھا اُدھر نوشہ اور نوشہ کون میاں نظیر نہا دھو کپڑے بدل اچھے خاصے دولھا بن باہر تشریف لائے۔ طوائفوں نے سہانے کی دُھن میں سہرا گانا شروع کیا۔ گانا ہو ہی رہا تھا کہ مجتہد صاحب کے قدوم میمنت لزوم کی دھوم مچی۔

	تنہا نہیں ہوں یارو۔ یا نالہ و فغاں ہوں	

مُجتہد صاحب کے ساتھ شاہدین بالغین حُریں بھی تشریف رکھتے ہیں۔ ہرچند مجتہد صاحب کی شان میں کوئی کلمہ عرض کرنا سوءِ ادب ہے مگر کچھ تو سمدھیانے کا تعلق کچھ حضرت کا برزخِ مُبارک بے چین کیے دیتا ہے اور بے ساختہ پھبتی کہنے کو جی چاہتا ہے۔ اب چاہے سوءِ ادب ہو چاہے استخفافِ مذہب آئی پر چوکنا اپنے مذہب میں تو روا نہیں۔ سفید داڑھی اور نیلی پگڑی معلوم ہوتا ہے چرخِ پیر نے رات کی پُرانی ساڑی سر سے لپیٹ لی ہے۔ آنکھیں زُہرہ مُشتری کی طرح چمک نہیں رہیں بلکہ لولی فلک سے قاضی چرخ کی آنکھیں لڑ رہی ہیں اور گو ماند ہے مگر پھر بھی پیشانی تیئسویں چوبیسویں کا چاند ہے۔ شک ہو تو یقین کے لیے گھٹے کی جھائیاں موجود۔ ڈاڑھی چاہِ ذقن سے حوضِ ناف تک کہکشاں کی طرح پھیلی ہوئی۔ دُم دار ستارے شرم کے مارے شاید اسی

کنوے یا حوض میں ڈوب مرے۔ شدتِ نزلہ سے ناک دلوے گوش بگوش ڈوب کر دیکھیے تو دلو بھی پانی بھرتا نظر آے۔ مونچھیں زہر تقویٰ میں بجھی ہوئی شیر گردوں کی مونچھیں اکھاڑ رہی ہیں۔ بھنویں وہ زہر کی گانٹھ کہ عقربِ فلک کو بڑی ڈنک مار رہی ہیں۔

شمائل شریف کے بیان میں اس سے زیادہ موشگافی مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ بعضوں کو تو اتنی بھی زہر معلوم دی ہوگی۔ لیکن شادی کا موقع ہے۔ اُمید ہے شربت کے گھونٹ کی طرح پی جائیں گے۔

آتے کے ساتھ پہلے تو سرِ منبر بھاری بھرکم آواز سے سلام علیکم کا گونجتا گرجتا فقرہ سُنائی دیا۔ پھر اَور قرارتیں چھٹنے لگیں۔ حروفِ حلقی کے بلغم در حلو مخارج نے سامعے کا اُگال دان بھر دیا۔ قرارت کے گھن گرج لب و لہجہ نے کانوں کے حوض پر مینڈکوں کی سبزی منڈی قائم کر دی۔ حاضرینِ مجلس کی نگاہیں اس پر بھی مجتہد صاحب کے لبوں پر جمی ہوئی ہیں۔ گویا نگاہوں نے کانوں کے لیے ٹیلیفون کا تار باندھا ہے لفظ لفظ توجہ سے سُن رہے ہیں اور اصلِ مقصود کا اصل خیر سے انتظار ہے۔ اتنے میں تہوّرالنسا کا پیارا لفظ سُنائی دیا۔ پھر بنت محمدّ رحمن چغتائی۔ پھر اَور مراتب۔ وکیل۔ بالنکاح۔ شاہدین۔ عادلین۔ بالغین۔ حُرّین۔ لاکھ۔ روپیہ سکّہ۔ رائج الوقت۔ دینار سُرخ۔ انتظارِ سماعت اب اعلیٰ درجۂ اشتیاق کو پہنچا ہوا ہے۔ مجتہد صاحب نظیر سے دو بدو ہیں اور نظیر شرمائی ہوئی ترچھی نگاہوں سے اُن کی طرف مخاطب کہ اتنے میں یہ زبردست فقرہ سُننے میں آیا:۔

انکحتک بو کلتے بالصداق المعلوم

نظیر نے اِس کے جواب میں کیا کہا معلوم نہیں۔ مگر دیکھا کہ چاروں طرف سے مُبارک باشد مبارک باشد کا غل ہے اور ہر طرف چھُہارے لُٹ رہے ہیں۔

خُرما اور ثواب جب لوگ لوٹ چکے تو برات کی طیاریاں شروع ہوئیں۔ کُل سامان وہی تھے جو ساچق میں بیان ہوے۔ نہ تھا تو ایک سُہاگ پُڑا۔ ہاں کچھ روشنی اور آتش بازی بھی زیادہ تھی۔ غرض باجے گاجے کے ساتھ برات نکلی اور گشت لگا کر بڑی رونق و خوبی سے دروازے لگی۔ دُلھن کے غسل کا پانی نظیر کے گھوڑے کے نیچے ڈالا گیا۔ تڑا تڑ بھات کے گیند پڑے۔ سوار اور گھوڑا دونوں جھجھکے۔ آس پاس پھلجھڑی چھٹ گئی۔

اب نظیر نے پرستان میں پانو رکھا۔ دیووں نے اُس کا پیچھا چھوڑا۔ پریاں اُس کے ساتھ ہوئیں۔ گو نگاہ کو آزادی نہیں ہی مگر گھم گھمی بتاتی ہی کہ گھر میں تِل دھرنے کی جگہ نہیں۔ ہر عُمر کی نیک بختیں شوق کی گھبراہٹ میں بے حجابانہ نکل آئی ہیں۔ گو نظیر اُن کو دیکھتا نہیں مگر اپنی نسبت اُن کی رائیں سنتا ہی۔ گوشۂ چشم کسی قدر دیکھنے میں بھی مدد دیتے ہوں تو عجب نہیں۔ بہرحال اسی ہجومِ فرحت لزوم کے ساتھ نظیر خراماں خراماں وسطِ صحن میں پہنچا۔ شامیانے کے نیچے تخت بچھا تھا۔ اُس پر زرّیں جوتی کے ساتھ مُنھ پر رنگین رومال رکھے ہوے چڑھا۔ میراثن نے آن کر گلے میں کلاوہ ڈالا اور ٹوٹنے گانے شروع کیے۔ نظیر آخر شاعر تھا فوراً اُس کا ذہن اِس شعر کی طرف منتقل ہوا۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

ٹوٹنوں کا ٹوٹکا ختم ہوا تو پہلے لو میں سُہاگا لگایا گیا پھر کانوں میں کسی نے پڑھ کر یہ پھونکا:-

سونے میں سُہاگا موتی میں دھاگا۔ بنے کا بنی سے جی لاگا

سُہاگے کے ساتھ پسِ پشت ہینگ بھی سُلگ رہی تھی۔ اور جادو کی مدہوش کرنے والی خوش بو پھیلا رہی تھی

اُدھر دلھن کے ہاتھ میں شکر رکھی گئی۔ خبر نہیں کچھ بیج بھی ملے تھے یا نہیں۔ اُدھر تاسوں سے شربت طیار ہوا اور کٹورے میں بھر کر نظیر کے سامنے آیا۔ ٹوٹکے سے کوئی بات خالی نہیں۔ یہاں شربت میں بھی دلھن کے پینے کی نتھ پڑی ہوئی تھی۔ رسم کے مطابق آدھا شربت نظیر نے پیا۔ آدھا دلھن نے نوش جان فرمایا۔

اِن رسوم کے بعد نظیر کو چار بجے تک آرام کرنے کی مہلت ملی۔ لیکن اُسکے قلب کو آرام نہ تھا۔ خیالات میں اُسکے ایک عجب تلاطم تھا۔ اور یہ طوفان اُٹھا ہوا تھا شوق اور انتظار کا۔ یہ مہلت اُسنے کس قدر گھڑیاں اور کڑیاں گن گن کر کاٹی ہیں نہیں کہہ سکتا اگر جب ریت رسم کی دھوم مچی تو عورتوں کو تو یہی کہتے سُنا کہ ابھی پوری طرح کمر بھی سیدھی نہ کی تھی کہ لو وقت آگیا۔

میاں نظیر پھر پکڑے ہوے گھر تشریف لائے۔ اور ریت رسم کے ساماں پھیلے۔ سات سُہاگنوں نے مل کر سُہاگ پُڑے کو کھولا اور اُسکے اندر سے بال چھڑ۔ کپور کچری۔ وغیرہ خوشبو چیزیں نکال نظیر کے آگے رکھیں۔ پھر چکلے کے ساتھ بٹا آیا۔ اب چاروں طرف سے فرمایش ہے کہ بیٹھ کر پیسو۔ جوانیں مسکرا رہی ہیں۔ بڑی بوڑھیاں دل سے تقاضا کر رہی ہیں۔ سیر انہوں کے آگے ایک شربت کا کٹورا ہے جس میں سُرخ نگینے کی انگوٹھی پڑی ہوئی ہے۔ نظیر ابھی سروج پیس نہیں چکے کہ سالیوں نے آن کر آنکھوں میں سُرمہ لگایا۔ یہ سرمہ نہ تھا جوتیوں کا پارا ہوا کاجل تھا۔

چشم ما روشن و دلِ ما شاد

اِس سے زیادہ یہ ہوا کہ جو اُبٹنا دلھن کے مَلا جا چکا تھا اُسکے آٹھ چراغ بن کر آئے۔ چراغ کے جلو میں ایک شیر صاحب بھی تشریف رکھتے ہیں۔ تمام بدن پر کوڑیوں کے نقش و نگار۔ چھاج کے کٹھرے میں بند ہیں اور آٹھوں چراغ روشن۔ نظیر کہتا نہ تھا مگر اُس سے زبردستی کہلوایا گیا:۔

میں بھیڑا اور یہ شیر۔ میں بھیڑا اور یہ شیر

نظیر کی ماں نے اس ڈر سے کہ شیر کہیں اُن کی بھیڑ کو کھا نہ جائے جلدی سے اُس کا مُنھ بھرا اور

دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

کہکر قصہ پاک کیا۔

نظیر کی پیری

ناظرین نظیر کے لڑکپن اور جوانی کے تماشے تو دیکھ چکے - اب ذرا اُسکے بڑھاپے کی سیر بھی دیکھ لیں - نظیر لڑکا تھا جب بھی نظیر ہی تھا - اور جوان تھا جب بھی نظیر ہی رہا مگر وہ نظیر جس کی دنیا مین اس قدر شہرت ہے نہ لڑکا نظیر تھا نہ جوان بلکہ بوڑھا ع کہ کار آزمودہ ہست گرگ کہن ؂

نظیر کے لڑکپن اور جوانی کی تصویریں جو کھینچی گئی ہیں اُن میں زیادہ تر خط و خال تخلیل کے ہیں اس لیے کہ کوئی آدمی مجھے ایسا نہیں ملا جس نے کہا ہو کہ میں نے نظیر کو لڑکا یا جوان دیکھا ہے - لیکن اُسکو بوڑھا دیکھنے والے اب بھی کچھ لوگ دُنیا میں موجود ہیں - لڑکپن میں اُنھوں نے اُسے بوڑھا دیکھا تھا اور شانِ خدا یہ ہے کہ اب لڑکے جوان سب خود اُنھیں بوڑھا دیکھ رہے ہیں -

اس خصوص میں نظیر کی نواسی سے بڑھکر شہادت کس کی ہوگی - جب نظیر مرے ہیں اُن کی عمر سات برس کی تھی - چوں کہ اس عمر میں آنکھوں کے شیشے بہت مجلّی رہتے ہیں اور مشاہدے کا فوکس نہایت ٹھیک لہذا ہمکو اُن کے حافظے کے کیمرے میں نظیر کے بڑھاپے کا ایک عمدہ نیگیٹیو مل گیا ہے جس سے ہم ایک عمدہ پازیٹو نہایت اعلیٰ درجے کی پالش کے ساتھ تیار کر کے پیش کرتے ہیں - یقین ہے اس قسم کی نادر فوٹوگرافی کے قدرداں سر آنکھوں سے اس کی خریداری فرمائیں گے اور دل ہی کے فریم میں جگہ دیں گے - اگر اس وقت میاں نظیر زندہ ہوتے اور اُن سے کہا جاتا کہ میاں صاحب چلیے ذرا چلکر تصویر کھنچوا لیجیے تو اُنھیں پہلے تو اس کا یقین نہ آتا پھر اگر یقین بھی آتا تو وہ گھڑیوں ٹالتے کہ میں بوڑھا ہو کر کیا تصویر کھنچواؤں گا - پھر اپنی

نیک مزاجی سے راضی ہوتے تو بے تکلفی سے کہتے آؤ- یوں ہی کھینچ لو- تیاری کو کہا جاتا تو گھنٹوں میں کہیں جاکر طیار ہوتے- لوگ کہتے تصویر کے لیے یہ رنگ موزوں نہیں- وہ کہتے مجھے اس رنگ کے سوا عادت نہیں- سیاہ خلافِ وضع ہے- وہ کہتے" میں اس وقت گھوڑے پر نہیں بیٹھتا- لوگ کہتے آپ کی تصویر ہو تو ٹوپی پہ ہو- خلاصہ یہ کہ خدا جانے کیا کیا دقتیں پیش آئیں اور اسپر بھی تصویر اُنکی یا لوگوں کی پسند کے موافق ہوتی یا نہوتی اِسوقت جس طرح چاہو اُنکی تصویر کھینچ لے سکتے ہو- نہ انھیں تکلیف نہ تمھیں تکلف-

لیجیے میاں نظیر تصویر کھنچوانے کو تشریف لیے آتے ہیں- ماشاءاللہ میانہ قد ہے- کُل طویلِ احمقٌ کے بینارِ حمق سے دُور- کُل قصیرِ فتنۃٌ کے قصرِ فتنۂ و فساد سے الگ- بدن اچّھا طیار ہے سینہ چوڑا- اور کیوں نہ ہو کسرت کی عادت ہے- گو بڑھاپے میں کسی قدر اس کسرت میں قلت آگئی ہے مگر پھر بھی دیوار کا پیچھا نہیں چھٹا گھر کے در و دیوار اس کے گواہ ہیں- بوڑھے کے دم خم کو اب کیا دیکھتے ہو مگر ہاں کبھی ہوگا- ع مٹے ہوؤں کا نشان مزار باقی ہے ❊ دیکھنا ہے تو اُس بلا کے ذہین اور خوش قیافہ چہرے کو دیکھو- جس کی شکن شکن میں فکر رسا بسی ہوئی ہے اور جس کے ہر بلند و پست سے نشیب و فرازِ دنیا کا تجربہ ٹپک رہا ہے- صبح پیری کا سہانا سماں ہے- شگفتہ مزاجی سے کلیاں چٹک رہی ہیں اور خوشبو سے گلشن مہک رہا ہے- جبین جس پر غور و فکر کے قدر انداز نے ایک خاص شان سے بھنوؤں کی نُقرئی کمانیں کھینچ رکھی ہیں دونوں کمانوں کے بیچ میں کشادہ پیشانی سے کا گلہ ہے تُلی کھڑی ہے- گلہ ہے یا ذوق کے دل کا قائم مقام جہاں وہ کہتا ہے ؎ کیا کروں آن ابروے پیوستہ کے دل بس میں ہے ❊ ایک طلسمہ مچھلیاں دو کش کش آپس میں ہے ❊ یہ مَتہ کچھ دہنی جانب دبا ہوا ہے- غور سے دیکھا تو رنگت اُسکی کسی قدر مائل بسرخی ہے- پیشانی سے نیچے اُترے تو بھنوؤں کی محراب میں آنکھیں اثرِ پیری سے وقفِ عبادت ہیں- دیکھنے میں کم چھوٹی ہیں اور پتلیاں سیاہ- کان سرگوشی کر رہے ہیں کہ لوہمیں نہیں دیکھتے حال آنکہ نظیر کے خبر رساں ہمیں ہیں-

لاؤ صاحب تمھیں بھی دیکھ لیں۔ ہیں تو بڑے بڑے اور لوا و پر سے ایک ہلکی بالوں کی جھالر بھی رکھتے ہیں جو بڑھاپے کی ہوا میں خوشنمائی سے اڑ رہی ہے۔

خوش بو کے قنوج میں ناک بھی کچھ عطر فروشی کر رہی ہے۔ ذرا اس کا کنڑ بھی ملاحظہ کر لیجیے سونگھتو ان ہے اور متوسط درجے کی نہ موٹی نہ پتلی معشوق ناک بھوں نہ بیٹھیں کہ اس صفت سے اُن کی ناک پر کوئی مکھی نہیں بیٹھتی۔

لیجیے اب مونچھوں کی سرحد آ گئی۔ لو یہ تو حدِ شرع سے متجاوز ہیں۔ خاصی گرفت کے قابل۔ اِنھی کے زیرِ سایہ گویائی کے دو خوش نما چلتے پُرزے بھی ہیں جن کو ایک جانب سے دیکھیے تو لب ہیں اور دوسری جانب سے دیکھیے تو بلبل اور بلبل بھی کون ہزار داستان جس نے ایک نہیں سیکڑوں دفعہ طوطیِ دستاں سرا کے ہونٹ مَل مَل دیے ہیں۔

مونچھوں کے جواب کو نیچے خشخشی داڑھی ہے۔ اگر وہ بھنگ چھان رہی ہیں تو یہ بھی پوست گھول رہی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ چوں کہ ان کا عمر بھر کتابوں سے تعلق رہتا تھا اس لیے حکمت سے خدا نے انھیں چہرہ بھی کتابی ہی عنایت کیا۔

اس وقت چوں کہ طیاری تصویر کی ہے لہٰذا سر پر ایک چکّردار پگڑی بندھی ہوئی ہے (ڈپٹی تراب علی صاحب فرماتے ہیں محمد شاہی کھڑکی دار پگڑی یہی ہے)۔ کسی وقت خاص میں جب پگڑی اُتری ہوئی ہو تو تمھیں نظر آئے گا کہ چاند پر بال اُڑے ہوئے ہیں گویا دماغ کا چاند وبالِ کلفت سے پاک ہے۔ پگڑی تو دیکھ چکے۔ گلے میں انگرکھے کے اوپر سے دوپٹے کی قدیمانہ شان بھی ملاحظہ فرمائیے۔ یہاں لپیٹ لیا اور کوئی مہین کپڑا کہاں۔ گاڑھے گزی کا انگرکھا ہے۔ سیدھا پردہ نیچی چولی (ڈپٹی تراب علی بالا بر فرماتے ہیں)۔ برکا پاجامہ۔

جاڑے نہیں ہیں ورنہ فرخ آباد کی چھینٹ کا چوغہ بھی دیکھتے۔ پانو میں گھیتلی جوتی ہی(یہ تکلف تصویر کی بہ سبب) ہی ورنہ عموماً چمڑے کی جوتی چپڑواں کرکے پہنتے ہیں۔ ہاتھ میں آڑو کی چھڑی اور دو انگوٹھیاں عقیق سرخ اور فیروزے کی انگلی میں پڑی۔

وضع میں تھوڑا بہت تغیر واقع ہوسکتا ہی مثلاً اگر اُن کے درویشانہ اور آزادانہ خیالات کا جلوہ دکھنا پاہو تو اُنھیں کمل اُڑھا دو۔ اُنھیں اوڑھنے میں اصلا تاُمل نہ ہوگا۔ لیکن اصلی وضع اُن کی یہی ہی جو بیان ہوئی اسی وضع میں وہ لوگوں کے پاس جاتے تھے اور اسی وضع میں اُن کے ارکان خاندان اُن کو دکھانا پسند کرتے ہیں۔

فوٹوگرافی میں ایک دستور یہ بھی ہی کہ کبھی سیدھا کھڑا کرکے تصویر کھینچتے ہیں۔ کبھی کرسی پر بٹھا دیتے ہیں کبھی میز سامنے رکھ دی جاتی ہی۔ کبھی ہاتھ میں کوئی کتاب دے دی جاتی ہے۔ بعض اوقات کوئی سواری بھی ہوتی ہی۔ گھوڑا۔ بگھی۔ فٹن۔ لینڈو۔ ٹمٹم۔ بائسکل۔ اُن دنوں بائسکل کہاں۔ بگھی۔ فٹن۔ لینڈو۔ ٹمٹم بھی بمشکل کہیں ہوگی۔ ان مہذب سواریوں کی جگہ رتھیں بہلیں البتہ نظر آتی ہیں۔ سواریوں کی پوری اب دیکھنی منظور ہو تو نظیر کی وہ نظم دیکھ لیجیے جس کی ٹیپ کا شعر یہ ہی:۔

جب چار کاندھے پر ہوئیں بھاری سواریاں
جھک مارتی یہ رہ گئیں ساری سواریاں

کبھی سیر دریا کے شوق میں نظیر رتھ میں بھی بیٹھے ہیں۔ لیکن رتھ میں بٹھاتے ہو تو پوری میلے کی تصویر کھینچو ورنہ اُن کو اپنے قدیم الخدمۃ ٹٹو ہی پر رہنے دو۔ مگر خبردار ہاتھ میں کوڑا نہ دینا۔ اور ذرا لگام بھی ڈھیلی ہی رکھنا بلکہ تم تکلف کیوں کرو۔ اُن کو تاج گنج سے چلنے دو۔ پھر بیسیوں موقع ایسے آپ سے آپ مل جائیں گے

کہ تم بے تکلف اُن کی بے اطلاع اسٹینٹینس تصویر اُن کی کھینچ لے سکو گے- چلتے چلتے گھوڑا رُکا- رُک کر گھانس پر مُنھ ڈالا- ایاز پیچھے ہے- نظیر کو اُس کا انتظار ہے- لو اب ایاز آگیا- لگام پکڑ کر گھوڑے کو آگے بڑھایا ہے بس تصویر کھینچ لو- شہر کی سرحد آگئی ہے- لوگ دو رویہ سلام کر رہے ہیں- نظیر کے دونوں ہاتھ بلند ہیں- بس تصویر کھینچ لو- کوئی صاحب گھوڑے کے پاس آن کھڑے ہوئے ہیں- باتیں ہو رہی ہیں بس تصویر کھینچ لو- کتاب کے ساتھ اگر تصویر کھینچنی منظور ہے تو ہاتھ میں وہی قلمی نسخہ دے دو- جس کی نسبت لوگ بتاتے ہیں کہ اُنھی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے- جلد بھی مختصر ہے- اور انگریزی نُما- اب جی چاہے کھول دو یا بند ہی رہنے دو- وہ نہ ملے تو انشاے مادھورام سہی- وہ بھی اُنھی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے- قاعدہ یہ ہے کہ کبھی کبھی گروپ بھی کھنچواتے ہیں- سب سے بہتر گرُوپ وہ ہوگا جس میں تمام ارکینِ خاندان مع خُدّام وعبید شریک ہوں- اولادوں کی جماعت کو آگے بڑھائیے- خلیفہ گلزار علی دہنی طرف رہوں اور میر نجف علی عرف مرزا جان میاں نظیر کے داہنے بائیں طرف- غلاموں کی صف پیچھے ہو- مگر خدا بخش مرزا جان کے قریب رہیں کہ اُن کی بیوی کو جہیز میں ملے ہیں- اور اب اُسی کے کہلاتے ہیں- امام بخش خلیفہ گلزار علی کے قریب رہیں- ایاز اپنے ٹٹو کو لے کر دہنے بائیں کسی طرف بھی کھڑے ہو جائیں- دولت نظیر کے پیچھے کھڑے کر دیے جائیں لیکن اُن کی ٹوپی پر یہ مصرعہ ضرور کڑھا ہوا ہو:-

دولت کی یہی خوبی ہے سو نعمتیں کھا ڈال

کم بخت لونڈیاں کہتی ہیں کہ جب غلاموں کی تصویر کھینچی جاتی ہے تو ہماری کیوں نہ کھینچی جائے- کھینچی تو جائے مگر تمھارا گروپ تمھاری بیویوں کے بغیر ٹھیک کیوں کر ہو سکتا ہے- پہلے اُن کو تو راضی کرو- لیجیے وہ بھی راضی ہو گئیں- بیچ میں نظیر کی بیوی تہورالنسا بیگم تشریف رکھتی ہیں- اُن کی دہنی طرف اُن کی صاحب زادی

امامی بیگم ہیں- اور بائیں طرف اُن کی کم عمر نواسی ولایتی بیگم جن کو پیار سے گھر بھر بیگم جان کہہ کر پکارتا ہی- ان کے پیچھے اپنے قرینے سے یہ چار لونڈیاں ہیں گلاب- چنبیلی- چندو- نجیبن- گلاب کا قیافہ کچھ مرہٹوں سے ملتا ہوا ہی- آخر اس کا سبب کیا ہی؟- اگر یہ فرض کیا جائے کہ یہ مرہٹے کی قوم میں اُس کا گلابو نام تھا بنیے کے بارہ روپے اُس پر آتے تھے- وہی بارہ روپے کر کے خریدی گئی- یوں بنیے کے قرض سے الگ سبکدوش ہوئی- زیور اسلام سے جُدا آراستہ ہوئی- گلابو جو بھی ہندو پن کی بو تھی اُسی کو گلاب کے چھینٹوں سے دُور کیا گیا- آدمی بوڑھا ہوتا ہی تو یکایک تو بوڑھا ہو نہیں جاتا- اس کے بھی مدارج ہیں- لیکن جن کے قوی اچھے ہوتے ہیں اُن کا تنزل خود اُن کو تو کیا دوسروں کو بھی کم محسوس ہوتا ہی- نظیر چونکہ اچھی صحت کا آدمی تھا اِس لیے اُس کو انحطاطِ قویٰ کا احساس بہت کم ہوا- وہ جہاں کہیں بوڑھوں کی زبان سے نقل کرتا ہی وہ بہت کچھ اُس پردے میں اپنے خیالاتِ اندرونی کا اظہار کرتا ہی-

باوجودے کہ اُس کی عمر قریب سو برس کے پہنچ چکی تھی مگر پھر بھی وہ عینک کا کبھی محتاج نہ ہوا پیادہ چلتا تھا تو چھڑی ہاتھ میں رکھتا تھا مگر اُس کا کچھ دست نگر نہ تھا- یہ بھی بڑھاپے کا ایک فیشن تھا- البتہ اُٹھتے بیٹھتے اُس کو کسی قدر مشقت ہوتی تھی اور اِس مشقت میں اُن فقروں سے خدائے توانا سے استمداد کرتا تھا- یا مفضّل بیہمال- یا عاجز نواز- یا غریب نواز- عموماً لوگ ایسے موقع پر یا علی کہتے ہیں- نظیر ہر چند شیعہ تھا مگر اُس کا یا علی کے عوض اُن فقروں سے کام لینا اُس کی خوش عقیدگی اور موحّدانہ خدا پرستی کی کافی دلیل ہی-

سو برس کی عمر تک کسی انسان کا پہنچنا انسان کی عُمدہ صحت اور معتدل چلنا زندگی کا خود کافی ثبوت ہی لیکن اس ثبوت کو اس سے اور تقویت ہوتی ہی کہ اس طولِ عمر کے ساتھ نظیر پر اخیر عمر میں جب فالج کا مادہ

اگرچہ تو اس کے صدمے سے بھی انھوں نے کسی طرح جانبری حاصل کی اور پانچ برس اس کے بعد بھی زندہ رہے۔ ان کی
نواسی تو ان کی جاں بری کو اس امر پر محمول کرتی تھیں کہ فالج دہنی طرف پڑا تھا۔ لیکن میں تو ان کے عُمدہ قُویٰ
کی طرف اس کو منسوب کرتا ہوں۔

بعض اشخاص نے تو یہ بھی بیان کیا کہ حقیقت میں اُن کو فالج سے صحت کُلّی ہوگئی تھی لیکن اس خیال سے
کہ لوگ زیادہ ستائیں نہیں انھوں نے شہرت دے رکھی تھی کہ وہ شکایت ابھی تک کچھ نہ کچھ چلی ہی جاتی ہے۔

مدارج عُمر کے تغیرات سے انسان کے خیالات بھی بدلتے جاتے ہیں۔ لیکن یہ تغیرات بالکل دفعتہً
نہیں آتے۔ ان کے زندہ عزیز بیان کرتے ہیں کہ یہ میلے ٹھیلے میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ یہ ہمیں بھی تسلیم ہے
لیکن اس سے ایسا نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کبھی شریک ہی نہیں ہوئے۔ اُن کی تحریریں بکثرت موجود ہیں جن سے
ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے اس قسم کی احتیاط اوائل میں کبھی مرعی نہیں رکھی۔ البتہ اخیر عُمر میں جب کہ
اتقاو پرہیزگاری کے خیالات بڑھنے لگے تو اس قسم کی احتیاط بتقاضائے عُمر بلا قصد بھی اُن سے عمل میں
آتی ہوگی۔ جب فالج نے پانو توڑ کر گھر میں بٹھا دیا اُس وقت تو زیادہ تر

	عصمتِ بی بی ست از بے چادری

کی راہ سے پرہیزگاری ہوگی۔

اخیر عُمر کی احتیاطوں میں لوگ یہاں تک مبالغہ کرتے ہیں کہ اگر شاذ و نادر طوائف کا کپڑا کپڑے سے مس ہوتا
تھا تو اُس کو طاہر کراتے تھے ایسی صورت میں وہ رقص و سرود کیا دیکھتے لیکن بزم عیش میں وہ اکثر ہمیں نازنینوں
سے پہلو بہ پہلو ملے ہیں طرزِ تقریر بھی اس باب میں ساکت نہیں۔

ان کی اخیر عُمر کی احتیاط میں ایک بات یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ بمضمون فلیضحکوا قلیلا ولیبکوا کثیرا اگر ہنستے

تھے تو مسکراہٹ سے ہنستے تھے۔ زور سے نہیں ہنستے تھے۔ اور بخیال ان انکر الاصوات لصوت الحمیر باتیں کرتے تھے تو نہایت آہستگی سے متوسط اور ملائم آواز میں۔

عادتیں بھی جو ان کی بیان کی جاتی ہیں بالکل ثقہ لوگوں کی سی ہیں۔ ناس کبھی نہیں لیتے تھے۔ کوئی نشہ نہیں پیا۔ نہ افیون کھائی۔ صرف حقہ پیتے تھے اور کثرت سے پیتے۔ نظیر کی نواسی نے کہا سلفہ پیتے تھے۔ بہادر علی صاحب یوں فرماتے ہیں جست کی گڑگڑی میں نہ سلفا بلکہ تواتکیا بھر وا کر۔ شاید اس سے فکر سخن میں مدد ملتی ہو۔ پان کبھی کھالیا تو کھالیا ورنہ عادت نہ تھی۔ منہ میں دو ہی تو ڈاڑھیں باقی رہ گئی تھیں۔ پس مستانہ نظموں سے نشہ خواری کا مضمون جو ناشی ہوتا ہے وہ یا تو عالم جوانی سے متعلق ہوگا یا محض نقش و نگار ورق الخیال ہے۔

عبادت کی طرف بھی طبیعت کا جس عنوان سے میلان ہے اس سے کسی فسق و فجور کا کسی زمانے میں گمان نہیں ہو سکتا ہے۔ نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ رمضان شریف تشریف لاتے ہیں تو روزے بھی رکھتے ہیں اور جب تک خوب طرح تارے کی بھیں نہیں جاتی ہم سنیوں کی طرح گھبرا کر افطار بھی نہیں کرتے۔ عید بقرعید میں نماز گھر ہی میں پڑھتے تھے۔ سب عید ملنے کو آتے تھے۔ نماز روزے کے ساتھ قرآن بھی تلاوت کرتے تھے۔ آنکھوں میں مرتے دم تک روشنی تھی۔ کبھی عینک کی حاجت نہ ہوئی۔ قرآن بھی بے عینک پڑھتے تھے باایں ہمہ چون کہ تسبیح میں ایک طرح کا ریا تھا اس لیے تسبیح کبھی ہاتھ میں نہ رکھی چوں کہ طریقہ امامیہ تھا اپنے مذہب کے مطابق تعزیہ داری بھی کرتے تھے۔ پچاس دن تک تعزیہ داری کرتے تھے۔

کھانے کو جوانی میں تو سب چیز کھاتے ہوں گے۔ مگر بڑھاپے میں میٹھے چانول اور کھچڑی نہایت شوق سے کھاتے تھے اور بہت پسند کرتے تھے۔ گھی آدھ سیر روز کھاتے تھے۔ اچاروں میں لیموں کا اچار بہت پسند تھا۔

تیل کا اچار کبھی نہیں کھاتے - گلگلے اور چیلے بھی پسند کرتے تھے - پھلوں میں خربزہ - آم - شریفہ یہ تین
پھل بہت مطبوع تھے -

حالاتِ نظیر کو خلافِ توقع اس قدر طول ہوا کہ اب لوگ گھبرا گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس طرح ہو جلد سلسلہ
ختم ہو - وقت طول میں ہے نہ اختصار میں اگر اختصار درکار ہے تو بسم اللہ ابھی لیجیے - فالج کا قصہ تو آپ کو مکرر سہ کرر
معلوم ہی ہو چکا ہے - اس مرض نے نظیر کو خلافِ طبیعت خلافِ عادت پانچ برس سے خانہ نشین کر دیا تھا کہیں
آتے جاتے نہ تھے - دن رات گھر ہی میں پڑے رہتے -

بہت بڑا سفر یہ تھا کہ دالان سے صحن میں چلے آئے صحن میں جانب شمال بیچ میں دو درخت نیم اور بیری کے
لگے ہوئے تھے - یہ درخت اب بھی قائم ہیں جو ان کی قبر پر سایہ کرتے ہیں - انھی درختوں کے سایے میں بوریا
بچھا کر بیٹھ جاتے - مرزا نوازش علی کی روایت ہے کہ کبھی پلنگ پر نہیں بیٹھتے تھے -

اکثر اہل اللہ سمجھ کر آزاد بینوا اِن کو گھیرے رہتے - ان کے سوا کبھی کوئی صاحب ملنے کو بھی آ جاتے - یہ دو درخت
گویا ان کے دو ڈرائنگ روم تھے - یہیں وہ زیادہ ملتے - اور لوگ بیان کرتے ہیں کہ انھی دو درختوں کے نیچے
اُنھوں نے انتقال بھی کیا - اور انھی کے نیچے دفن بھی ہیں - جہاں زندگی میں لوگوں سے ملتے تھے وہیں بعد موت
بھی لوگ اُنسے شرفِ زیارت حاصل کرتے ہیں -

ان کی تجہیز تکفین کا جھگڑا اوپر تبقاریب لکھا جا چکا ہے - میاں نظیر جب مر گئے تو ہندو شاگردوں نے چاہا
کہ اپنے طور پر اُن کی موت پر اظہارِ تاسف کریں - نظیر کے خاندان کے لوگوں نے کچھ مخالفت کرنی چاہی تو ان
ہندوؤں نے کہا اگر مخالفت کروگے گرو نانک شاہ کا حال ہوگا کہ نصف چادر مسلمانوں نے دفن کی تھی اور نصف
جلائی گئی تھی - اس تقریر پر وارثوں نے تعرض چھوڑ دیا اور اُن کو اپنے طور پر مرحوم نظیر کی صُلح کُل کا خراج

ادا کر دیا۔

جب نظیر کا انتقال ہوا کئی ہزار آدمی ہند و مسلمان جمع تھے۔ چوں کہ اُن کا مذہب اثنا عشری تھا بڑی دھوم سے نماز جنازہ حسب مذہب اثنا عشری پڑھائی گئی۔ گر دو نمازیں ہوئیں جس قدر اُن کے شاگرد اہل سنت تھے اُنھوں نے الگ اپنا گروہ کر کے نماز پڑھی اور اوپر کی چادر اُن کی پارچہ پارچہ کر کے اہل ہنود لے گئے۔ نہیں معلوم ہندو شاگردوں نے پارچے رکھے بلائے کیا کیے۔

شاگردوں نے اُن کی قبر سنگیں بنوائی۔ ہندو شاگردوں نے سوم کے دن مزار پر میلا کیا۔ ناچ رنگ اور شعر خوانی ہوئی اور غلام رسول کی مسجد میں اُن کے پھول ہوئے۔

میلا سال کے سال اب بھی ہوتا ہے۔

جب شاگردوں کا یہ جوش و خروش تھا تو یہ تو کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی موت کی تاریخیں نہ کہی ہوں گی لیکن اب نہیں ملتیں۔ قبر گو پکی ہے۔ مگر لوح مزار کا کہیں پتا نہیں۔ ہو گی تو ضرور مگر امتداد زمانہ کی وجہ سے اب لوح طلسم کی طرح نظروں سے غائب ہے۔ میں نے اُس کی تلاش صرف قطعۂ تاریخ کے خیال سے کی۔ لوح تو نہ ملی مگر قطعۂ تاریخ کے دو مصرعے ابتدا اور اخیر کے ہاتھ آ گئے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ یہ مادّہ تاریخ نظیر کے کسی شاگرد کا نکالا ہوا ہے اور اچھا ہے۔ اِس میں صاف صاف شاہ عبدالعزیز کی تاریخ وفات کی جھلک پائی جاتی ہے جو مومن خاں نے ۱۲۳۹ھ میں نظیر کی وفات سے کوئی سات برس پیشتر نکالی تھی۔

قطعۂ تاریخ شروع یوں ہوتا ہے:۔

	نظیر اکبرآبادی چو زیں دنیائے ابتر شد	

اِس کے بعد حسب معمول غالباً نظیر اکبرآبادی کے اوصاف جمیلہ ہوں گے۔ منکسر، متواضع۔ خاضع خاشع۔

لطیفہ گو۔ بذلہ سنج۔ زندہ دل۔ مرنجاں مرنج۔ بحرِ فصاحت کے تیراک۔ بے ہمہ باہمہ آزاد۔ بے باک وغیرہ وغیرہ۔ اور اِس جاں نواز نگورے کی تان ہاتف سروش، رضواں، روح القدس، لسان الغیب کے زمزموں سے بلکہ آخراس مصرع پر ٹوٹی ہی مصرعۂ تاریخی ہی:۔

مخمس بے سروپا بیت بے دل فرو بے سرشد

یہ مادۂ تاریخ مجھے بروایتِ منشی برج لال پہونچا ہی جو اکبر آباد کے باشندے اور قوم کے کھتری ہیں۔ یہ اپنے تئیں نظیر کا شاگرد بھی بتاتے ہیں۔ اس تاریخ سے ۱۲۴۶ھ نکلتے ہیں۔ بیل صاحب جنھوں نے انگریزی میں ایشیائی شعرا کا مختصر تذکرہ لکھا ہی اُسمیں تاریخِ وفات بدیں تفصیل درج ہی۔ روز دوشنبہ ۲۶ صفر ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۶۔اگست ۱۸۳۰ء۔ ڈپٹی تراب علی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ ۱۲۴۳ھ میں مرا میر تقی مرحوم سے ۲۲ برس بعد۔ دوسرا جزو قریب قریب صحیح ہی مگر جزو اوّل غلط۔

نظیر کے اخلاق

نظیر کے اُس کلام کو چھوڑ کر جس میں کسی قدر اُسنے اپنی چلبلی طبیعت سے زیادہ آزادی کے ساتھ کام لیا ہی اور جو شاید اُس کی ابتداے جوانی کا کلام ہی اُس کے ہر فقرے سے اُس کا ایک نہایت ہی شستہ اخلاق، اور مہذب اطوار کا آدمی ہونا ثابت ہوتا ہی۔

وہ شخص کیونکر بخیل ہو سکتا ہی جس کے یہ خیالات ہوں:-

زر کی جو محبت تجھے پڑجاے گی، بابا
ہر کھانے کو ہر پینے کو ترسائے گی، بابا
دُکھ اُس میں تری روح بہت پاے گی، بابا
دولت جو ترے یاں ہی نہ کام آے گی، بابا
پھر کیا تجھے اللہ سے ملواے گی، بابا

دولت جو ترے پاس ہی، رکھ یاد تو یہ بات
دینے سے اِسی کے ترا اونچا رہے گا ہات
کھا تو بھی اور اللہ کی کر راہ میں خیرات
اور یاں بھی تری گزریگی سو عیش سے اوقات
اور واں بھی تجھے سیر یہ دکھلاے گی، بابا

داتا کی تو مشکل کوئی اٹکی نہیں رہتی
اور تو نے بخیلی سے اگر جمع اسے کی
چڑھتی ہی پہاڑوں کے اوپر ناؤ سخی کی
تو یاد یہ رکھ بات کہ جب آوے گی سختی
خشکی میں تری ناؤ یہ ڈبواے گی، بابا

دولت جو ترے گھر میں ہی اب جھولی ہی جوں پھول
مردود بھی یہ کرتی ہی، اور کرتی ہی مقبول

سخاوت

جو چاہے ترے ساتھ چلے یاں سے یہ مجہول — زنہار، خبردار رہو، اِس بات پہ مت بھول
یہ خندیؔ ترے ساتھ نہیں جاے گی، بابا

اِس سے یہی بہتر ہے تو ہی آپ اسے کھا جا — بیٹوں کو، عزیزوں کو، رفیقوں کو کھلا جا
سب روبرو اپنے اسے عشرت میں اُڑا جا — پھر شوق سے ہنستا ہوا جنت کو چلا جا
ورنہ تجھے ہر دُکھ میں یہ پھنسواے گی، بابا

یہ تو نہ کسی پاس رہی ہے نہ رہے گی — جو اَوروں سے کرتی رہی وہ تجھ سے بھی کریگی
کچھ شک نہیں اس میں جو بڑھی ہے سو گھٹے گی — جب تک تو جیے گا تجھے یہ چین نہ دے گی
اور مرتے ہوے پھر یہ غضب لاے گی، بابا

جب موت کا ہوویگا تجھے آن کے دھڑکا — اور نزع تری آن کے دم دیویگی بھڑکا
جب اُسمیں جو اٹکے گا، نہ دم نکلے گا پھڑکا — گھٹنوں میں رو پڑ ڈال کے جب دیوینگے کھڑکا
تب تن سے تری جان نکل جاے گی، بابا

تو لاکھ اگر مال کے صندوق بھرے گا — ہے یہ تو یقیں آخرش اک دن تو مرے گا
پھر بعد ترے اِس پہ جو کوئی ہاتھ دھرے گا — وہ ناچ مزا دیکھے گا، اور عیش کرے گا
اور روح تری قبر میں چلاّے گی، بابا

اُسکی تو وہاں ڈھولک و مردنگ بجے گی — اور روح تری قبر میں حسرت سے جلے گی
وہ کھاویگا، اور تیرے تئیں آگ لگے گی — تا حشر تری روح کو پھر کل نہ پڑے گی

سلہ خندی بیہودہ ہنسنے والی عورت بے حیا بے غیرت قحبہ فاحشہ۔

ایسا یہ تجھے گور میں تڑپائے گی، بابا

جاویگا تری گور کی جانب جو وہ ناگاہ
ساقی و صراحی و پریزاد کے ہمراہ
رونا مجھے آتا ہی ترے حال پہ واللہ
جب دیکھے گا سو عیش میں تو اُسکے تئیں آہ
کیا کیا تری چھاتی پہ یہ لہرائے گی، بابا

تو بھوت ہو چھاتی پہ اگر آن چڑھے گا
تو واں بھی ترے واسطے عامل کوئی بُلوا
شیشے میں اُتروا کے تجھے دیویں گے گڑوا
یا خوب سا سا گا کے کوئی ہار فلیتا
دھونی بھی تری ناک میں دلوائے گی، بابا

گر ہوش ہی تجھ میں، تو بخیلی کا نہ کر کام
اِس کام کا آخر کو بدی ہوتا ہی انجام
تھوکے گا کوئی کہہ کے، کوئی دیوے گا دُشنام
زنہار نہ لے گا کوئی ہر صبح ترا نام
پیزاریں ترے نام پہ لگوائے گی، بابا

کہتا ہی نظیر اب جو یہ باتیں تجھے ہر آن
گر مرد ہی عاقل تو اِسے جھوٹ تو مت جان
ٹک غور سے کر گنج پہ قاروں کے ذرا دھیان
جیسا ہی اُسے اِسنے کیا خوب پریشان
ویسا ہی مزا تجھ کو بھی دکھلائے گی، بابا

اُن کی نواسی نے مجھ سے بیان کیا کہ "نانا جان بڑے ہی سخی مزاج کے آدمی تھے۔ اُنھوں نے تمام عمر اپنے ہاتھ سے روپیہ نہیں چھوا۔ جہاں کہیں سے روپیہ آیا۔ روپیہ لانے والے سے کہا کہ اِس کو رومال میں باندھ دو

سلہ میں مدح نظیر اب جو بنا تا ہوں ہمیشہ ✽ دولت ہی کا انعام میں پاتا ہوں ہمیشہ ✽ کھاتا ہوں، کھلاتا ہوں، لُٹاتا ہوں ہمیشہ ✽ خیرات اُسی در سے میں پاتا ہوں ہمیشہ ✽ جاری ہی سدا میرے شہنشاہ کا باڑا ✽ (خیبر کی لڑائی کا اخیر بند)

پھر اُس رومال کا ایک سرا پکڑ کر جیسے کوئی نجس چیز ہو گھر میں ڈال جاتے، یا کسی آدمی سے کہتے کہ گھر بھجوا دو۔ نانی کا جس طرح جی چاہتا خرچ کرتیں۔ وہ پوچھتے بھی نہیں کہ کیا ہوا۔ اور کدھر گیا۔"

نظیر کی سیر چشمی اس سے بھی ثابت ہوتی ہی کہ اس کو مختلف ریاستوں سے بُلاوا آیا لیکن وہ نہ گیا۔ پہلے تو لکھنؤ[1] کے نواب نے بُلایا۔ غالباً اُس وقت میں سعادت علی خاں کا زمانہ ہوگا۔ وہ شُعَرا اور اہلِ علم کا بڑا قدردان تھا اپنی عام قدردانی کے تقاضے سے اس نے نظیر کے پاس ایک قاصد بھیجا کہ تُمھارے کلام کی شہرت نے ہمہ تن تُمھارا مُشتاق بنایا ہی۔ میرے دربار کو اپنی تشریف آوری سے زینت بخشو۔ قاصد کے ساتھ کچھ روپیہ بھی بھیجا تھا بعض کہتے ہیں تین ہزار تھا۔ بعض دو سو۔ بہرحال جتنا ہو، قاصد نے نظیر کے پیش کش کیا۔ نظیر نے لے کر گھر میں رکھا اور قاصد سے کہا میں اس کا جواب کل دوں گا۔ روپے کے کھٹکے سے اس کو رات بھر نیند نہ آئی۔ صبح کو آکر اُس نے قاصد سے کہا "بھائی یہ روپیہ تو بڑے ہی بکھیڑے کی چیز ہی۔ چور کے ڈر کے مارے میری تو رات بھر ادھیڑبن میں گزری کہ نیند حرام ہوگئی، سو مجھ کو ایسی چیز لینی منظور نہیں۔ آرام سے اپنا سوتا ہوں اور شکرِ خُدا بجا لاتا ہوں۔ اپنی ایسی عمدہ عافیت کو میں اتنے روپے کے لیے بیچ نہیں سکتا۔"

حافظ انور خاں[2] سے یہ روایت یوں سُنی گئی کہ مشہور ہی کہ لکھنؤ نے ان کی طلب میں بادشاہِ وقت کی طرف سے ایک قاصد دو سو روپیہ لے کر آیا تھا۔ بعض اس مقدار کے بیان کرنے میں مبالغہ بھی کرتے ہیں۔

---

[1] مجید حسن کاتب مفیدِ عام نے کہا "نظیر کو واجد علی شاہ نے بلا بھیجا تھا۔ تین ہزار روپے بھی بھیجے تھے۔ رات بھر ان کے گھر میں روپیہ رہا۔ اُس تردد سے ان کو نیند نہ آئی۔ انھوں نے کہا ادنیٰ تعلق سے تو یہ ترددات ہیں۔ جب پورا تعلق ہوگا خدا جانے کیا حال ہوگا۔ کم بخت کو پھینکو۔ یہ کہکر روپیہ واپس کیا اور نہ گئے۔ مجذوب سے آدمی تھے۔"

[2] یہ ایک نابینا حافظ ہیں۔ آگرہ ان کا وطن ہی۔ ہر سال رمضان میں تراویح پڑھانے عظیم آباد تشریف لاتے ہیں۔ نیک با خُدا آدمی ہیں سن ساٹھ سے متجاوز ہوگا۔ نظیر کے اکثر شعر ان کو یاد ہیں۔ چنانچہ جن دنوں یہ صدر گلی میں وارد تھے پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروروں پنڈت ہزاروں سیانے والی نظم انھوں نے پوری بھی مجھے پڑھ کر سُنائی تھی۔ اور وہیں نظیر کے بعض حالات بھی بیان کیے تھے۔

آدمی جب اِن کے مکان کے قریب آیا تو نظیر راستے میں ٹہل رہے تھے۔ آدمی نے اِن سے پوچھا نظیر کا مکان کون سا ہی۔ انھوں نے کہا سیدھے چلے جائیے۔ نوابِ باندہ کے مکان کے پہلو میں ایک مختصر سا مکان ہی جس کے صحن میں نیم اور بیری کے دو درخت ہیں بس وہی اُن کا مکان ہی۔ وہ جب اِن کے مکان پہ پہنچا تو ڈیوڑھی پر جاکر آواز دی۔ اندر سے جواب ملا کہ وہ کہیں سدھارے گئے ہیں۔ اتنے میں ٹہلتے ٹہلتے میاں نظیر بھی آن پہنچے۔ جب قاصد پر ظاہر ہوا کہ نظیر یہی ہیں تو اُس نے شکایت کی کہ آپ نے مجھے دھوکے میں رکھا۔ پھر بڑے تپاک سے ملا اور بعنوانِ معقول اپنے پادشاہ کا پیام دیا۔ نظیر نے کہا میں اپنے مالک سے پوچھ لوں۔ ایک شب کی مجھے مُہلت ملے۔ دوسرے دن خوف زدہ صورت بنائے ہوئے پہنچے کہ صاحب بیجیے میں تو اپنے مالک کے ہاں سے بہت ہی ڈانٹا گیا کہ ایک آدمی، دو دو کی نوکری۔ تو آپ اپنا روپیہ لیجیے اور مجھے معاف کیجیے۔ اِس حکایت میں کسی قدر صوفیانہ رنگ زیادہ گہرا ہوگیا ہی۔ عجب نہیں کہ خوش عقیدہ لوگوں نے خانقاہی مجلسوں کے گرم کرنے کے لیے کچھ تصرف کیا ہو۔

اُن کی نواسی نے اِس حکایت کو نہایت سادگی سے اِن الفاظ میں بیان کیا۔ میں نے پوچھا دو لکھنؤ سے اِن کو کوئی بلاوا آیا تھا؟ انھوں نے کہا "ہاں، وہاں کے نواب نے بلا بھیجا تھا۔ لیکن انھوں نے کہا میں ماشا بھر کا قلم ہلانے والا، میاں کدھر جاؤں۔ امیروں کے لائق کہاں ہوں۔ یہی کہہ کر ٹال دیا اور نہ گئے۔"

غرض جو کچھ ہو اِس حکایت سے اِن کی استغنا اور سیر چشمی ثابت ہوتی ہی۔

حافظ انور خاں نے بیان کیا کہ ایک روایت ہی کہ بھرت پور سے بھی اِن کی طلب آئی تھی۔ وہاں کے راجہ نے بلا بھیجا تھا۔ بعض کہتے ہیں گئے۔ اور بعض کہتے ہیں نہیں گئے۔ قولِ اوّل کے مطابق آگے سلسلۂ بیان

یوں ہے کہ جب بھرت پور پہنچے تو راجہ نے بڑے تکلف کے ساتھ ان کے لیے مکان فرش فروش سے آراستہ کروا اور بیس روپیہ ان کی تنخواہ کی انھوں نے کہا فرش تو اُٹھوا دیجیے مجھ کو صرف ایک بوریا درکار ہے۔ اور بیس روپے کیا ہوگے میری حاجت کو پانچ روپے بہت ہیں۔

اِس حکایت کی میاں نظیر کی نواسی کے بیان سے تصدیق نہیں ہوتی۔ اُنھوں نے بیان کیا کہ شہر کے باہر فقط اُنھوں نے متھرا میں اوائلِ عُمر میں نوکری کی تھی۔ اور وہ بھی پڑھانے ہی کی۔ اُس کے بعد اُنھوں نے باہر کہیں نوکری کی ہی نہیں۔

ایک حکایت ان کی استغنا اور سیرچشمی کی خود ان کی نواسی کی زبانی معلوم ہوئی۔ اور چوں کہ یہ حکایت ابتداے عمر کی ہے اس سے ایسا یقین ہوتا ہے کہ یہ مادہ ان میں فطری طور پر ودیعت تھا۔ اُنھوں نے بیان کیا کہ ان کے والد جن کا نام محمد فاروق تھا عظیم آباد میں نوکر تھے۔ کوئی نواب صاحب تھے اُن کے ہاں مصاحب تھے۔ جب اُنھوں نے قضا کی تو نواب صاحب نے میاں نظیر کو لکھ بھیجا کہ آپ کے والد نے قضا کی۔ تقدیرِ الٰہی سے کوئی چارہ نہیں صبر کیجیے۔ مال جو وہ چھوڑ گئے ہیں اُس پر تالے ڈلوا دیے ہیں۔ آپ اُن کے وارث ہیں۔ آیئے اور آن کرلے جائیے۔ میاں نظیر نے لکھ بھیجا کہ "میں باشے بھر کے قلم کا ہلانے والا اتنے مال کے لیے کہاں کہاں مارا پھروں۔ آپ سب مال کو لے کر وہیں خیرات کر دیجیے۔"

سخاوت و عشرت کے بیان میں یہ بند بھی اُن کی جبلّی فیّاضی کو ظاہر کرتے ہیں :۔

نر ردار ہے تو ہر گز مت مارا اپنے من کو	تن زیب و تن سکھوں سے ترسا نہ اپنے تن کو
جو نر چلن چلیں چل تو بھی اُسی چلن کو[۱]	مُرشد کا ہے یہ نکتہ، رکھ یاد اِس سخن کو

[۱] نر مرد کو کہتے ہیں۔ یہاں مردانِ راہِ طریقت مراد ہیں۔

دل کی خوشی کی خاطر چلکھ ڈال ہال دھن کو
گر مر رہی تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جا بیٹھ میکدوں میں سب درد و غم سے ہٹ کر
محبوب دلبروں سے خوش ہو لپٹ لپٹ کر
جھمکا[۵۱] گلابی، مے کی پیالی الٹ پلٹ کر
پی دودھ اور بتاشے[۵۲] میوہ مٹھائی چٹ کر

دل کی خوشی کی خاطر چلکھ ڈال ہال دھن کو
گر مر رہی تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

نعمتیں ہیں جتنی جو کچھ ملے سو کھا جا
پاپی[۵۵] بخیل مت بن، داتا[۵۶] سخی کہا جا
تاش[۵۳] اور بادلے[۵۴] میں یک بار جگمگا جا
اک دم تو اپنا ڈنکا من مانتا بجا جا

دل کی خوشی کی خاطر چلکھ ڈال ہال دھن کو
گر مر رہی تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

صندوق میں جو زر ہی اس کو بھی لے گنوا دے
کوٹھے، مکان، حویلی سب کھود کر کھلا دے
مے کے بہا کے نالے، طبلوں کو کھڑکھڑا دے
کڑیوں تلک جلا دے اینٹوں تلک اڑا دے

دل کی خوشی کی خاطر چلکھ ڈال ہال دھن کو

۵۱ جھمکانا چمکانا جھلکانا۔
۵۲ بتاسا اور بتاشا دونوں صحیح ایک قسم کی شیرینی جو بشکل حباب ہوا بھر کر بنائی جاتی ہے۔
۵۳ تاش ایک قسم کا زری کا کپڑا جس کا تانا ریشم کا بانا بادلے کا ہوتا ہے۔ زربفت۔ بادلہ۔ تمامی۔
۵۴ بادلہ زری کا کپڑا جو ریشم اور چاندی کے تاروں سے بنا جاتا ہے۔ تمامی۔ زری۔
۵۵ پاپی۔ کنجوس بخیل ممسک خسیس کنک دنی۔
۵۶ داتا دینے والا جواد سخی فیاض داتا پن کرے کنجوس جھر جھر مرے۔

گر مرد ہی تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جو جو بخیل کتنی زر چھوڑ کر مرے گا — یا کھاوے گا جنوائی[۱]، یا خالصے[۲] لگے گا
تیرا وہی ہی جو کچھ راہِ خدا میں دے گا — کھاتا، کھلاتا، ہنستا تو ہی سدا رہے گا

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہی تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

گر آپڑے گا تجھ پر کچھ حادثہ خلل کا — مالک پھر اور کوئی ٹھہرے گا تیرے دل[۳] کا
آگے سے دے دلا کے ہو رہ تو اس سے ہلکا — کر فکر اپنے دل میں کچھ آج کا، نہ کل کا

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہی تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جس نے یہ زر دیا ہی پھر وہ ہی دھن بھی دے گا — مال و مکاں حویلی، باغ و چمن بھی دے گا
جیتا رہے گا جب تک کھانے کو ان[۴] بھی دے گا — مر جاوے گا تو وہ ہی تجھ کو کفن بھی دے گا

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہی تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جتنے گڑے دبے ہیں سب کھالے اور کھلا لے — رکھ دھن ابھی کی دل میں اب کھالے اور کھلا لے

[۱] جنوائی بیٹی کا خاوند داماد۔
[۲] خالصے لگنا ضبط ہونا۔ بے وارثا قرار پا کر سرکاری ملکیت میں داخل ہونا۔ رائگاں جانا۔
[۳] دل فوج لشکر انبوہ۔
[۴] ان دانہ اناج غلہ گیہوں چنا وغیرہ غذا خورش ادھار۔

اپنا سمجھ اُسی کو جب کھالے اور کھلالے		اب تو نظیر تو بھی سب کھالے اور کھلالے
	دل کی خوشی کی خاطر، چلکھ ڈال ہال دھن کو گر مر دہی تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو	

ابو القاسم میر قدرۃ اللہ قادری اپنے تذکرے میں، جس کی تاریخ اتمام ۱۲۲۱ھ ہے، لکھتے ہیں کہ شیخ ولی محمد اکبرآبادی شاعرے ہست دیرینہ مشق کہ بالفعل دراں نواح علمِ استادی مے افرازد و نردِ محبت واخلاص باہرکس مے بازد۔ بسیار سلیم الطبع وخوش اختلاط و بہایت نیک طینت و متحمل انبساط شنیدہ مے شود۔ بمعلمی اوقات گزاری مے کند و بکشادہ پیشانی ایامِ زندگی بسر مے برد۔

اخلاق نظیر کے متعلق اس عبارت سے اتنے مضامین نکلتے ہیں کہ میاں نظیر محبت کے بڑے پکے تھے۔ جس شخص سے ملتے تھے خلوص کے ساتھ ملتے تھے۔ اور دوستی اور محبت کے حقوق کی بڑی رعایت کرتے تھے۔ کسی شخص کے ساتھ اُن کو عداوت اور رنجش رکھتے نہیں سُنا گیا۔ مرنجاں مرنج کی حکمت عملی کو پوری طرح برتتے تھے۔ صُلحِ کل کے وسیع کرے میں ہر شخص سے دل کھول کر ملتے تھے۔ مزاج میں خوش طبعی بھری ہوئی تھی۔ جس مجلس میں ہوتے تھے اِن کی باتوں سے لوگوں کے چہروں پہ گلدستے کھل جاتے تھے۔ طبیعت نہایت سلیم واقع ہوئی تھی۔ نادر نادر لطیفے اور اچھوتے اچھوتے چٹکلے اُن کی زبان سے سُننے میں آتے تھے۔ طینت میں کسی قسم کا فساد نہ تھا۔ نیکی خمیرِ مزاج میں داخل تھی[1]۔

میاں نظیر کی نواسی اور اُن کے داماد میرزا نوازش علی کے بیان سے معلوم ہوا کہ حضرت بچوں کے ساتھ بہت

---

[1] نظیر خود حمدِ الٰہی والی نظم میں صفاتِ انسانی کی تصریح کرتے ہیں:۔
خصوصاً بنی آدمِ خوش لقا ٭ شرف اُن سبھوں میں انھی کو دیا ٭ ہوا اسلام و ایمان و دینِ قدیم ٭ عطا کی انھیں دولتِ معرفت ٭ عبادت، اطاعت، نکو منزلت ٭ حیا، حُسنِ الفت، ادب، مصلحت ٭ تمیز و سخن، خلقِ خوش، مکرمت۔

محبت کرتے تھے - بچے اُن کو گھیرے رہتے تھے اور اُن سے یہ ہنستے بولتے تھے اور اُن کے بہلانے کو بہت سی دل لگی کی باتیں کیا کرتے تھے - اِن کے مکان کے آس پاس محلے بہت آباد ہیں - اُن کے بچے اُن کو آن کر گھیر لیا کرتے تھے - اُن کی خاطر سے اکثر یہ کچھ تفریح کی نظمیں بھی لکھ دیا کرتے تھے مثلاً بیا - ریچھ کا بچہ وغیر ذٰلک

میاں نظیر کی نواسی کہتی تھیں کہ نانا کی زندگی میں مَیں بہت ہی چھوٹی تھی - جب کبھی گھر آتے اور میں اُن کے پاس جاتی تو مجھ کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے اور گانے لگتے:-

"موہن میرے آئے، للن میرے آے، کنجن میرے آے"

ایسی محبت کرتے تھے کہ اِس قسم کی محبت کرتے میں نے تو کسی بزرگ کو نہیں دیکھا -

چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی میاں نظیر کو سلام کرتا تھا تو دونوں ہاتھوں سے اُس کا جواب دیتے تھے -

ایشیائی شعرا میں ہجو کا مرض عام ہی - عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں عمائد شعرا نے ہجو سے اپنے کلام کو ناپاک کیا ہی - متنبی کا وہ شعر مشہور ہی:-

اسامرّی ضحکۃ کل را ؟	فطنت وانت اغبی الاغبیاء

فردوسی کے یہ دو شعر محمود کی ہجو میں کس فارسی کے طالب علم کی زبان پر نہیں:-

پرستار زادہ نیاید بکار	اگر چہ بود زادہ شہریار
اگر مادرِ شاہ بانو بدے	مرا سیم و زر تا بزانو بدے

انوری کا کلام بھی ہجو سے خالی نہیں - خاقانی نے تو ہجو کی انتہا کر دی ہی کہ اپنے سُسرے ابو العلاء گنجوی سے اُلجھ پڑا - اور انتہا سے زیادہ رکیک مضامین اُس کی شان میں نظم بند کیے -

اُردو کے شعرا میں سودا مسلم الثبوت اُستاد ہی - جہاں اُس کو قصائد کا امام مانا جاتا ہی ہجو کا بھی

لوگ پیشا ا سمجھتے ہیں - اتنی ہجو شاید کسی شاعر کے قلم سے نہیں نکلی - میر حسن کے باپ ضاحک کی ہجو اس نے کی :-

ریم سوتا اک پدر ہی تو سشریر	رحم مادر سے اُلٹ نکلا ہو میر

میر کی ہجو اس نے کی - فدوی کی ہجو اس نے کی - مرزا علی کی ہجو اس نے کی - سیدی فولاد خاں کوتوال شاہجہاں آباد کی ہجو اس نے کی - مرزا فیضو کی چیچک کی ہجو اس نے کی - غرض جس سے ذرا رنجش ہوئی اُس کی ہجو کہہ رکھ دی -

جُرأت اور کربلا بھانڈ کے مقابلے مشہور ہیں - جرأت کے اُس دندان شکن جواب سے کون واقف نہیں جس کا اخیر شعر یہ ہے :-

نی بگڑتا ہے نہ سنورتا ہے	باپ کی اپنے نقل کرتا ہے

مصحفی اور انشا کے ہجو یہ معرکے زبان زد خلائق ہیں (مزہ یہ تھا کہ اس قسم کے معرکے جب ہو چکتے تو پھر بعد میں دلوں میں کسی قسم کی کدورت باقی نہیں رہتی تھی - الحمد للہ کہ اب غیرت کا معیار کسی قدر بلند ہو گیا ہے)

باوجودے کہ نظیر اُسی زمانے کے شعرا میں ہے جب کہ ہجو کوئی معیوب بات نہ تھی - بلکہ یوں کہیے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ قریب قریب ہجو ایک خاص فن کلام قرار پا گئی تھی جس پر شعرا طبیعت آزمائی کرنی ایک ضروری فریضۂ شاعری جانتے تھے - علاوہ بریں خود نظیر شوخی طبع سے عاری نہیں - مزاج میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی - بات بات میں چوچلا تھا - اور لفظ لفظ پر چٹکلا - لیکن پھر بھی اُس نے اپنی خاص عالی ظرفی سے کسی کی ہجو سے اپنی زبان کو آشنا نہیں کیا - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کا مزاج کینے

سے پاک تھا۔ وہ کسی کی عداوت کو دل میں پرورش نہیں کرتا تھا۔ جس سے کچھ رنجش ہوئی۔ بس اُسی وقت تک رہی۔ جب وقت نکل گیا۔ پھر اُس کا خیال بھی نہیں۔ اُس کا مزاج بہت ہی پاک و صاف واقع ہوا تھا۔ کسی کی بدسلوکی اس کو بہت زیادہ دیر تک ملول نہیں رکھتی تھی۔ دریا میں جیسے ایک چھوٹی سی کنکری کے گرنے سے تغیر پیدا ہو بس کچھ اُسی قسم کا تغیر خلافِ مزاج باتیں اُس کی خوشی کی روانی میں پیدا کرتی تھیں۔ اُن کی آن میں وہ تغیر طبیعت کی بڑی اور زبردست موجوں کے تھپیڑے کھا کر فنا ہو جاتا تھا۔ پس ہجو کی لہر دل میں پیدا ہوتی تو کہاں سے ہوتی۔

اہلِ دنیا کی مدحت

مداحی بھی ایشیائی شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ خلفاے عباسیہ کے صلوں نے شعراے عرب کو مداحی کی چاٹ دلائی۔ سلاطینِ فارس کے انعاموں نے شعراے عجم کو اس کی چاشنی سے آگاہ کیا۔ کم اولوالعزم بادشاہ ہوں گے۔ جن کے دربار میں ایک شاعر باسمِ ملک الشعرا صرف اس خدمت پر نہ مامور رہا ہو کہ ہر خوشی کی تقریب میں عمدہ عمدہ قصائد میں نئی نئی تمہیدوں سے اُن کے اوصاف جھوٹ سچ بیان کرے۔

عروج کے زمانے میں ہندوستان میں بھی سلاطینِ اسلام نے مدحت خواہی اور جائزہ بخشی کے میدان میں بہت زمانے تک اپنے عجمی ہم چشموں کے ساتھ گھُڑدوڑ قائم رکھی ہے۔ خزانۂ عامرہ میں لکھا ہے کہ قطب الدین مبارک شاہ نے امیر خسرو کو ایک ہاتھی کے برابر وزن میں روپئے انعام دیے۔

اُس گئے گزرے وقت میں بھی جب کہ اسلامی سلطنت کا دیا ہندوستان میں جھلملا رہا تھا بعض اولوالعزم اور علم دوست عیش پسندوں کے فیضِ توجہ سے بہت کچھ شعرا کے دامنِ گُلِ مراد سے بھر جاتے تھے۔

گو اب بعض لوگ اُس زمانے کو یاد کر کے بے اختیار ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتے ہیں لیکن اگر غور سے

دیکھیے تو ایک بڑی آفت ہم لوگوں کے سر سے دور ہو گئی ہے۔ سلاطین کی مداحی کرتے کرتے شعرا میں ایک خاص مادہ خوش آمد کا پیدا ہو جاتا تھا جس سے اُن کے کلام کی قدرتی روانی میں فرق آ جاتا تھا۔ اُن کے خیالات کا آزادانہ لب و لہجہ باقی نہیں رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ تعریف کے مضامین پیدا کرتے میں نئے نئے انداز سے مبالغے کو کام میں لاتے تھے۔ جھوٹ بکتے بکتے اُن کو سیدھے سادے واقعات کے بیان میں لطف نہیں ملتا تھا۔ اُن کے خیالات رفتہ رفتہ محدود ہو جاتے تھے۔ لفاظیوں کا ایک ایسا جھاڑ طیار ہو جاتا تھا کہ شاہدِ مطلب کا دامن اکثر کانٹوں سے اُلجھا جاتا تھا۔ معلومات کے کل سرچشمے اپنا ذخیرہ بے جا مداحی کی ناپاک اور بے پایاں کھاڑی میں خالی کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ہماری شاعری کا بڑھ سمٹ کر ایک انچ سے زیادہ نہیں رہا تھا۔

اب اگر کوئی کسی کی مدحت نہ کرے تو کوئی شاباش کی بات نہیں۔ اس لیے کہ سرے سے اُمید صلہ ہی مفقود ہے۔ مداحیِ مروجہ کی قباحتیں اب گویا سب پر کھل گئی ہیں۔ اکثر سنجیدہ خیال لوگوں کی توجہ اور زرخیز زمینوں کی طرف مصروف ہو گئی ہے۔ دوسرے میدانوں میں لوگ اپنے اشہبِ قلم کو زیادہ آئینِ منفعت کے ساتھ چمکا رہے ہیں۔ تعریف اُن لوگوں کی ہے جن کو عین اُس زمانۂ اقبالِ مداحی میں اُس کی قباحتوں پر نظر تھی۔ میں دیکھتا ہوں کہ نظیر اُنہی مستثنےٰ لوگوں میں ہے۔ جس طرح اُس نے اپنی زبانِ قلم کو لوگوں کی ہجو سے روکا اُسی طرح اُس نے اہلِ دنیا کی مدح کی آلایش سے بھی اُس کو پاک رکھا۔ تمام کلیات میں اُس کے ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جس میں کسی رئیس یا امیر یا نواب کی تعریف ہو۔ یہ بھی نہیں کہ اُس کو کسی رئیس سے تعلق نہ ہو راجہ چیت سنگھ کے بیٹے کی سرکار میں وہ متعلق تھا۔ وہ اگر تعریف کرتا تو یقیناً راجہ اُس کو مناسب صلے دیتا اور یقیناً دُنیاوی حیثیت سے اُس کی حالت زیادہ شگفتہ ہوتی۔ عجب نہیں کہ بعض موقعوں پر حُسنِ طلب کے

اشارے بھی ہوئے ہوں لیکن اس کو خوشامد سے نفرت کُلّی تھی - وہ ایک بندۂ خُدا کی مدحت اُس درجے میں انتہا درجے کی بدعقلی جانتا تھا - اشاروں کو ہنسی میں ٹال جاتا ہوگا - رہا حُسنِ کلام وہ اور مضامین کے مطلع سے اِس طرح چمکا ہی کہ اب کسی عاقل کو جائے شکایت ہو نہیں سکتی - اُس نے اپنی خداداد قوّتِ شاعری کو اِس سوءِ تصرف سے بچا کر ایک اچھے مصرف میں لگایا اور کانِ طبیعت سے کاوش کر کے ایسے جوہر نکالے جو اور شعرا کے مدحیہ جھوٹے جواہر سے ہر چند زیادہ چمکیلے نہ ہوں مگر سچّے اور اصلی جواہرات ہیں اور ہر جوہری بازار میں عمدہ قیمت کو بک سکتے ہیں -

ایک[۱] جگہ خوش آمد کی میاں نظیر نے تعریف بھی کی ہی لیکن اُس سے یہ مدّعا نہیں ہی کہ آدمی کمینوں کی طرح خوشامد کرے - اُس کا منشا صرف اتنا ہی ہی کہ ایسی بات نہ کرے کہ دل کو کسی کے آزار پہنچے - معمولی اخلاق جن سے لوگ خوش ہوتے ہیں اور اُن میں کچھ اپنا نقصان بھی نہیں مصلحتِ دنیا کے لیے اُن کے کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں - بلکہ مناسب ہی - چار دن جس شخص کو جھک کر سلام کیا دل میں خوش ہوگیا - اگر کوئی کام آگیا تو اُس نے اُس کے کر دینے میں انکار نہ کیا - سلام کرنے سے ہمارا کچھ صرف نہیں ہوا لیکن وقت پر کس قدر کام آگیا - ہاتھ جوڑ جوڑ کے باتیں کرنا گو بعض مغرور مزاج کو ناگوار معلوم دے لیکن اُس میں بھی کوئی دولت لٹنے گھر سے نہیں جاتی - اور مخاطب ہی کہ اسی ذرا سی بات پر پھولا جاتا ہی - نظیر کے مزاج میں انکسار چوں کہ نہایت مرتبہ کا تھا وہ اِس قسم کی اخلاقی خوشامد کا برتاو ہر شخص کے ساتھ کرتا تھا - وہ جیسا کہ بیان ہو چکا - ادنیٰ ادنیٰ شخصوں کے سلام کا دونوں ہاتھوں سے جواب دیتا تھا - وہ معمولی آدمیوں سے بھی کوئی بات کرتا تھا تو ہاتھ جوڑ کر اور ادب دکھا کر - گھر باہر تمام اُس کے اخلاق کا جال پھیلا ہوا تھا اور ہر دل اُس کے

[۱] جس خوشامد کا نظیر نے ذکر کیا یہ اکثر بڑے شہروں کا خاصہ ہی خصوصاً جس شہر کی آبادی زیادہ تر مہاجروں کی نہ ہو جیسے آگرہ ہی -

دام میں اسیر تھا۔

حکیم میر قطب الدین باطن کے تذکرۂ نغمۂ عندلیب سے نظیر کے اخلاق کے متعلق یہ باتیں مستنبط ہوتی ہیں:
مزاج میں حلم بہت تھا۔ لاکھ خلافِ مزاج بات ہو۔ ماتھے پر بل نہیں۔ بہت کم لوگوں نے اُن کو غصّہ ہوتے دیکھا۔ جس بزم میں بیٹھتا اخلاق کے نور سے شمعِ انجمن معلوم ہوتے۔ نادرہ سنج ایسے بڑے تھے کہ کوئی بات لطیفے سے خالی نہ تھی۔ انجمن کو اپنی لطافت سے شگفتہ کر دیتے تھے۔ جود و احسان میں بھی بڑا رتبہ رکھتے تھے پاس پڑوس میں جو غریب غُربا تھے اُن کی اکثر خبر گیری فرماتے تھے۔ مُحتاج کو دیکھ کر اُن کا دل دُکھ جاتا تھا۔ کسی سائل کو خالی نہ پھیرتے تھے۔ اور جو وقت پہ کچھ نہ ہوتا تو نہایت گڑگڑا کر معذرت کرتے۔ بڑے صاحب ہمت تھے۔ اپنی ہمت کے آگے وہ شاہی گنج و خزانہ کو بھی کوئی چیز نہ سمجھتے تھے۔ زیورِ حیا سے آراستہ تھے۔ جو اہلِ مروّت کا خاصّہ ہے۔

نظیر کا مذہب اور مذاقِ تصوف

نظیر کے کلام کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اہلِ سنت وجماعت کے طریقۂ مروجہ کے مطابق کہیں صحابۂ کرام کی مدحت نہیں کی۔ اہلِ سنت وجماعت بطورِ معمول حمد و نعت کے بعد چاروں صحابیوں کی تعریف ضرور لکھتے ہیں۔ نظیر نے لیلی مجنوں کے قصے میں صرف حمد و نعت پر اکتفا کی ہے۔ صحابیوں کا ذکر کیا ہی نہیں یہاں تک کہ حضرت علی کو بھی بھول گئے ہیں۔ اُس کی مذہبی نظمیں کلیات میں شمار ہیں کُل گیارہ ہیں۔ ایک میں صرف خدا ہی کی حمد ہے۔ دوسری میں صرف خدا کی نعت۔ تیسری میں کلمے کی مواظبت کی ہدایت۔ چوتھی میں حضرت علی کی منقبت۔ پانچویں میں پنج تنِ پاک کی تعریف۔ چھٹی میں حضرت علی کا معجزہ۔ ساتویں میں حضرت عباس کا معجزہ۔ آٹھویں میں پھر حضرت علی کی منقبت۔ نویں میں پھر حضرت علی کی منقبت دسویں نظم بطورِ سلام ہے جس میں رسول سے لے کر تمام اہلِ دل اور اولیا کے ساتھ اپنی حسنِ عقیدت ظاہر کی ہے گیارھویں میں حضرت سلیم چشتی کے عُرس کا ذکر ہے۔

کلیات کے علاوہ اور بھی بعض نظمیں سنی گئی ہیں جو فقیروں کی زبانوں پر صدا بن کر گلیوں اور کوچوں میں غلغلہ مچاتی ہیں مثلاً خیبر کی لڑائی حضرت علی کا وہ معجزہ جس میں آپ نے ایک پہلوان کو زیر کیا اور وہ آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ اور بھی شاید بہت سی نظمیں ہوں گی جو مجھ تک نہیں پہنچیں۔

ان تمام نظموں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ خاندانِ اہلِ بیت کے ساتھ بڑی محبت رکھتا تھا۔ وہ خارجی پر لعنت کرتا ہے۔ وہ حضرت علی کی کرامات کو معجزے کے ساتھ تعبیر کرتا ہے۔

ایک معجزہ تو اُس نے حضرت علی کا یہ لکھا ہے کہ کسی بَن میں شیر اور شیرنی رہتے تھے۔ شیرنی اُس بَن میں دو بچے جنی۔ ایک دن اپنے بچوں کو چھاتی سے لگائے دودھ پلا رہی تھی کہ اتنے میں کسی طرف سے بندوق کی صدا آئی۔ نر مادہ دونوں ڈر کر بھاگ گئے۔ آواز بندوق کی جس شکاری کی آئی تھی وہ کوئی بادشاہ تھا جو شکار کو نکلا تھا اور شکار کرتا ہوا آرہا تھا۔ جب اُس مقام پر پہنچا تو اُس نے شیر کے یہ دو بچے دیکھے۔ آدمی سے حکم کیا کہ اِن کو اونٹ پر رکھ لو۔ غرض اونٹ پر رکھوا کے گھر کو لے آیا۔ یہ تو بچوں کا حال ہوا۔ اب شیر اور شیرنی کا حال سنیے۔ کچھ دیر بعد جب جنگل میں امن ہوا اور بندوق کی آواز دیر تک موقوف رہی تو دونوں واپس آئے۔ مگر یہاں آکر دیکھیں تو بچوں کا کہیں پتا نہیں۔ شیر تو وہیں غش کھا کر گرا۔ اور شیرنی نے نجفِ اشرف کی راہ لی۔ نجفِ اشرف پہنچ کر تین دن وہ شیرنی بھوکی پڑی رہی۔ لاکھ لوگوں نے اُس کو کھلانا پلانا چاہا مگر اُس نے کھانے پینے کی طرف رُخ ہی نہ کیا۔ ناچار وہاں کے شریفوں نے جس طرح قدیم سے کہنے کی راہ تھی حضرت علی کی جنابِ مقدس میں عرض کی۔ وہاں سے ندا آئی کہ یہ شیرنی ظلم و ستم کی ستائی ہے۔ بچوں کو اس کے کوئی پکڑ کر لے گیا ہے۔ اُس کی فریاد لائی ہے۔ کل اس کا جیسے تم سب پہ آشکارا ہو جائے گا۔ ادھر شریفوں کو تو یہ جواب عنایت ہوا اُدھر بادشاہ کا جا کر پلنگ اُلٹ دیا۔ اور فرمایا کہ شیر کے دونوں بچوں کو تو کل نجفِ اشرف میں جلد بھیج دے ورنہ پھر بہت پچھتائے گا۔ بادشاہ تو تھر تھر کانپنے لگا اور گڑگڑا کر بولا کہ یا حضرت نجف تو یہاں سے پندرہ دن کی راہ ہے۔ کل اِن کو وہاں کیوں کر پہنچ دوں۔ حضرت نے فرمایا کہ جس وقت تو تڑکا ہو جلدی سے دونوں بچوں کو اُونٹ پر رکھوا کے اپنے شہر کی آبادی سے ادھر بھجوا دے۔ جب یہ شہر کے دروازے پر پہنچیں گے غیب سے ایک ناقہ سوار پیدا ہوگا۔ صبح ہوتے ہی اُس نے دونوں بچوں کو منگوا اُونٹ پر رکھوا جلدی سے روانہ کیا۔ جب لوگ شہر کے دروازے پاس پہنچے تو کیا دیکھیں کہ ایک شخص

وہاں آدھی رات سے اُونٹ کی مہار پکڑے منتظر بیٹھا ہوا ہی۔ جاتے ہی دونوں بچے اُس کے حوالے کیئے۔ وہ بچوں کو لے کر روانہ ہوا اور پھر دن چڑھتے چڑھتے نجفِ اشرف میں پہنچ گیا۔

بچوں کے آنے کے جب غُل ہوئے کروڑ | وہ شیرنی بھی تکنے لگی اپنے مُنھ کو موڑ
جب لاکے اُس کے سامنے بچے دیے وہ چھوڑ | یوں خوش ہو چاٹنے لگی اُلفت کی کر جھنجھوڑ

انسان جیسے کرتا ہی بچوں کو اپنے پیار

بچے بھی دوڑ ماں کے گلے سے لپٹ گئے | یوں جیسے کوئی دُور کا بچھڑا ہوا ملے
چھاتی پہ لوٹ لوٹ کے جا دُودھ سے لگے | اس شیرنی کے جیسے کلیجے میں داغ تھے

ویسی ہی اُس کے مُنھ پہ خوشی کی ہوئی بہار

جب اُس نے بچے پائے تو ہو کر وہ شادماں | بچوں سمیت اُٹھ کے وہ حیوانِ بے زباں
روضے کے سات بار تصدّق ہوئی وہاں | پھر آستانہ چوم ہوئی واں سے وہ رواں

جا پہنچی اپنے دشت میں خوش ہو کے ایک بار

یہ نظم بہت مشہور ہی۔ تمام فُقرا گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع میں اپنی غلامی کو حضرت علی کی جناب میں یوں عرض کرتے ہیں:۔

اے شاہ یہ نظیر تمھارا غلام ہی | عاصی ہی پُر گناہ ہی اور ناتمام ہی
رکھتا سوا تمھارے کسی سے نہ کام ہی | دن رات اُس کا آپ سے اب یہ کلام ہی:

"رکھیو میری آبرو یا شیرِ کردگار"

دوسرا معجزہ نظیر ہی کے الفاظ میں یوں ہی۔

اک معجزہ کہتا ہوں میں اس شاہ کا سن کر — موتی سے سخن ہیں لو اسے دھاگے سے چن کر
اک کافرِ بدذات چلا لڑنے کی دھن کر — آسامنے حیدر کے غضب آگ سا بھن کر
جوں اونٹ ذبح کرتے ہیں چلا کے دہاڑا

کہنے لگا میں تم سے علی کشتی لڑوں گا — کشتی کے جو ہیں پیچ علی تم سے کروں گا
خم ٹھونک کے میدان میں علی تم سے اڑوں گا — ہاں یا علی میں آپ سے کچھ گر نہ پڑوں گا
ہر چند علی آپ نے دیوؤں کو پچھاڑا

جب شاہ اٹھے جوش میں آتش و غضب کے — یکبارگی اس کافرِ بدذات سے لپٹے
کر یادِ خدا ہاتھ کمر بند میں اس کے — اک ہاتھ سے پھینکا جو اسے تین چرخ دے
یوں گر پڑا جوں گرتا ہے دریا کا کڑاڑا

چاہا جو اٹھے خوف سے وہ کانپ دھڑک کر — اس شاہ نے ماری ہیں اک لات کڑک کر
روح اس کی نکلنے لگی پنجرے سے پھڑک کر — نتھنوں سے لہو ڈال کے ماتھے پہ چھڑک کر
منکر کا اجل لے چلی دریا کو نواڑا

دانتوں سے پکڑ تنکا وہ بولا علی آیا — تقصیر ہوئی مجھ سے میں اپنا کیا پایا
پھر اس کو مسلمان کیا کلمہ پڑھایا — کفار میں جا دین کے ڈنکے کو بجایا
دیں داری کو جاری کیا اور کفر کو گاڑا

یہ نظم میں نے ایک فقیر سے لکھ لی ہے۔ کلیات میں نہیں ہے۔ اسی میں دو مصرع یہ بھی ہیں:-

مولیٰ مراجب وقت تھا طفلی کے عہد میں — کلّے کے تئیں اژدرِ خوں خوار کے پھاڑا

علی نے مہد میں چیرا ہی اژدر	علی نے کاٹ ڈالے عمر و عنتر
اُلٹ ڈالا ہی اک حملے میں خیبر	غواص اشیا کا پھیرے گرد وہ سرور

تو ہو تریاک زہر اور زہر تریاک

علی کو مصطفےٰ نے جی کہا ہی	علی کو جسمک جسمی کہا ہی
علی کو لحمک لحمی کہا ہی	علی کو روحک روحی کہا ہی

یہ سمجھے وہ خدا دے جس کو ادراک

علی کو جو کوئی پہچانتا ہی	برابر مصطفےٰ کے مانتا ہی
جو اِن میں کچھ تفاوت جانتا ہی	وہ اپنے خاک سر پہ چھانتا ہی

لگائی اُس نے دوزخ کی تگر تاک

جو رکھے دشمنی حیدر سے یک مو	وہ بیشک ہی سیہ دل اور سیہ رو
جو سبکی سے نام مرتضےٰ کو	نہ جاوے اُس شقی کے مُنہ سے بدبو

کرے گر شاخ سے طوبیٰ کی مسواک

پڑھوں جس دم مناقب میں علی کا	پھٹے سینہ مخالف خارجی کا
حواس اُڑ جاے ہر اک ناصبی کا	دھڑک جاوے کلیجا مدعی کا

(میر) - قلعۂ خیبر مرگ اژدر کھینچنا خورشید کا ✣ ہیں فسانے زور کے تیرے جہاں میں یادگار -
(میر) اُٹھا ہی دو انگشت سے دروازۂ خیبر ✣ چیرا ہی کس انداز سے گہوارے میں اژدر -
گیا ہاتھ بھا جس سے کہ گیا جان سے عنتر ✣ ظاہر ہی کہ یاں تھا وہی ظاہر وہی مظہر -
(نظیر) اگر خارجی ہو آوے میرے آگے مثل تاڑ ✣ پگڑی کو اُس کی پھینک کے ڈاڑھی کو یوں اکھاڑ -

عدو کا دم میں ہو جاوے [illegible]

اسی کو سر جھکا سجدہ کیا خورشید انور نے | اسی کو لا فتیٰ ہر دم کہا اللہ اکبر نے
اسی کو لحمک لحمی کہا جانِ پیمبر نے | اسی کو [illegible] کہا اُس شاہ برتر نے

خدا و مصطفیٰ سے ہم قرابت اس کو کہتے ہیں

کیا مولا سے میرے گر کسی نے اک سوال آ کر | جو مانگا اک شتر اس کو دلائے سیکڑوں اشتر
اگر کچھ زر کی خواہش کی تو بخشے اس قدر گوہر | کہ اس کا گھر بھرا اور اس کے ہمسایوں کا گھر بار

کریم و اہلِ ہمت میں سخاوت اس کو کہتے ہیں

اسی نے ایک حملے میں گرایا باب خیبر کا | کروڑوں کافروں سے جا لڑا وہ ایک تن تنہا
چہ بیر العلم میں کود کر دیووں کو جا مارا | ہزاروں پہلوانوں سے کبھی اپنا نہ منھ موڑا

بہادر بے بدل یکتا شجاعت اس کو کہتے ہیں

کہا اُس شاہ نے روزِ قیامت میں جو آؤں گا | وہاں عرصات میں اپنے محبّوں کو جو پاؤں گا
کھڑا ہو عرش کے آگے سبھوں کو بخشواؤں گا | پلا کر جام کوثر سب کو جنت پہنچواؤں گا

علی کے دوستوں کو شفاعت اس کو کہتے ہیں

پنجتن کی تعریف میں ایک خاص نظم لکھی ہے جس میں خارجی کی پگڑی اور ڈاڑھی کی یوں خبر لی ہے

نعرہ کروں جو حیدری ہل جاویں سب پہاڑ | تھرّاویں چشمہ سار ہلیں ڈر سے بوٹے جھاڑ

سُمرن مجھے بھلی ہے یہ پنجتن کے نام کی

پنجتن کی تعریف کے یہ بند بہت ہی مرغوب ہیں:-

محمد اور علی یاقوت احمر | در بحر خدا خاتون اطہر
زمرد و لعل ہیں شبیر شبر | جواہر خانۂ قدرت کے اندر

یہی پانچوں گہر ہیں پنج تن پاک

انہی کے واسطے خلدِ عدن ہی | انہی کے واسطے نہرِ لبن ہی
جنھیں اِن کی محبت کا چلن ہی | بہشتی حلہ اور اُن کا بدن ہی

سیر بہشت اور سایۂ پاک

حضرت عباس بن علی کا ایک معجزہ یوں لکھا ہی کہ آرکاٹ ایک شہر ہی۔ وہاں ایک ساہوکار تھا۔ جتنے زردار تھے سب میں اس کا رتبہ بڑا تھا۔ اس کے ایک بیٹا سعادت مند برخوردار تھا۔

گُل بدن گُل پیرہن گُل رنگ گُل رو نام دار

چوں کہ دوسرا اُس کے کوئی بیٹا بیٹی نہ تھا باپ اور ماں دونوں جی جان سے اُس پہ فدا تھے۔ نہایت تکلف کی پوشاک پنہاتے اور زر و جواہر سے لادے رہتے۔ اُن دنوں اُس کا سن و سال تیرہ برس کا تھا۔ جب اُس کو ماہ محرم کا ہلال نظر آیا۔ یہ لڑکا چھپ چھپ کر تعزیہ خانوں میں جاتا اور مرثیوں میں شاہ کربلا کے غم کا حال سُن کر سینے کو پیٹتا اور ماتم کر کے زار زار روتا۔ پھر تعزیے کے سامنے مودب ہو کے سر جھکا کر ضریح پر کھڑا مورچھل جھلتا۔ جب علم اُٹھتے تو لڑکوں کے ساتھ یا حسین کہ کر علم اُٹھا لیتا۔ شام سے آکر قندیلیں جلاتا۔ قمقمے اور جھاڑ پر شمعیں چڑھاتا۔ عود سوزوں میں اگر لا کر ڈالتا اہل مجلس کو دوڑ دوڑ کر شربت پلاتا۔ غرض جتنا وہاں کا کاروبار تھا سب کرتا۔ اب تک اُس کے باپ کو اِس کی خبر نہ تھی۔ جب اُس نے سُنا جھڑ کا طمانچے مارے۔ خوب سی تنبیہ کی اور کہا۔ اے بے حیا بدبخت۔ موذی۔ عجمی

نابکار۔ کیا تو مجھے ذات سے نکالے گا۔ دن کو تو باپ نے یوں جھڑکا لیکن چونکہ شہیدِ کربلا کی محبت کا دل میں اس کے جوش تھا وہ رات کو پھر تعزیہ خانوں میں دوڑا ہوا پہنچا۔ باپ اس کا وہاں سے پھر پکڑ لایا۔ الغرض سو سو طرح کے اس پر عذاب کیے مگر اس نے تعزیہ خانے کا جانا نہ چھوڑا۔

رونا اور ماتم ہی کرنا اس کے دل کو بھاتا تھا | تعزیہ خانے کی جانب یوں وہ دوڑا جاتا تھا

جس طرح عاشق کسی معشوق کا ہو بے قرار

بند رقت یہ ہے:-

جب تو سب نے تنگ ہو کر مصلحت ٹھانی ہم | جس سے کرتا ہے یہ ماتم اور اٹھاتا ہے علم
کیوں نہ اب اس دم وہی ہاتھ اس کا کر ڈالو قلم | کہ کے یہ آخر کو سب نے ہی قیامت ہے ستم

کاٹ ڈالا ہاتھ جلد اس بے گنہ کا ایک بار

الغرض اس مظلوم کا ہاتھ تن سے جدا کر کے اس کو کوٹھری میں بند کر اوپر سے قفل جڑ دیا۔ اور کھانا پانی سب موقوف کر دیا۔ لڑکا بھوکا پیاسا شام تک کوٹھری میں پڑا تھا اور اپنے ہاتھ کو دیکھ ڈاڑھیں مار مار کر روتا تھا۔

وہ اندھیری کوٹھری وہ بھوک وہ پانی کی پیاس | ہاتھ سے لوہو کی بوندیں بھی ٹپکتی آس پاس
کس مصیبت میں پڑا وہ گل بدن زریں لباس | ہاتھ زخمی خون جاری دل پریشاں جی اداس

کس سے مانگے داد اور کس کو پکارے بار بار

اپنی بے کسی درد میں رو رہا تھا۔ اس میں اس کوٹھری میں دیکھتا کیا ہے کہ ایک دفعہ ہی نور کی تجلّی ہوئی۔ اور اس تجلّی میں اس کو ایک نوجوان نظر آیا۔ کاندھے کے اوپر علم۔ پہلو میں آب دار تیغ۔ ہاتھ میں

داستانہ۔ پُشت کے اوپر سپر۔ تن میں سیمیں زرہ۔ فرق پہ خود زریں۔ دائیں کو تیرہ کماں۔ بائیں کو شمشیر و تیر

	جس طرح ابرِ سیہ میں برق ہووے جلوہ گر اس طرح اُس کوٹھری میں آگیا وہ شہسوار	

یہ جوان خود حضرت عباس بن علیؓ تھے۔ آپ کی توجہ سے لڑکے کا ہاتھ درست ہوگیا۔ جب ہاتھ درست ہوگیا وہ سوار غائب ہوگیا۔ صبح کو اُس کوٹھری کا دروازہ خود بخود کُھل گیا۔ اب ماں باپ دیکھیں تو اُس کا ہاتھ تن سے ملا ہوا ہے۔ پوچھا یہ کیا تھا۔ اُس نے جو کچھ دیکھا تھا جب بیان کیا۔ پھر تو سُنتے ہی دونوں نے صدقِ دل سے کلمہ پڑھا۔

جب اس معجزے کی شُہرت ہوئی تو تمام شہر کے لوگوں نے آکر اُس لڑکے کو گھیر لیا۔ جو دیکھتا تھا اُس کے ہاتھ چوم لیتا تھا اور آنکھوں سے لگا کر کہتا تھا کہ سُبحان اللہ دوستی کے پھول نے کیا بہار دکھلائی ہے۔

پھر ماں باپ اُس لڑکے کے لڑکے کو لے کر کربلا چلے گئے۔ اور وہاں بھی اُس لڑکے کی بڑی قدر ہوئی۔ روضے میں جب داخل ہوئے تو زیارت سے مشرف ہو کر کچھ مکان بنوانے کی تجویز کی۔ لڑکے کے اہتمام سے نہایت منقش اور زرنگار عمارت تعمیر کی۔

یہ معجزہ میں نے ایک دفعہ کسی مجلس عزا میں ایک حدیث خوان کی زبانی بھی سُنا تھا۔ عبارت نثر تھی۔ اور تکلف کے ساتھ لکھی گئی تھی۔ لیکن روانی جو نظیر کی اِس نظم میں ہے وہ کہاں۔ سلام کے یہ بند بھی نظیر کے عقائد پہ کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

	صاحبِ خُلق و کرامت سے کہو عشق اللہ	پہلے اُس ختمِ رسالت سے کہو عشق اللہ

گلشن دیں کی طراوت سے کہو عشق اللہ — نور حق شافعِ اُمت سے کہو عشق اللہ

ہر دم اُس شاہ ولایت سے کہو عشق اللہ

اور وہ ہی جس سے ہرا باغِ امامت کا چمن — سبز پوشِ چمن جنتِ فردوس حسنؑ
زہر نے جس کا زمرد سا کیا سبز بدن — یاد کر مومنو اُس کا وہ ہرا پیراہن

سبزۂ باغِ امامت سے کہو عشق اللہ

اور وہ گُل جس سے ہے گلزار شہادت کا کھلا — لے گئے دشتِ بلا میں جو اُسے اہل جفا
تین دن رات کا پیاسا وہ بہادر یکتا — لشکرِ شام کو للکار کے تنہا وہ لڑا

گوہرِ دُرجِ شجاعت سے کہو عشق اللہ

اور جس مرد کا ہے نام شہِ زین عبا — کربلا میں وہ اگر آہ کا شعلہ کرتا
جل کے لشکر وہ سبھی خاک سیہ ہو جاتا — پر سوا حق کی رضا اُس نے نہ کچھ دم مارا

اُس جواں مرد کی ہمت سے کہو عشق اللہ

باقر و جعفر و کاظم و رضا شاہِ شہاں — اور تقی نور نبی اور وہ نقی قبلۂ جاں
عسکری مہدی ہادی وہ امامِ دوراں — ہیں زمانے میں یہی بارہ امام اے یاراں

سب ہر اک صاحبِ عزت سے کہو عشق اللہ

آنحضرت - حضرت علیؑ - امام حسنؑ - امام حسینؑ - امام زین العابدینؑ - امامؑ باقر - امام جعفرؑ امام کاظمؑ - امام موسیٰ رضا - امامؑ تقی - امامؑ نقی - امامؑ عسکری امام مہدیؑ - بارھوں امام کے نام اس نظم میں سلام بھیجا ہے۔

وہ نور دیدۂ احمد کہ جس کے رتبہ کی	حدیث بضعۃ منی ہے دو جہاں میں گواہ

دو نظمیں حضرت سلیم چشتی کے جواہر صفات سے انتظام پائی ہیں۔ ایک میں آپ کی صرف مدحت ہے۔ دوسری میں آپ کے عرس شریف کی کیفیت۔ حضرت سلیم چشتی وہ بزرگ ہیں جن کی دعا سے جہانگیر پیدا ہوا تھا جیسا کہ اُس کے نام سلیم سے ظاہر ہے۔ اکبر کو ان کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ فتح پور سیکری میں ان کا مزار ہے۔ روضہ بڑی طیاری کا بنا ہوا ہے۔ شاہی انتظام سے بنا ہے۔ آگرے سے سات آٹھ کوس ہے۔ ہر سال حضرت کا عرس ہوتا ہے۔ دُور دُور سے خلقت جمع ہوتی ہے۔ بڑا میلا رہتا ہے۔

میاں نظیر کی مدحت کے خلوص آمیز انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حضرت کے ساتھ خاص عقیدت تھی۔ دو جہاں کے سلطان۔ سردار ملک عرفاں۔ مقبول خاص یزداں۔ عرش بریں کے تارے۔ اللہ کے سنوارے۔ قبلۂ صفا۔ کعبۂ ضیا۔ خلقت کے رہنما۔ محبوب کبریا۔ ان القاب سے تو یاد کرتے ہی ہیں نہیں۔ ایک بڑی بات یہ بھی کہتے ہیں کہ جس طرح شاہ بوعلی قلندر بخشی الاولیا تھے حضرت سلیم چشتی سیسرماں ہیں۔

شاہا شرف تو بخشی خالق کی سلطنت کے
اور تم ہو سیسرماں حضرت سلیم چشتی

اس بہار کا میلا اس قدر قریب ہو اور آگرے کے شوقین جیوڑے چین سے بیٹھے رہیں۔ کوئی کہنے کی بات ہے۔ شوقین اپنے شوق کی رنگ میں اور خوش عقیدہ عقیدت کی جاں نواز اُمنگ میں میلے کی طیاریاں کر رہے ہیں۔ میاں نظیر بھی جا پہنچے ہیں۔ کبھی صحن درگاہ پر نظر کرتے۔ کبھی مزار پُر انوار کی طیاریوں سے آنکھوں کو اُجالتے ہیں۔ کبھی جھرنے پر کھڑے نہانے کی سیریں دیکھ رہے ہیں۔ آدمیوں کی بھیڑ ہے۔

۵۱ شیخ سلیم بن بہار الدین چشتی۔ ۲۹۔ رمضان کو عرس ہوتا ہے۔ فریدی ہیں۔ حضرت بابا کی اولاد۔

سبز۔ سرخ۔ زرد ہر قسم کی پوشاکیں پہنے لوگ میلے میں پھر رہے ہیں۔ امیر۔ فقیر۔ بادشاہ زادے۔ نواب سب ہی قسم کے لوگ جمع ہیں۔ پھولوں سے تمام مکان رشکِ گلزار ہو رہا ہے۔ ایک طرف مجلس مشائخوں کی جمی ہوئی ہے۔ راگ گائے جا رہے ہیں۔ حال ہو رہے ہیں۔ عارف الحق میاں علی احمد سجادہ نشین درگاہ اس حلقے میں ایک خاص کیفیت کے ساتھ ممتاز ہیں۔ مریدوں کو توجہ دے رہے ہیں۔ ہر میلے میں جس طرح عاشق مزاجوں کا بھی ایک جمگھٹا ہوتا ہے یہاں بھی ہے۔ حسینوں کو دل ربائی کا مشغلہ ہے۔ عاشقوں کو آہ و زاری سے کام ہے۔ دونوں کے باہمی معاملے نظیر کو اپنا عاشق بنائے ہوئے ہیں۔ وہ محویت کے ساتھ ان کے حالات دیکھ رہا ہے اور مزے لے رہا ہے۔

یہ اُمید تو کسی طرح کی جا نہیں سکتی کہ نظیر نے حضرت سلیم چشتی کی اس قدر مدحت اہل دنیا کی خوش آمد یا ظاہر داری کی راہ سے کی ہو۔ ہر چند شیعوں میں تقیہ ہے لیکن نظیر جس مزاج کا آدمی ہے وہ اس قسم کا تقیہ کر نہیں سکتا۔ وہ اپنے خیالات کے ظاہر کرنے میں بڑا آزاد ہے۔ وہ جس قدر دل میں سمجھتا ہے اُتنا ہی ظاہر کرتا ہے اُس کے کلام کا کوئی حصہ اُس کی کوئی خیالی بزدلی کو نہیں دکھاتا۔

ہر چند اس سے یقینی طور پر مستنبط نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سُنّی تھا لیکن اس میں کسی طرح کا شک نہیں کہ اُس کو مشائخ اور فقراء کے ساتھ ایک خاص خوش عقیدگی تھی۔ جس زمانے میں کہ وہ تھا مسلمانوں پر ادبار اپنا پورا قبضہ کر چکا تھا۔ اقبال کا آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ راگ رنگ کی شفق پھولی ہوئی تھی۔ مصائب کی شام تاریکی پھیلا رہی تھی۔ شامِ غربت کا عبرت ناک سماں ہر مسافرِ زندگی کے پیش نظر تھا۔ قلوب عبرت کے اداس اثر سے قدرتی طور پر متاثر تھے۔ دُنیا کے جاہ و اجلال کی بے ثباتی ہر شخص کے دل پر نقش تھی۔ شامت زدہ اُمرا اپنی کوششوں کو بے حاصل اور ہمت کو قاصر پا کر بزرگوں کی ہمت سے مدد چاہتے تھے۔ افلاس زدہ غربا

خانقاہوں اور روضوں کی تسکین بار آور ہوا میں کسی قدر تسکین پاتے تھے۔ مشائخوں کا بازار گرم تھا۔ اور تصوف کے صبر و سکون بخش جنس کی بڑی دریا دلی کے ساتھ خریداری ہو رہی تھی۔ مجاذیب کی قوتِ جذب بہت بڑھ گئی تھی۔ ہزاروں آدمی بے اختیار کھنچے جا رہے ہیں۔ نوکری کی تلاش میں بہتیرا سر مارا۔ امیدواری کرتے کرتے ہار گئے۔ نہ ملی تو اب شاہ جھونپڑا کی خدمت میں دوڑے جا رہے ہیں۔ گورنمنٹ نے جاگیر ضبط کر لی۔ عرضیاں دیں وکیل کے ذریعے سے بہتیرا غل مچایا۔ ایک نہ سنی گئی۔ اب کسی نے کان میں پھونک دیا ہے کہ ٹکیا شاہ بڑے روشن باطن ہیں عالم کا سیاہ و سفید انھی کے ہاتھ میں ہے۔ دن رات انھی کے آستانے پر دھئی دیے پڑے ہیں۔ (انشا)

کر بیٹھے وہیں فضل خدا ساز پہ تکیہ	جب بن نہ پڑی بات کچھ اپنی تگ و دو سے

نظیر کوئی فرشتہ تو تھا نہیں کہ اپنے کو زمانے کے پُر زور اثر سے بچا لیتا۔ عبرت اور ہمدردی کی غیر معمولی قوت نے اس کو اور کمزور کر دیا تھا۔ وہ اخلاق کا جویا تھا۔ لیکن لوگوں میں کچھ اخلاقیاں عام تھیں۔ یہ کیمیا اس کو کیوں ملنے لگی تھی۔ صوفیوں کی گرد کاروان اس کو اس کیمیا کی کچھ امید دلاتی تھی۔ وہ اس گروہ کے ساتھ ہو لیا اور تا دمِ مرگ لپٹا رہا۔ محبتِ اہلِ بیت تو صوفیوں کا بھی بڑا تمغا ہے چونکہ فیضِ روحانی کا سلسلہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات سے قائم ہے یہ محبت ایک طبعی بات ہے بعضوں کو تو یہ محبت حدِ تفضیل تک لے گئی ہے اور اکثر متہم بہ شیعیت بھی ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے نظیر کو مذہب بھی اس گروہ کے ساتھ عقیدت رکھنے میں مانع نہیں ہو سکتا تھا۔

صوفیوں میں بیٹھتے بیٹھتے اس پہ عام جلوۂ باری کی حقیقت روشن ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ وحدۃ الوجود کا آفتاب کس طرح ہر ذرّے کے مطلع سے چمک رہا ہے۔ اس یقین کے ساتھ بھی اس کی زبان گستاخ نہیں۔ وہ ادب قرینے ملحوظ رکھتا ہے منصور کی طرح انا الحق کے شور سے توحید کی روئی نہیں دھنکتا۔ عرفان کی عینک چڑھی ہوئی ہے

غور کے تال ادب کی کمانی میں جھک رہے ہیں - نگاہیں کہاں سے کہاں پہنچتی ہیں - کہتا ہے -

تنہا نہ اُسے اپنے دلِ تنگ میں پہچان
ہر باغ میں ہر دشت میں ہر سنگ میں پہچان

بے رنگ میں بارنگ میں نیرنگ میں پہچان
منزل میں مقامات میں فرسنگ میں پہچان

نت روم میں نت ہند میں اورنگ میں پہچان
ہر راہ میں ہر ساتھ میں ہر سنگ میں پہچان

ہر عزم ارادے میں ہر آہنگ میں پہچان
ہر دھوم میں ہر صلح میں ہر جنگ میں پہچان

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

پھل پات کہیں شاخ کہیں پھول کہیں بیل
نرگس کہیں سوسن کہیں بیلا کہیں راببیل

آزاد کوئی سب سے کسی کا ہے کہیں میل
ملتا ہے کوئی راکھ چنبیلی کا کوئی تیل

کرتا ہے کوئی ظلم کوئی لیتا ہے کوئی جھیل
باندھے کہیں تلوار اٹھاتا ہے کہیں سیل[1]

ادنیٰ کوئی اعلےٰ کوئی سو کھا کوئی ڈنڑ پیل
جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں یہ سب کھیل

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان - الخ

گاتا ہے کوئی شوق میں کرتا ہے کوئی حال
پھانکے ہے کوئی خاک اڑاتا ہے کوئی مال

ہنستا ہے کوئی شاد کسی کا ہے برا حال
روتا ہے کوئی ہو کے غم و درد میں پامال

ناچے ہے کوئی شوخ بجاتا ہے کوئی تال
پہنے ہے کوئی چیتھڑے اوڑھے ہے کوئی شال

کرتا ہے کوئی ناز دکھاتا ہے کوئی بال
جب غور سے دیکھا تو اسی کی ہے یہ سب چال

[1] بھالا - برچھا -

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان الخ

جاتا ہے حرم میں کوئی قرآن بغل مار
کہتا ہے کوئی دیر میں پوتھی کے سماچار[لہ]
پہنچا ہے کوئی پار بھٹکتا ہے کوئی وار
بیٹھا ہے کوئی عیش میں پھرتا ہے کوئی خوار
عاجز کوئی بے کس کوئی ظالم کوئی لٹھ مار
مفلس کوئی ناچار تو انگر کوئی زردار
زخمی کوئی ماندا کوئی اچھا کوئی بدکار
جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں سب اسرار

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان الخ

ہے کوئی دلی دوست کوئی جان کا دشمن
بیٹھا ہے پہاڑوں میں کوئی پھرتا ہے بن بن
مالا کوئی جپتا ہے کوئی شوق میں سمرن
چھوڑے ہے کوئی مال سمیٹے ہے کوئی دھن
نکلے ہے جواہر کے کوئی پہن کے ابرن
لوٹے ہے کوئی خاک میں رو رو کے بلا تن
جوگی کوئی بھوگی کوئی سوگی کوئی سوگن
جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں یہ سب فن

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان الخ

سردی کہیں گرمی کہیں جاڑا کہیں برسات
دوزخ کہیں بیکنٹھ کہیں ارض و سمٰوات
حوریں کہیں غلماں کہیں پریاں کہیں جنات
اوجڑ کہیں بستی کہیں جنگل کہیں ربوات
سختی کہیں راحت کہیں گردش کہیں سکنات
شادی کہیں ماتم کہیں نور اور کہیں ظلمات
تارے کہیں سورج کہیں برج اور کہیں دن رات
جب غور سے دیکھا سب اسی کے ہیں طلسمات

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان الخ

لہ روایات۔

بیچے ہی جواہر کوئی زر سیم طلا رانگ
دیتا ہی کوئی ہاتھ سے لیتا ہی کوئی مانگ
ٹھہرا ہی کوئی چور لگاتا ہی کوئی تھانگ[2]
گھنٹا ہی کہیں جھانجھ کہیں سنکھ کہیں بانگ

مارے کوئی پارے کو بناوے کوئی مرگانگ[1]
محتاج کوئی قوت کا رکھتا ہی کوئی دانگ
ملتا ہی کوئی پوست کو چھانے ہی کوئی بھانگ
جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں سب سوانگ

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان الخ

ناری کوئی بادی کوئی خاکی کوئی آبی
باتیں کوئی بیٹھا ہوا کرتا ہی کتابی
مارے ہی ذٹیل کوئی کہیں جیب ہی دابی
کالا کوئی گورا کوئی پیلا کوئی آبی

صوفی کوئی زاہد کوئی بدست شرابی
پیتا ہی کوئی کیف کوئی می کی گلابی
سچا کوئی جھوٹا ہی کوئی رند خرابی
ہیں اُس کی ہی قدرت کے یہ سب لال گلابی

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان الخ

کیا حُسن کہیں پایا ہی اللہ ہی اللہ!
کیا رنگ یہ رنگوایا ہی اللہ ہی اللہ!
کیا دھوپ ہی کیا سایا ہی اللہ ہی اللہ!
کیا ٹھاٹھ یہ ٹھہرایا ہی اللہ ہی اللہ!

کیا عشق کہیں چھایا ہی اللہ ہی اللہ!
کیا نور یہ جھمکایا ہی اللہ ہی اللہ!
کیا مہر ہی کیا مایا ہی اللہ ہی اللہ!
کیا بھید نظیر آیا ہی اللہ ہی اللہ!

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہی تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

[1] گشتہ [2] چوری کا مال رکھتا ہی۔

مصنوع میں صانع نظر آوے تو نظیر آہ	نزدیک ہی کیا ہی کہ جہاں دور کی سوجھی

توحید کے دلّی دروازے سے نکل کر صلح کُل کے اجمیر کی طرف میاں نظیر کس آسانی سے جا رہے ہیں۔ حرم سے دیر تک اُن کو کوئی زیادہ فاصلہ نظر نہیں آتا۔ قرآن اور پوتھی دونوں کو وہ ایک ہی جزدوان میں رکھتے ہیں۔ تسبیح اور سُمرن دونوں کو ایک ہی ہاتھ سے پھیرتے ہیں۔ صوفی کو جوگی اور زاہد کو بھوگی سے بغل گیر دیکھتے ہیں۔ جھانجھ۔ گھنٹے۔ سنکھ۔ سب سے اذان کی آواز سُنتے ہیں۔

فقرا کے تکیوں پر سریع الاعتقادی اور عجائب پرستی نے اُن دنوں ہندوؤں کا بھی ایک بڑا بھاری میلا لگا رکھا تھا۔ یہی حال جوگیوں اور سناسیوں کے استھانوں میں مُسلمانوں کا تھا۔ حاضرین کے تقاضوں سے اسلام اور کُفر دونوں قدرتی طور پر ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے کو بڑھ رہے تھے۔ شیخ و برہمن نے آپس میں صُلح کر لی تھی۔ عرفان کے محکمے میں توحید نے اس صلحنامے پر مُہر کی تھی۔ رام اور رحیم کا تفاوت اُٹھ گیا تھا۔ اوتار اور پیمبر مُرادف قرار پا چکے تھے۔ گرو نانک۔ اور کبیر داس کے مقبول اسکولوں میں ہر مذہب کے افراد کثرت سے داخل ہو رہے تھے۔ بہت سے تعلیم پا کر نکل بھی چکے تھے جن میں سے بعض اپنی غیر معمولی ذہانت اور مناسبت طبع سے اعلیٰ درجے کے پروفیسر گنے جاتے تھے۔ نظیر بھی اُنھی ممتاز لوگوں میں تھا۔

ہندو مسلمان دونوں کی نظر میں ایک خاص وقعت تھی۔ دونوں مذہب کے لوگ اُس کو اپنا رُوحانی پیشوا جانتے تھے۔ گھنٹوں آکر اُس کی صُحبت میں بیٹھتے۔ اور پہروں عرفان کے رنگ میں ڈوبی ہوئی باتوں سے اُس کی فائدہ اُٹھاتے۔ بہتیرے اُس سے دُعا کی درخوست کرتے اور اُس کی ہمتِ درویشانہ کو نہایت درجے اپنی سعادت کا موجب سمجھتے۔

میں نے میاں نظیر کی نواسی سے ایک خاص ملاقات کی۔ اُنھوں نے مذہب کے سوال پر فرمایا کہ میاں نظیر کا طریقہ امامیہ تھا۔ لیکن صُلح کُل کے آدمی تھے۔ کسی سے جھگڑا نہیں۔ ہندوؤں میں ہندو تھے مسلمانوں میں مسلمان تھے۔ تعزیہ داری اُنھی کے زمانے سے چلی آتی ہے۔ پچاس دن تک چہلم تک ہوتی ہے۔ پوچھا کہ کنھیا کا جنم۔ مہادیو کا بیاہ وغیرہ کیوں لکھا۔ کہا ہندوؤں کے ہاں نوکر تھے۔ کسی وقت میں اُن لوگوں کی فرمایش ہوئی تعصّب تو مزاج میں تھا ہی نہیں۔ موج آئی لکھ دیا۔

پوچھا نمازیں پڑھتے تھے۔ کہا ہاں پڑھتے تھے۔ پنج وقتہ۔ لیکن وہی اپنے طریقے پر۔ پوچھا عید کی نماز کہاں پڑھتے تھے۔ کہا اپنے گھر میں۔ سب عید ملنے کو آتے تھے۔ پوچھا حج و زیارتِ کربلا وغیرہ کو تشریف لے گئے تھے۔ کہا نہیں۔ اُن دنوں ریل وغیرہ تو تھی نہیں۔ پوچھا کسی بزرگ سے ارادت تھی۔ کہا مُرید تو کسی کے نہ تھے۔ لیکن ہاں فُقرا کے ساتھ اکثر اُٹھتے بیٹھتے رہتے تھے۔ اور اِن لوگوں کے ساتھ اُن کو ایک خاص عقیدت بھی تھی۔ مکان کے پاس ہی ایک مسجد تھی جو ابھی تک موجود ہے۔ اس میں غلام رسول ایک بزرگ رہتے تھے بہت بڑے مشائخ تھے پیری مُریدی کرتے تھے۔ اِن میں اُن میں بڑا ربط تھا۔ وہ بھی آتے تھے۔ یہ بھی اُن کے ہاں جاتے تھے اِنھی غلام رسول کو لوگ خواجۂ معظم بھی کہتے تھے۔ اِن کی چار بیٹیاں تھیں۔ ایک میرن کو بیاہی تھیں۔ شاہ غلام رسول نے اپنے داماد میاں میرن ہی کو گدی دی۔ اِن کے بعد اُن کا نواسا نثار علی ہوا۔

مولوی وحید آلہ آبادی کے ارشدِ تلامذہ میں سے ایک بزرگ شاہ محمد اکبر صاحب ہیں۔ داناپور میں اُن کا سجادہ ہے۔ ابوالعلائی طریقے میں ان کو فیض ہے۔ چوں کہ حضرت میر ابوالعلا کا مزار متبرک[۱] اکبرآباد میں ہے یہ

[۱] عرس نویں صفر کو ہوتا ہے۔

ہر سال وہاں جاتے ہیں اور عرس کی مشاطگی سے شاہدِ عقیدت کو دُلھن بنا کرے آتے ہیں۔ مریدوں کی ان کے وہاں ایک بڑی جماعت ہی۔ ان کی عقیدت مندانہ مہمان نوازی کبھی کبھی ان کو چھ چھ مہینے بھی وہاں روک رکھتی ہی۔ غرض یوں اُن کی زندگی کا بہت بڑا زمانہ آگرے میں گزرا ہی۔ اور وہاں کے خانقاہی صوفیانہ قصص پہ اُن کو غالباً زیادہ عبور حاصل ہی۔ ایک دوست کی وساطت سے نظیر کے مذاقِ تصوف کی نسبت انھی سے یہ حالات معلوم ہوے:۔

حضرت مولٰنا فخرالدین جو دہلی کے اکابر مشائخ میں تھے اور اکثر شہزادے اور امرا اُن کے مُرید تھے؛ ایک دفعہ اکبرآباد تشریف لائے اور حضرت سیدنا میر ابوالعلاے اکبرآبادی کے مزار مبارک پر چند ماہ مُعتکف رہے۔ اسی زمانے میں حضرت مُلّا (کتابوں میں میر لکھا ہی) محمدی بدایونی المتخلّص بہ بیدار جن کا مزار اکبرآباد کناری بازار دانت کے کٹرے میں واقع ہی۔ یہ نظیر کے بڑے دوست تھے۔ یہ اور نظیر دونوں حضرت سیدنا میر ابوالعلاے اکبرآبادی کے مزارِ مبارک کے حاضر باش تھے۔ وہیں مولٰنا سے ملاقات ہوئی اور اُن کے حلقۂ استرشاد میں آئے اور وہیں سے مذاقِ تصوّف پیدا ہوا۔ میر محمدی بیدار کا حال باطن یوں تحریر کرتے ہیں۔ اصل ان کی دہلی ہی۔ ذی علم آدمی تھے۔ عہدِ شباب کو عرب سرا میں بسر کیا جو شاہجہاں آباد سے تین کوس ہی۔ حضرت مولوی محمد فخرالدین صاحب کے آگے سرِ عقیدت جھکایا اور اُن کے انفاس متبرکہ سے فائدہ ظاہری و باطنی اُٹھایا۔ آغازِ صبح پیری میں اکبرآباد تشریف لائے۔ کٹرۂ دنداں فیل میں قیام کیا۔ دو دیوان کے مالک ہیں۔ اُردو میں خضرِ شُعرا میر درد سے ان کو فیضِ سخن حاصل تھا اور فارسی میں مرتضیٰ قلی بیگ فراق سے۔ جدِ امجد راقم سے اُخوت برتتے تھے۔

جب مولٰنا فخرالدین کا ذکر آہی گیا ہی تو کچھ اُن کے حالات اور کمالات بھی سُن لینے چاہییں۔ ڈاڑھی

خشخشی رہ کھتے تھے۔ مسی بھی لگاتے تھے۔ پان کی گلوری بھی ہر وقت منھ میں دبی رہتی تھی۔ کپڑے بھی نفیس پہنتے تھے۔ معمول اُن کا یہ تھا کہ ہر روز جامع مسجد نماز کو جاتے۔ ایک دن کسی شہدے نے دیکھا کہ مولٰنا چھیلا بنے مسجد جارہے ہیں۔ یہ کم بخت تو غضب ہی کے ہوتے ہیں۔ کڑک کر وہیں سے یوں آوازہ کسا کہ اب او مکّار کہاں جاتا ہی۔ یہ کیوں تو نے شہزادوں کو مکر کے جال میں پھانس رکھا ہی اور کیوں اپنے ساتھ اُن کی مٹی بھی پلید کرتا ہی۔ مولٰنا سُن کر مسکرائے۔ اور آدمی سے کہا کہ اِس کو دو روپے دے دو۔ اب روز کا یہ معمول ہوا کہ شہدا ان پر آوازے کسے اور وہ اِس کو دو روپیہ دلوا دیا کریں۔ رفتہ رفتہ یہ خبر پھیلی تو لوگوں نے اُس شہدے کو ڈرایا کہ کم بخت تو اتنے بڑے بزرگ کو یوں کہا کرتا ہی۔ خدا کے غضب سے نہیں ڈرتا۔ بچا کسی دن بد دعا کردیں گے تو پھر کہیں ٹھکانا بھی نہ رہے گا۔ یہ سُن کر شہدا بھی جی میں ڈرا۔ دوسرے دن جو مولٰنا اُدھر سے گزرے تو اُس نے کچھ کہا سنا نہیں۔ جب حضرت مسجد سے لوٹ چلے تو شہدے نے کہا حضرت میرا معمول۔ آپ نے فرمایا اور میرا معمول۔ سبحان اللہ کیا لوگ تھے اور کیا نفوس تھے۔

لطیرؔ کو اِس میں شک نہیں کہ گروہ صوفیہ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ وہ چاہے کسی کا مُرید ہو یا نہ ہو لیکن اُس کا دل خوش عقیدگی کے نور سے روشن تھا۔ مشایخ صوفیہ اُس کے کلام سے استنباط کرتے ہیں کہ وہ صاحب نسبت تھا۔ واقعی جب تک کوئی بات دل میں نہ ہو کلام اِس قدر پُر اثر ہو نہیں سکتا۔ تصوف کے مذاق میں جو مضمون لکھتا ہی ایسا گہرا رنگ اُس کا ہوتا ہی کہ تھوڑی دیر کے لیے تو ہر معمولی دل پر اپنا رنگ جھلکا دیتا ہی[1]۔

مولوی عبد العلی صاحب جائس کے رہنے والے جو کبھی پٹنے کے نارمل اسکول میں مدرس بھی تھے انھوں نے

[1] یہیں بیان ہُسے جو اہلِ دل اکثر یہ کہتے ہیں ؏ چھوٹا سا اک لطیر بھی ہی خاکِ پائے دل ؎

اِن کے کمال کی نسبت یہ حکایت بیان کی کہ کسی دن میاں نظیر بازار میں چلے جا رہے تھے۔ کسی طرف سے سرکاری پیادہ آیا۔ ان کو مبتذل حال سمجھ کر پکڑا اور اپنی گٹھری اِن کے سر پر رکھی اور کہا چل۔ انھوں نے دم نہ مارا۔ چپکے اُٹھا لی اور آگے آگے چلے۔ پیادہ اب جو نظر کرتا ہی تو عجب تماشا اُس کے پیش نظر ہی۔ گٹھری سر سے بالشت بھر اُونچی ہی۔ نہ زمین پر گرتی ہی نہ آسمان پر اُڑتی ہی۔ میاں نظیر کے ساتھ معلق ہوا میں جا رہی ہی۔ یہ دیکھ کر پیادے کے تو ہوش اُڑے۔ قدموں پر گر پڑا اور بہت معذرت کی۔

دوسری حکایت اتنی عجیب تو نہیں مگر صحیح اور جوہر طبع دکھانے میں اس سے زیادہ بلیغ ہی۔ خود ان کی نواسی نے مجھ سے بیان کیا کہ نانا جان روزانہ تاج گنج سے آگرے جاتے تھے۔ گھوڑے کی سواری ہوتی تھی۔ ایاز خدمت گار اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔ رستے میں جو کہیں گھوڑا کھڑا ہو جاتا تو نہ کوڑا مارتے نہ ایڑ کرتے نہ لگام کا جھٹکا دیتے۔ مرضی پر چھوڑ دیتے۔ خود چلا تو چلا نہیں میاں ایاز آتے اور باگ ڈور پکڑ کر بڑھا دیتے۔

میں نے پوچھا کہ اس اتنی احتیاط کا کیا سبب تھا۔ فرمایا اس کے متعلق کسی زمانے میں ایک واقعہ ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ اسی طرح چلتے چلتے اِن کا گھوڑا اڑ گیا۔ کوڑا جو مارتے ہیں تو پیچھے آ رہا تھا کوئی راہگیر اس کے لگا۔ یہ فوراً گھوڑے پر سے اتر پڑے۔ اور قدموں پر گر پڑے۔ بہت معذرت کی۔ غضب تو یہ اِصرار تھا۔ کہ کوڑا حاضر ہی۔ تو بھی مجھے کوڑا مار لے۔ مجھ سے بے شک تقصیر ہوئی جب تک تو کوڑا نہ مارے گا مَیں کل نہیں پانے کا اور تیری جان نہیں چھوڑنے کا۔ یہ ادا دیکھ کر کسی کے دل میں غصہ کب رہ سکتا ہی۔ مارنا تو کجا مگر اصرار جب حد سے بڑھا تو کچھ یوں ہی رسم اُس نے ادا کر دی۔ اُسی دن سے اُنھوں نے ہاتھ میں کوڑا رکھنے ہی سے توبہ کی۔

میرزا نوازش علی بیگ کہتے تھے کہ خلیفہ گلزار علی بھی میاں نظیر کی ولایت کے قائل تھے وہ کہتے تھے کہ جب تک آبا جان

فالج نہیں گرا تھا - میں نہایت بدشوقی کے عالم میں پڑھتا رہا - اکثر پڑھنے سے جان چرا تا - ابا نے مجھ کو اپنے ساتھ لے لیا ہے - جا رہا ہوں چلتے چلتے کلیجہ تھام کر یکایک چیخ اُٹھا - ابا نے پوچھا خیر ہے - کہا پیٹ میں شدت کا درد ہے - چھریاں لگ رہی ہیں - وہیں سے واپس ہو گیا - یہ معاملہ ایک دو دفعہ نہیں بیسیوں دفعہ ہوا - اسی طرح کے اور سیکڑوں حیلے ایجاد ہوا کرتے تھے - لیکن جب اُن پر فالج کا مادہ آ گرا - تین روز تک بیہوش رہے - چوتھے روز اُن کو ہوش آیا - تو اُنھوں نے پوچھا کوئی میری جگہ پڑھانے بھی گیا - میں نے کہا آپ کے سوا یہاں پڑھانے کی قابلیت کس کو ہے - میں نے ابھی گلستاں بھی تمام نہیں کی - وہ لوگ ظفر ابوالفضل پڑھتے ہیں - کہا جاؤ بھی تو سہی - ارشاد سے اُن کے گیا اور اُن کی دُعا سے کچھ ایسا جوہر کھلا کہ پھر کوئی کتاب مشکل ہی معلوم نہ دی - حقیقۃً یہ بھی اُن کا ایک تصرف تھا -

---

نظیر کا مذاقِ موسیقی

نظیر کے ہر فقرے سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ بڑا کَن رسیا تھا۔ یوں تو شُعرا کے لیے کچھ نہ کچھ مذاقِ موسیقی کا ہونا ضروری ہی لیکن ہم نظیر میں وہ خاص قدرتی مادہ پاتے ہیں جو اچھے موسیقی دانوں کے حصے میں آتا ہی وہ آوازوں کی رتبہ شناسی کا بڑا ماہر پروفیسر ہی۔ وہ اکثر اپنے کلام میں بعض خاص موقعوں پر بعض خاص اثر پیدا کرنے کی ضرورت سے الفاظ کو اس انتظام سے ترکیب دیتا ہی کہ معانی اور صورتِ عبارت میں ساز اور گویے کا سا دلچسپ اتحاد پیدا ہوتا ہی۔ لڑائی یا زور آزمائی یا اسی قسم کے اور مضامینِ مردانہ وہ جب بیان کرتا ہی اکثر ٹے اور ڑے یا اسی قسم کے بعض خاص حروف کا اس سلیقے کے ساتھ اہتمام کرتا ہی کہ معلوم ہوتا ہی واقعی چوٹیں چل رہی ہیں اور میدانِ معرکہ اپنی خاص آوازوں سے گونج اُٹھا ہی۔ خیبر کی لڑائی میں ۔سنگھاڑا۔ کڑاڑا۔ کو قافیے میں ڈال کر نظم میں ایک حربی شان پیدا کر دی ہی۔

جب کشتی کی ٹھہری تو وہیں سر کو جو جھاڑا	للکارتے ہی اُس نے ہمیں آن لتاڑا
گہ ہم نے پچھاڑا اُسے، گہ اُس نے پچھاڑا	اک ڈیڑھ پہر ہو گیا کشتی کا اکھاڑا

گر ہم بھی نہ ہارے، نہ ہٹا ریچھ کا بچا

جہاں گانے بجانے اور بزمِ نشاط کی دھوموں کا ذکر ہوتا ہی وہاں اُسی فطری موسیقی خیز سلیقے سے وہ ایسے ایسے الفاظ اکٹھے کرتا ہی اور اس ترکیب سے، کہ صاف معلوم ہوتا ہی مجلس جمی ہوئی ہی۔ پکھاوج اور جوڑی[1] کی جوش انگیز آوازیں صاف آ رہی ہیں۔

[1] جوڑی وہ منجیرے جو طبلے کے ساتھ بجائے جاتے ہیں۔

جن شعروں میں الفاظ سے ساز کا کام لیا گیا ہے وہ بکثرت ہیں، مگر چند ممتاز مثالیں تشریح کے لیے ذیل میں لکھی جاتی ہیں۔

کچھ طبلے کھڑکے تال بجے کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی ۔ کچھ جھڑپیں بین رَبابوں کی، کچھ سارنگی اور چنگ بجی
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے، کچھ ڈھمڈھمی اور مُنہ چنگ بجی ۔ کچھ گھنگرو کھڑکے جھم جھم جھم، کچھ گت گت پر آہنگ بجی
ہے ہر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھا یا ہولی نے

محبوب پری رو پیاروں کی ہر جانب نوک جھوکی ہے ۔ کچھ آن رنگیلی چلتی ہے، کچھ بان اُدھر سے روکی ہے
کچھ سینیں ترچھی سحر بھری، کچھ گھات لگاوٹ خو کی ہے ۔ کچھ شور اہا ہا ہا ہا کا، کچھ دھوم اہو ہو ہو کی ہے
یہ عیش، یہ حظ، یہ کام، یہ ڈھب ہر آن جتایا ہولی نے

بحر بھی اس نظم کی ہولی کے مضامین کے لیے کس قدر موزوں ہے۔

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا، بیٹھے ہوں گلرو رنگ بھرے ۔ کچھ بھیگی تانیں ہولی کی، کچھ ناز و ادا کے ڈھنگ بھرے
دل بھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے ۔ کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے، کچھ عیش کے دم مُنہ چنگ بھرے
کچھ گھنگرو تال چھنکتے ہوں، جب دیکھ بہاریں ہولی کی

اس ڈھنگ رنگیلی مجلس میں وہ رنڈی ناچنے والی ہو ۔ منھ جس کا چاند کا ٹکڑا ہو اور آنکھ بھی مے کی پیالی ہو
بدمست بڑی متوالی ہو، ہر آن بجاتی تالی ہو ۔ مے نوشی ہو، بیہوشی ہو، بھڑوے کی منھ میں گالی ہو
بھڑوے بھی بھڑوا بکتے ہوں، جب دیکھ بہاریں ہولی کی

اور ایک طرف دل لینے کو محبوب بھوئیوں کے لڑکے ۔ ہر آن گھڑی گت بھرتے ہوں کچھ گھٹ گھٹ کے، کچھ بڑھ بڑھ کے

مصحفی: بزمِ سرودِ خوباں میں گو مردنگیاں شاہین بجیں * ساتھ فقیر کی ڈھولک کے اب ڈھمڈھمیاں رنگین بجیں۔

کچھ ناز جتا دین لڑ لڑ کے، کچھ ہولی گا وین اڑ اڑ کے	کچھ لچکے شوخ کمر پتلی، کچھ ہاتھ چلے، کچھ تن پھڑکے
کچھ کافرنین مٹکتے ہوں، جب دیکھ بہاریں ہولی کی	

اسی طرح اور مقامات بھی ہیں جہاں لفظ باجے کا کام دیتے ہیں۔ چڑیوں کا اگر کہیں ذکر ہی تو معلوم ہوتا ہی اُن کا ایک جھنڈ پیش نظر ہی اور اُن کے چہچہے کی آوازیں پیہم آرہی ہیں۔ اگر وحوش کا کہیں مذکور ہی وہی اپنا شور زور وشور کے ساتھ سُنا رہے ہیں۔

یہ تعبیرِ صوت ایک خاص سلیقۂ موسیقی دکھاتی ہی۔ جو بغیر اسکے کہ انسان میں فطرت کی طرف سے ودیعت ہو یوں آدمی کو مُیسر ہو نہیں سکتا۔

نظیر کی نواسی نے مجھ سے بیان کیا کہ میں جب نانا جان کے پاس جاتی تھی تو وہ میرے ساتھ بہت محبت کرتے تھے اور مجھ کو دیکھ کر یہ گیت گانے لگتے تھے:۔

مُوہن میرے آئے۔ للن میرے آئے۔ کنجن میرے آئے

موج جو ایک مشہور کلانوت تھا اُس کو نظیر ہی سے تلمذ تھا۔ اور اُس کا بیٹا لہر بھی انھی کی شاگردی کا دم بھرتا تھا۔ موج علاوہ اِس کے کہ فن موسیقی میں بہت بڑی مہارت رکھتا تھا گیت تصنیف بھی کرتا تھا۔ اور کبھی کبھی شعر بھی موزوں کرتا تھا۔ کیا گیت اور کیا غزل دونوں کو میاں نظیر کی اصلاح بے نظیر بناتی تھی۔ موج کے گیت یوں تو بہت مشہور ہیں مگر ایک گیت جو باعتبار مضمون کے بالکل نظیر کے صُوفیانہ مذاق سے مالامال ہی اور یقیناً اُن کی اصلاح نے اِس کی فصاحت کے لیے قائم کی ہی اِس کا ذیل میں درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہی اِس گیت کی دُھن زیلف کی ہی۔

آستائی۔ بڑھیا سوچ سوچ من میں پچھتائی، اپنا اب کا کیجے چرکھا بھیا پُرانا۔ چلتا نہیں پھیر پھیر ہوں آرہی

انترا- ڈگمگات پڑی - ہلنے لگی لاٹ مال، لرجبت ہی گریا- تکل[۵۱] بل پریو- چمرک[۵۲] ٹوٹ دھکرا بھیو- بھل نیکھریا[۵۳] نیاری-

ابھوگ- آوے گا اُگاہی[۵۴] والا- مانگے گا جمع جب- سُوت نہ کپاس، نہیں گدُڑی کی آس- موج کہیں اب عمر گنوائی یوں ہی اپنی ساری-

نظم میں بھی اِس مضمون کو دوسرے پہلو سے ادا کیا ہی:-

نوچی جو وفادار کوئی پاس رہی آ		تو روئی ملی، ورنہ لگی کاتنے چرخا	
جب کُبڑی کمر ہوگئی اور سر ہوا گالا		مُنھ سوکھ کے چُرخ ہوا اور تن ہوا تکلا	نا[illegible]

پھر روئی کو چرخے سے کما کھاتی ہی بڑھیا

نظیر کی بہتیری غزلیں انھی میاں موج کی وجہ سے مشہور ہوئیں- کیوں کہ یہ خود اپنی طرف سے یا نظیر کے ارشاد کے مطابق اُن کی دُھنیں قائم کرکے دل فریب طور سے گاتے تھے اور تمام شہر میں مشہور ہو جاتی تھیں- بہت سے دوہرے بھی یہ کہا کرتے تھے وہ بھی گانے کے مصرف میں آتے تھے- میاں ریاض ایک شخص ہیں- آگرے میں اُن سے مجھے ایک دوست نے ملایا- اُن کو گانے کا شوق ہی اور اچھا گاتے ہیں- مجھے بھی اپنے گانے سے محظوظ کیا اور نظیر کا وہ ترکیب بند فارسی و ہندی سُنایا جو اس طرح شروع ہوتا ہی-

مجھے ای دوست تیرا ہجر اب ایسا ستاتا ہی		کہ دشمن بھی مرے احوال پہ آنسو بہاتا ہی	

۵۱ تکل = تکلا-
۵۲ چمرک- چمرخ- وہ چمڑے یا مونج کی تپلی سی چیز جو چرخے کی لاٹھ اور دونوں گڑیاؤں میں رہتی ہی اور اُس کے اندر تکلا پھرتا ہی-
۵۳ نیکھڑی چرخے کے چکر کا وہ ہر ایک حصہ جو اُس کے مندلے میں ٹُھکا ہوا ہوتا ہی-
۵۴ اُگاہی والا تحصیل دار ملک الموت نکیرین -

یہ بیتابی، یہ بیخوابی، یہ بے چینی دکھاتا ہے
اگر کچھ منھ سے بولوں تو مزا الفت کا جاتا ہے
مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد

نہ دل لگتا ہے گھر میں اور نہ صحرا مجھ کو بھاتا ہے
وگر چپکا ہی رہتا ہوں، کلیجا منھ کو آتا ہے
وگر دم در کشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

کوک کروں تو جگ ہنسے اور چپکے لاگے گھاؤ
ایسو کٹھن سنیہ کا کس بدھ کروں اپاؤ

مانڈ کی دھن میں اُنھوں نے گایا تھا۔ اُداسی کا سماں ایسا چھایا کہ دل لوگوں کے بے اختیار ہو ہو گئے۔

ایک معزز دوست نے ڈھاکے کے مجھ سے کہا کہ اُس نے ایک رنڈی کو وہ غزل بھی گاتے سُنا جس کے دو شعر یہ ہیں ؎ خرامِ ناز سے اُس شوخ نے دامن کو جب جھٹکا + تو میری خاک نے کیا کیا ہوا کے ساتھ سر پٹکا + نہیں گھٹّا عبادت کا ترے ماتھے پہ اے زاہد + نشاں ہے یہ کسی معشوقِ بے پروا کی چوکھٹ کا + گا کر دھن بھی بتائی۔ نہایت پیاری تھی۔

نظیر کی عُمر کا بہت بڑا حصّہ عیش و نشاط کی مجلسوں میں گزرا تھا۔ اُس کی نظر سے بہت سی محفلیں گزر رہی تھیں جن میں عمدہ سے عمدہ رنڈیاں اور کلانوت موسیقی میں اپنا جوہر دکھاتے تھے۔ کوئی اُستاد گویا ایسا نہ تھا جس کو نظیر نے نہ سُنا ہو۔ رنڈیوں کے کوٹھوں پہ بھی اِن کی آمد و رفت جاری تھی، اور وہاں، یہ آتے جاتے، خواہ مخواہ مذاق موسیقی سے آشنا ہو گئے تھے۔ غرض اُن کے دماغ میں موسیقی کے متعلق نہایت دل چسپ یادداشت پیدا ہو گئی تھی۔ جب کبھی کسی بزمِ عیش و نشاط کا وہ ذکر چھیڑتے ہیں اُن کے دل میں مضامین قدرتی جوش و خروش کے ساتھ اُبلنے لگتے ہیں اور ناظرین کے لیے ایک اچھی خاصی لفظی بزمِ طرب قائم ہو جاتی ہے۔

جس سے نہایت دل کش تانیں سُنائی دیتی ہیں۔

جس شخص کو اس قدر گانے بجانے کی صحبتوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا اور گویّوں اور کلانوتوں سے سابقہ رہا ہو وہ اگر معمولی آدمی بھی ہو تو بہت سی اصطلاحوں سے واقف ہو جا سکتا ہے چہ جائے کہ ایک ایسا مُستند شاعر جس کی ذہانت کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر باایں ہمہ مجھ کو کُلیات بھر میں گنتی کے چند شعر ملے ہیں جن میں نظیر نے کوئی موسیقی کی اصطلاح درج کی ہے۔

اِک پاؤ سیر آٹے کی دل میں لگا کے آس
پھر راگ بسنتی کا ہوا آن کے کھٹکا
جھنکار تال کی ہے اور طبلے کی کھڑک ہے

گوری کا وقت ہووے تو گاتا ہے وہ بھیاس
دھونسے کی برابر وہ لگا باجنے مٹکا
گونڈا اور رلار کے ساتھ آواز کی گمک ہے

موسیقی سے لذت اُٹھا اُٹھا کر جو بعض پُر لطف بند لکھے ہیں اُن میں سے بعض یہ ہیں :-

پھر آن کے عشرت کا مچا ڈھنگ زمیں پر
ہر دل کو خوشی کا ہوا آہنگ زمیں پر

اور عیش نے عرصہ ہے کیا تنگ زمیں پر
ہوتا ہے کہیں عیش کہیں رنگ زمیں پر

بجتے ہیں کہیں تال کہیں زنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

گھنگرو کی پڑی آن کے پھر کان میں جھنکار
طبلوں کے ٹھکے طبل پہ سازوں کے بجے تار

سارنگی ہوئی بین طنبوروں کی مددگار
راگوں کے کہیں غُل، کہیں ناچوں کے بندھے تار

ڈھولک کہیں جھنکارے ہے مردنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

تال - رنگ - گھنگرو - سارنگی - بین - طنبورے - طبلہ - ڈھولک - مردنگ - سبھی پڑے بج رہے ہیں۔

گا گا کے پکاریں، کہیں رنگوں کی چھڑک ہے
طبلوں کی صدائیں، کہیں تالوں کی جھنک ہے

مینا کی بھبک اور کہیں ساغر کی چھلک ہے
تالی کی بہاریں، کہیں ٹھلیا کی کھڑک ہے

بجتا ہے کہیں دف کہیں مرچنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

چڑیوں کی موسیقی۔

کالی گھٹا ہے ہر دم برسے ہیں منہ کی دھاریں
کوئل پپیہے کوکیں اور کوک کر پکاریں

اور جس میں اُڑ رہی ہیں بگلوں کی سو قطاریں
اور مور مست ہو کر جوں کو کلا جھنکاریں

آیا رچل کے دیکھیں برسات کا تماشا

وقت سحر کی رچیں کیا کیا ہوں ہوں ہوں کرتی ہیں
مرغے بولے ککڑوں کوں کوں، مرغیاں کوں کوں، کرتی ہیں

ہوں ہوں ہوں ہوں کر کر ذکر کن اور فیکوں کرتی ہیں
طوطیاں بھی سب بادمیں اُس کی بھتوں بھتوں کرتی ہیں

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں چوں چوں کیا سب بچن بچن کرتی ہیں

قمری بولے حق سرہٗ، بلبل بولے بسم اللہ
دادر مور پپیہے کوئل کوک رہے اللہ اللہ

کبک ٹیٹری چاروں قل اور تیتر بھی سبحان اللہ
فاختہ کوکو، یتھو ہو ہو طوطے بولیں حق اللہ

۵۱ حق اللہ پاک ذات اللہ یہ جملہ اکثر طوطے کو یاد کراتے ہیں۔ ۵۲ دادر مینڈک گیتوں میں یہ لفظ مور کے ساتھ اکثر آتا ہے۔

سانجھ سویرے الخ

ڈر کر جانوروں کے چیخنے چلّانے کی تصویر:-

سن سن وہ چیخیں اُن کی چِڑیاں جو چونچوں آئیں
سارو، بٹیر، مینا، چمگاڈریں بھی آئیں

کوّے پکارے غاں غاں، چیلیں بھی چلچلائیں
مرغوں نے ککڑوں کوں کی، کلکلیاں پھڑپھڑائیں

سو سو طرح کی دھومیں اک دم ہیں کر دکھائیں
اِس ڈھب سے ہم نے یارو کل بلبلیں لڑائیں

چلّائے مور سارس اور پھڑپھڑائے گھگھو
کُتّے بھی بھونکے بھوں بھوں گیدڑ پکارے ہو ہو

گد اور چغد دہاڑے[۵۱] اور پھڑپھڑائے اُلّو
بھڑوے گدھے بھی رینگے[۵۲] کر اپنی ڈھینچو ڈھینچو

سو سو طرح کی دھومیں اک دم ہیں کر دکھائیں
اِس ڈھب سے ہم نے یارو کل بلبلیں لڑائیں

ایسی طرح بہتیری مثالیں ہیں جن سے فصاحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ نظیر کو مفہوم کو باعتبار آواز الفاظ کے ساتھ مطابق کرنے کا ایک خاص سلیقہ ہے۔ جہاں بھنگ کے گھُٹنے کا ذکر کرتا ہے ٹ اور ڑ وغیرہ ثقیل حرفوں کی کثرت سے ایک ایسی ترکیب پیدا کر دیتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے واقعی کونڈی اور سونٹا کھڑک رہا ہے۔ اور یہ سلیقہ ایک فطری مادۂ موسیقی کا اُس کی ذات میں بتاتا ہے۔

۵۱ دہاڑنا۔ شیر کا گرجنا چنگھاڑنا۔ غل مچانا چلّانا شور کرنا۔

۵۲ رینگنا۔ گدھے کا بولنا ڈھینچو ڈھینچو کرنا۔

(نظیر کے شاگرد)

نظیر کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک تو معلم کی۔ دوسری شاعر کی۔ دونوں حیثیتوں سے اُن کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ معلّمی کی تو اخیر عمر تک اُنھوں نے نوکری ہی کی۔ شاعری میں گو کسی کے نوکر نہ تھے۔ لیکن کمال شاعری کا کچھ ٹیکس سا معلوم ہوتا ہی کہ آدمی اپنی بہت ساری اوقات نومشقوں کی اصلاح و تربیت میں صرف کرے۔ اس ٹکس کو نظیر نے بھی اپنی طبعی فیاضی سے بڑی سیرچشمی کے ساتھ ادا کیا تھا۔ گو اُس زمانے میں آنے جانے کے سامان اس قدر کم خرچ بالانشین نہ تھے لیکن اس پہ بھی لوگ دُور دور سے آتے تھے اور شرف تلمذ سے مشرف ہوتے تھے۔ شہر میں تو شاید بہت ہی کم طبّاع ہوں گے جو کھنچ کر اس کے حلقۂ شاگردی میں نہ آگئے ہوں۔ جن بزرگوں کو کھُلی کھُلی شاگردی بعض وجوہ سے خلافِ شان معلوم ہوتی تھی وہ صحبت سراپا تربیت سے بالکنایہ کسب فیض کرتے تھے۔ اتنے تو شاگرد لیکن امتداد زمانہ کے سبب آغازِ تلاش میں تین چار سے زیادہ مجھ کو معلوم نہ ہو سکے۔ ایک تو خود ان کے بیٹے خلیفہ گلزار علی اسیر۔ دوسرے میاں مداری ضمیر۔ اور دو ایک اور۔ یہ تو کسی طرح خیال ہوا نہیں کہ نظیر کے کل میں یہی تین چار شاگرد ہوں گے۔ ہوا تو یہ افسوس ہوا کہ اتنے بڑے شاعر کے ساتھ اہل زمانہ نے کتنی بڑی بدسلوکی کی ہی۔ وہ تو خدا حکیم میر قطب الدین باطن کا بھلا کرے جنھوں نے جوش غیرت میں آکر گلشن بے خار کے جواب میں گلستاں بے خزاں (المعروف بہ نغمۂ عندلیب) لکھی۔ اور پوری طرح نظیر کا حق شاگردی ادا کیا۔ گلشن بے خار کے مولف نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ حکیم مومن خاں کے ارشد تلامذہ میں داخل تھے۔ ایک تو خود نوابی مزاج اوپر سے بڑے حکیم مومن خاں کی تعلیم جو دنیا میں سوا اپنے کسی کو

مال موجود ہی نہ سمجھتے تھے۔ ذوق کوئی چیز نہیں۔ شاہ نصیر کو کیا آتا ہے۔ فلاں مہمل گو ہے۔ فلاں جھک مارتا ہے۔ غرض اسی قسم کی باتیں اُن کی زبان پر رہتی تھیں۔ فارسی میں اپنے آپ کو ناصر علی کا ہم پلہ جانتے تھے۔ اردو میں بیدل تصور کرتے تھے۔ اتنے بڑے مغرور شاعر کی تعلیم ایک ذی استعداد طبّاع نواب کے دل پر کیا اثر پیدا کر سکتی ہے۔ اُس پر پہنچی میرزا غالب علیہ الرحمۃ کی شہ۔ بقول میر؎ سمند ناز کو یک اور تازیانہ ہوا۔ تذکرے کا نام تو رکھا گلشنِ بے خار مگر؎ برعکس نہند نامِ زنگی کافور۔ لکھا نہایت پُرخار معدودے چند (۱) مرزا نوشہ غالب (۲) صاحبہ مومن خاں کی آشنا (۳) مولوی محمد صدرالدین آزردہ۔ (۴) نواب مصطفےٰ خانِ شیفتہ (۵) رمجو نواب مصطفےٰ خاں کی آشنا تخلص نزاکت۔ (۶) غلام علی خاں وحشت (۷) مومن خاں کے سوا ہر ایک کے ساتھ خلش، ہر ایک کے ساتھ چھیڑ۔ اس عام کاوش میں میاں نظیر کی بھی شامت آگئی۔ دہلی سے آگرہ اِس قدر قریب۔ نظیر کی اُستادی اس قدر مشہور لیکن وہاں تو کاوش نے کان میں ہنوز روئی بھر رکھی تھی کوئی نظیر کا حال سُناتا تو کیوں کر سُناتا اور وہ سنتے تو کیوں کر سُنتے۔ نظیر کے حالات اس بے رخی سے لکھے ہیں جس کا کوئی پایاں نہیں۔ گویا وہ ایک محض گم نام شاعر تھا اور اُس کے شاگردوں کو بھی اچھی طرح یاد نہیں کیا۔

شیفتہ کا تذکرہ جب آگرے میں پہنچا تو اُن دنوں خلیفہ گلزار علی کی شاعری کی جُوانی تھی۔ شاگردوں کا ایک جم غفیر ہر وقت ساتھ رہتا تھا۔ دعوے کے ساتھ ہر وقت مونچھوں پر تاؤ پھیرا کرتے تھے۔ تذکرے کو دیکھ کر آگ ہوگئے۔ حکیم میر قطب الدین باطن اُن کے والد کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اور معقول استعداد رکھتے تھے گو عمر نے اُن کی آگ کو کسی قدر افسردہ کر رکھا تھا لیکن خلیفہ صاحب کی زبان آوری نے پنکھا جھل دیا آگ بھڑکی اور غضب بھڑکی۔ اب گلستانِ بے خزاں میں یہ جو گیندے یا ہزارے ہیں غصے کے انگارے

اور غضب کے شرارے ہیں۔ گلشنِ بے خار کی شیدا بلبلیں چیخ اُٹھیں کہ شیفتہ کے گلشن میں باطن کی آتش بیانی سے پھول پڑا۔ آگ لگی۔ انشا کہتے ہیں۔ سے گلشن میں مگر پھول پڑا اُس گُلِ رو سے ؛ کیوں ورنہ چلی آتی ہے یوں بادِ سحر گرم ؛۔)

جب گلشنِ بے خار چھپ کر شائع ہوئی تو اُس میں علی العموم یہ بات دیکھی گئی کہ نظیر اور اُس کے دوستوں اور شاگردوں کو نہایت بُری طرح یاد کیا گیا ہے۔ نظیر کے شاگردوں میں اُس کا چرچا ہوا۔ نظیر اُس زمانے سے بہت پیشتر مر چکے تھے۔ دلوں میں ایک دلی کی جگہ حاصل ہو چکی تھی۔ شیفتہ کی اُس مرحوم کے ساتھ گستاخی اُس کے شاگردوں اور معتقدوں کو ناگوار ہوئی اور آخر باطن کو لوگوں نے گھیرا اور ۱۲۶۱ھ میں اُن سے یہ تذکرہ لکھوایا۔

ہرچند یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے تذکرہ نویسی کا حق اچھی طرح ادا کیا ہے اور شُعَرا کے حالات تحقیق و تلاش کے ساتھ کچھ زیادہ لکھے ہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ شیفتہ کے علے الرغم جن جن کو انھوں نے بُرا لکھا ہے چُن چُن کر اُنھی کو اُنھوں نے خوب سراہا ہے خصوصاً اپنے اُستاد اور اپنے اُستاد کے جرگے کے لوگوں کو بہت کچھ ظلمتِ گمنامی و معائب سے نکالا ہے۔ جس قدر بلا استحقاق و با استحقاق ہر ایک کی تعریف کی ہے اُسی قدر آزادی کے ساتھ شیفتہ۔ آزردہ۔ مومن۔ غالب۔ وغیرہ کی مذمت بھی کی ہے۔ باطن کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن چند شاعروں کو وہ بہت مانتے تھے۔ سودا جن کو طُورُ الشُّعَرا کہتے ہیں۔ درد جن کو خضرُ الشِّعر کہتے ہیں میر جن کو مُرشدُ الشُّعَرا کہتے ہیں۔ میرزا جن کو مسجودُ الشعرا کہتے ہیں۔ اور نظیر جن کو ہادیُ الشُّعر کہتے ہیں۔ اِن شُعَرا کے ماننے کا غالباً زیادہ سبب یہ ہے کہ یہ اُن کو فقط شاعر ہی نہیں بلکہ اہلِ دل اور صاحبِ باطن اور مظہرِ کشف و کرامات بھی جانتے تھے۔ ولی کو والدُ الشُّعَرا کا بزرگ خطاب دیا ہے۔

عبارت گلشنِ بے خزاں کی اُردو ہی۔ اُردو اس کی کچھ نورتنِ جہور کی وضع پر ہی۔ وہی التزام ضلع مثلاً کہیں جولاہوں کا ضلع ہی۔ کہیں صرف کا۔ کہیں نحو کا کہیں فتوی فرائض کا۔ کہیں نجوم کا۔ رعایتِ لفظی سے اکثر شاعروں کے حالات کو چمکایا ہی۔ دیباچہ بھی رعایتِ لفظی کا گُلہ پات ہی۔ غزل۔ مُخمس۔ ترکیب بند رُباعی کے گل بوٹے استعارے اور تشبیہ کے نور سے چمک رہے ہیں۔ اکثر جگہ عبارت اُکھڑی اُکھڑی سی ہی اور جابجا التزام قافیہ کے سبب طرزِ بیان مُضحک ہوگئی ہی۔ مثلاً قاسم کے حال میں لکھتے ہیں۔ قاسم ساکنِ بریلی۔ ان کی تقسیم دیکھیے کہ بانٹ میں مجھ کو یہی ملی ایک بیت اکیلی۔ لیکن جہاں وہ روانی میں سیدھی سادی عبارت لکھ گئے ہیں بُری نہیں ہی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہی کہ اس شخص کو زبان پر قُدرت ہی اگر یہ شخص قافیہ پیمائی اور ضلع جگت کا بندہ نہ ہوگیا ہوتا تو تذکرہ بہت خاصہ رہتا۔

غالب اور آزردہ اور مومن خاں کی خوب خاک اُڑائی ہی۔ آزردہ کے ذکر میں حرکت کی راکے سکون پر بہت اُلجھے ہیں۔ اور کسی قدر اپنی کم نظری کا ثبوت دیا ہی۔ اور اس بات کو بھول گئے کہ خود اُن کے اُستاد کے کلام میں اس قسم کا سکون کس قدر ہی۔ مومن خاں کا ذکر ایک صفحے تک جولاہوں کے لوازماتِ بافندگی کے ضلع میں ہی اور نہایت ہی مُضحک ہی۔ اگر کہیں ضلع خوبی کے ساتھ چمکا ہی تو مومن خاں ہی کے تذکرے میں۔ اس خاص ضلع کی سفارش غالباً مومن خاں کے نام نے کی ہوگی۔ غالب کے بھی لتے لیے ہیں خصوصاً اُن کی شراب خواری قماربازی غرور اور شیخیت کا خوب خاکا اُڑایا ہی۔

یہ ایک عجیب بات ہی کہ وہ لکھتے ہیں غالب جن دنوں اکبرآباد میں تھے بادی الشعرا یعنے میاں نظیر سے استفادہ کرتے تھے۔ باطن کی عبارت اس مقام پر بلفظہٖ یوں ہی۔

غالب و اسد تخلص۔ اسداللہ خاں نام۔ ملقب بمرزا نوشہ۔ آپ دو تخلص کرتے ہیں۔ کچھ تو سبب ہی

کہ دو تخلص کرنے پر دل دھرتے ہیں۔ از بنائرِ غلام حسین خاں کیدان۔ قبل اس سے جد دہلی (اکبر آباد) میں ان کی سکونت کا مکان۔ اُستادانِ باشعور مثل خلیفہ معظم جو بڑے معظّم و مکرّم اور ہادی شعرا جو بے نظیرِ روزگار تھے جن سے تعلیم پائی۔ ایامِ صبا سے ببرکتِ انفاس متبرکہ ان اوستادوں کے مرتبۂ علم پہنچے تب اُن کی فکرِ رسا نے یہ صورت دکھائی۔ کیوں نہ خوش گو ہوں۔ جن کے ایسے اوستاد ہوں۔ چوں کہ وہ اُستاد مر گئے۔ یہ جدِ دہلی سے اُدھر گئے۔ اب خواہ شاگردی سے انکار کریں۔ یا شاید اقرار کریں۔

چوں کہ بے خزاں کے سوا میں نے کہیں اور نہیں دیکھا تھا کہ غالب میاں نظیر کے شاگرد تھے مگر ہم وطنی اور میاں نظیر کا ایک مشہور رِبلاّے لکھتی ہونا یہ دو باتیں ایسی تھیں جو باطن کے بیان کو کسی قدر قرینِ قیاس دکھاتی تھیں میں نے اس کی میرزا غالب کے شاگردوں سے تحقیق کرنی چاہی۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک نیاز نامہ مولوی خواجہ الطاف حسین حالی کو لکھا جو میرزا کے سربرآوردہ شاگردوں میں ہیں۔ اُن کے ہاں سے یہ جواب آیا تذکرہ گلستانِ بے خزاں میں نے خود نہیں دیکھا۔ مگر سُنا ہے کہ اُس میں شیفتہ۔ غالب اور دیگر شُعرائے دہلی کا خوب خاکہ اڑایا ہے اس کی وجہ یہ سُنی گئی ہے کہ نواب مصطفٰے خان مرحوم شیفتہ تخلّص نے اپنے تذکرۂ گلشنِ بے خار میں میاں نظیر کا صرف ایک شعر لکھا ہے۔ اور اُن کے ترجمے میں بھی ایک آدھ لفظ ایسا لکھ دیا ہے جو میاں نظیر کی اولاد یا معتقدین کو شاق گزرتا ہے۔ اسی بنا پر صاحبِ گُلستانِ بے خزاں نے شُعرائے دہلی کی خوب خبر لی ہے۔ غالباً میرزا غالب کو جو اکبر آبادی مولد ہیں اور اُن کی طرف میاں نظیر کے تلمّذ کی نسبت اس وجہ سے کہ دونوں اکبرآبادی اور دونوں معاصرِ یکدگر ہیں قرینِ قیاس بھی ہے۔ اُن کا شاگرد لکھ دیا ہو۔ مگر اس کا منشا ہی رنجش و ناخوشی اور شُعرائے دہلی پہ میاں نظیر کو ترجیح دینے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر بالفرض بچپن میں مرزا کو ایسا اتفاق ہوا ہو تو کچھ تعجب بھی نہیں۔ اس سے نظیر کی عزت زیادہ ہوتی ہے اور مرزا کی عزت کم نہیں ہوتی۔

گو حالی کو شاگردی کا اقرار کرتے ہوئے کسی قدر تامل نظر آتا ہے مگر صاف انکار بھی نہیں کیا۔ اس سے تو بحث نہیں کہ شاگردی آیا اُستاد کے لیے موجب عزت ہے یا شاگرد کے لیے۔ اگر واقع میں غالب نظیر کے شاگرد تھے تو اس قدر پیچ و تاب کی ضرورت نہیں۔ شاگردی بھی ہزار طرح کی ہوتی ہے۔ ایک استاد وہ بھی ہوتے ہیں جو ابجد اور دوسری ابتدائی کتابیں پڑھاتے ہیں۔ اور ایک وہ جو سلّم صدرا شمس بازغہ کا درس دیتے ہیں طرفہ جس طرح اور اُمور میں محال ہے تعلیم میں بھی ہے۔ غالب کو جو کمال حاصل تھا وہ دفعۃً تو ہو گیا تھا نہیں تیرھویں صدی کے بڑے اذکیا میں عبدالرّحیم دہری ہو گزرا ہے لوگ روایت کرتے ہیں کہ اس نے انگریزی بغیر مدد اُستاد حاصل کی۔ لیکن ابجد میں وہ بھی کسی کا شاگرد تھا۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ غالب نے ابجد بھی کسی سے نہ پڑھی ہو۔ ابتدائی کتابیں اگر نظیر سے اُنھوں نے پڑھی ہوں تو کون سی قباحت ہے اور اس میں غالب کی کون سی شان گھٹی جاتی ہے۔

حکیم غلام رضا خان دہلوی جن سے مجھ کو فن طب میں تلمذ حاصل ہے یہ گویا غالب کے متبنّے ہیں۔ اُردوئے معلّٰی کے دونوں حصے انھی کے نام ہبہ ہیں۔ چوں کہ یہ بھی میرزا غالب کے حالات سے بہت واقف ہیں میں نے ان کو بھی اس مسئلۂ تلمذ کے باب میں لکھا۔ اُن کے ہاں سے یہ مضمون لکھا ہوا آیا:

بابت میرزا غالب و نظیر کے جو دریافت فرمایا ہے اس کی مطلقاً اصلیت نہیں صحیح امر تو یہ ہے کہ مرزا نے نہ تو فارسی کلام کسی کو دکھایا نہ اُردو۔ یہ جو مرزا صاحب ہرمزثم عبدالصمد کو اپنا اوستاد لکھتے ہیں اس شخص کا وجود ذہن میں تھا۔ خارج میں نہ تھا۔ چودہ برس کی عُمر میں مرزا صاحب دہلی میں آئے۔ پھر یہیں رہے۔ اُس زمانے میں دہلی میں شاہ نصیر کا بہت شُہرہ تھا بلکہ مرزا صاحب کے خسر الٰہی بخش خان معروف بھی اُنھی کے شاگرد تھے۔ مرزا صاحب نے اپنا کلام نصیر تک کو تو دکھایا نہیں۔ مجھے جو اصلی حقیقت اس معاملے میں معلوم تھی

حوالۂ قلم ہوئی۔

یہ خط پاکر میں نے اُن کو یہ مضمون لکھا کہ آپ لکھتے ہیں تو مجھ کو یقین ہی لیکن میرے پاس خواجہ حالی کا ایک خط آیا ہی اُس میں تو وہ کچھ اقرار سا کرتے ہیں۔ علاوہ بریں مخدومی مولوی سید محمود صاحب آزاد جہانگیر نگری نے یہ روایت بیان کی جو اُنھوں نے غالبًا مولوی عبد الغفور خان نسّاخ سے سُنی کہ مشہور ہی غالب جن دنوں اکبر آباد میں تھے۔ وہاں دو اوستاد تھے۔ میاں نظیر۔ اور میر۔ میرزا نے پہلے دو چار غزلیں میاں نظیر کو دکھائیں لیکن اتنے ہی میں اُن کی اصلاح سے سیر ہو گئے۔ تب ڈرتے ڈرتے ایک غزل میر صاحب کی خدمت میں بھیج دی اور نہایت ادب سے اصلاح کی درخوہست کی۔ وہاں سے اصلاح کی دولت تو حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن میر نے غزل دیکھ کر جو رائے ظاہر کی اُس کو غالب فخر کے ساتھ یاد کیا کرتے تھے۔ میر صاحب نے فرمایا کہ یا تو یہ شخص بہت ہی بڑا شاعر ہوگا یا بالکل مہمل گو ہوگا۔

اس کے جواب میں جو خط آیا اُس کا مضمون یہ ہی۔

معاملۂ غالب و نظیر۔ اس کی اصل یہ ہی کہ غالب نے کوئی غزل نظیر کو نہیں دکھائی۔ مولوی عبد الغفور خان مرحوم کا وہ قول کہ میر تقی کو مرزا صاحب نے غزل بھیجی تھی اور میر نے یہ جواب دیا صحیح ہی مگر نظیر کی یہ اصلاح دینا بالکل غلط ہی۔ نہ مجھے یہ معلوم ہوا اور نہ منشی ہیرا سنگھ جو میرے دوست تھے اور ہر وقت مرزا صاحب مرحوم کے ہاں نشست رکھتے اُن سے میں نے سُنا اور نہ کسی اور ارباب جلسۂ مرزا صاحب سے یہ سُنا۔ مولوی حالی تو گاہ گاہ مرزا صاحب کے ہاں آیا کرتے تھے۔ اُن کی وہاں نشست کچھ زیادہ نہ تھی۔ رہا تذکرۂ حکیم میر قطب الدین باطن میں اس کا لکھنا اس کی اصل آپ کو شاید معلوم نہیں۔ لہذا اُس کی توضیح کرتا ہوں چوں کہ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ نے تذکرۂ گلشن بے خار میں نظیر کی نسبت الفاظ رکیکہ لکھ دیے ہیں لہذا اُس کے کسی شاگرد کو ناگوار ہوا۔ اُس نے

تذکرہ دوسرا لکھا۔ اُس میں پوری پوری عداوت کو صرف کیا۔ جن شُعَرا کی شیفتہ نے تعریف میں مُبالغہ کیا تھا خواہ بوجہِ دوستی یا بوجہِ اعتقاد اُن کی باطن نے جہاں تک مُمکن ہوسکا ہجو کی۔ چوں کہ اُنھیں ممدوحین شیفتہ میں غالب بھی تھے اور اِن کی پیدایش آگرہ کی تھی اِس لیے اِن کی نسبت یہ زیادہ اتہام لگایا کہ وہ نظیر و معظم کے شاگرد ہیں۔ ورنہ اِس کی مُطلق اصلیت نہیں۔

اِن مضامین کے بعد اس کی تجویز مُشکل ہی کہ غالب کو نظیر سے تلمذ حاصل تھا یا نہیں۔ تلمذ کے خلاف میں دو شاہد ہیں۔ حکیم غلام رضا خاں اور خواجہ الطاف حسین حالی۔ اور موافقت میں دو حکیم میر قطب الدین باطن اور مولوی سید محمود صاحب آزاد (یا مولوی عبد الغفور خانِ نسّاخ) خواجہ حالی تو کوئی بات یقینی نہیں کہتے۔ قیاس سے کام لیتے ہیں اور قیاس شہادت میں مُعتبر نہیں۔ حکیم غلام رضا خاں نظیر کے اصلاح دینے کو بالکل غلط بتاتے ہیں لیکن یہ نہیں کہتے کہ کسی موقع پر غالب نے اِس مضمون سے صراحۃً انکار کیا ہو۔ پس اِن کی باتیں بھی قیاسی ہیں۔ ہرمزد اور عبد الصمد کے وجود فرضی کی نسبت جو اُنھوں نے ایک مضمون لکھا ہی اگر صحیح ہی تو میرزا کا خاص عنوانِ طبیعت اُس سے ظاہر ہوتا ہی۔ اُس کے دل میں بڑی مشیخت سمائی ہوئی تھی اُس نے اپنی عظمتِ شاعرانہ کے مناسبِ حالت خلافِ واقعہ ایک فرضی اُستاد تراشا تو اپنی شان کے خلاف کسی واقعی اُستاد کے تلمذ سے انکار کرتے اُس کو کتنی دیر لگتی۔ اگر اُس نے اپنی کسرِ شان کے لحاظ سے نظیر کی شاگردی سے قصداً سکوت کیا ہو تو اُس کی طبیعت سے کوئی بعید نہیں۔ باطن کے قول کو یہ کہہ کر ٹال دینا کہ اُس نے محض عداوت سے یہ مضمونِ تلمذ دل سے اختراع کیا ہی کچھ بہت ٹھیک نہیں ہی۔ اُس کے قول کی تایید مولوی سید محمود صاحب آزاد کی روایت سے آزادانہ طور پر نکلتی ہی۔ باطن کے بیان میں لفظِ تعلیم عام ہی اُس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ تعلیمِ رسمی یا تعلیمِ سخن۔ روایت آزاد اُس کی شرح تعلیمِ سخن کے ساتھ کرتی ہی۔

میری خاص رائے اس بارے میں یہ ہے کہ غالب کا زمانۂ قیامِ اکبر آباد ابتدائی تعلیم کا زمانہ تھا۔ اس کی زیادہ اوقات رسمی تعلیم کے حاصل کرنے میں بسر ہوتی تھی۔ خلیفہ معظم اور میاں نظیر ان دنوں سر برآوردہ اور ممتاز ملاؤں میں تھے۔ غالب کی تعلیم کو عرش پر سے فرشتے تو آسکتے نہ تھے۔ انہی دونوں کی طرف اسے رجوع کرنی پڑی۔ مدت تک ان دونوں حضرات سے تعلیم پائی۔ آدمی تھا طباع اور ذہین۔ شاعر استاد کی صحبت نے قدرتی طور پر اس میں شعر و سخن کا ذوق پیدا کیا۔ طبیعت میں زور بھرے ہوئے تھے۔ جب اڑتا تھا اونچا اڑتا تھا اور جب ڈوبتا تھا تہ ہی تک پہنچنے کا قصد کرتا تھا۔

نومشقی اور اس پر یہ گاؤ زوریاں ٹھوکریں کیوں کر نہ لگتیں۔ لڑکا اور بے دل کا نال اٹھانے کی فکر منھ کی کیوں کر نہ کھاتا۔ لوگوں کے اعتراض ہونے لگے تو اوستاد کی تلاش ہوئی۔ دو چار غزلیں مکتب ہی میں نظیر کو دکھائیں۔ لڑکے کی گاؤ زوریاں دیکھ کر ہنسی تو ان کو آئی مگر دل شکنی ان کا شعار نہ تھا۔ واد دے کر جی بھی بڑھایا اور اصلاح سے چپکے چپکے نشیب و فراز بھی بتایا۔ غالب کا زور یہ کہ اردو کو بے دل کی فارسی بنادیں۔ نظیر کا طور یہ کہ بے دل کو سعدی بنادیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ سلسلۂ اصلاح منقطع۔ باطن کے فحوائے کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسد کا خطاب بھی نظیر ہی کے ہاں سے اس کو ملا۔

نظیر کے بعد غالب کی نظر میر پر پڑی لیکن ان میں بددماغی وہ تھی کہ وہاں جاتے ہوئے بڑے بڑے تھراتے تھے۔ غالب تو بیچارہ لڑکا ہی تھا۔ جانے کی تو ہمت نہ ہوئی۔ کسی طرح غزل وہاں تک پہنچا دی ہر چند وہاں سے کسی قدر سخت اور دل شکن جواب ملا لیکن اعتقاد میں فرق نہ آیا۔ چنانچہ اپنی ایک غزل کے مقطع میں اس واقعے کے بہت دنوں بعد کہا ہے:

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ	آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

ذیل میں نظیر کے شاگردوں کی فہرست درج ہے:

خلیفہ گُلزار علی اسیر۔حکیم میر قطب الدین باطن۔میرزا اسد اللہ غالب۔مہاراجہ بلونت سنگھ راجہ لالہ بدھ سین صافی۔شیخ مداری ضمیر۔حکیم میر محمدی ظاہر۔شیخ نبی بخش عاشق۔منشی حسین علی خان محو۔بیدار بخش لہر۔شیخ حسین بخش بخشی۔

خلیفہ گُلزار علی اسیر میاں نظیر کے بیٹے تھے۔ ۱۲۱۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۹۵ھ میں کوئی نواسی برس زندہ رہ کر وفات پائی۔ اُن کے شاگرد غلام محمد خاں رہا نے اُن کی تاریخ لکھی۔قطعۂ تاریخ لوحِ مزار پر کندہ ہے۔تاریخ کا اخیر مصرعہ یہ ہے ؎

	گفت اسیر دامِ ہستی شد رہا۔	

مادّے سے چھ کا تخرجہ ہے۔

میرزا نوازش علی بیگ کی زبانی یہ روایت ہے۔خلیفہ گُلزار علی کاشی والے کے ہاں نوکر تھے۔کاشی والا مہاراجہ بلونت سنگھ کو کہتے تھے۔ یہ کاشی والا اس لیے کہلاتا تھا کہ اس کا باپ چیت سنگھ اصل میں بنارس کا راجہ تھا۔ وارن ہیسٹنگز کے ظلم سے بھاگ کر آگرے میں پناہ لی تھی۔کاشی والے نے چاہا کہ یہ اُس کو کوئی غزل مشاعرے کے لیے کہہ دیں۔اُنھوں نے کہا میں اس لیے نوکر نہیں کہ اپنی غزل تمھیں بخشا کروں۔تم خود کچھ کہو۔جہاں کہیں خامی یا نشیب و فراز ہوگا دُرست کر دوں گا۔چوں کہ استعداد اُن میں چنداں نہ تھی اور شعر گوئی کا شوق بھی تھا ناچار میرزا حاتم علی مہر (شاگردِ ناسخ) کو اپنا اُستاد بنایا اور اُن کا جو مقصد تھا اُن کی اُستادی سے پُورا پُورا حاصل ہوا۔پھر بھی جب مشاعرہ ہوتا خلیفہ گُلزار علی کو بھی بُلاتے۔چوں کہ قدیم اُستاد تھے۔خلیفہ گُلزار علی دہنی طرف بیٹھتے اور میرزا حاتم علی مہر بائیں طرف۔دونوں صاحبوں کے آگے چاندی کا حقّہ لگایا جاتا

خلیفہ صاحب بھنگ اور افیم دونوں سے ذوق رکھتے تھے۔ اُن کو یہ چھوٹی مہنال کا حقّہ کیا بھلا معلوم دے۔ ساقن جو اُور حضار کے حقّہ پلانے کو مقرر تھی اُس کو بُلا لیتے اور اسی کے گرما گرم دھواندھار حقّے سے اپنی خواہش کی آگ کو بجھاتے۔ پہلے پہل جب یہ حرکت ان سے ظہور میں آئی تو میرزا نے کنایۃً کہا حضرت کیا خوب اب تو آپ کی طبیعت کچھ اُدھر ہی طرف مائل ہی۔ خلیفہ صاحب نے چھوٹتے ہی یہ شعر پڑھا ع دل میں اُلفت ہی جو اک سانولی متوالی کی + گو مسلمان ہوں پہ بول اٹھتا ہوں جے کالی کی + میرزا نے اس پر دو مطلع پڑھے۔ خلیفہ جی بھی اُن کے جواب میں ویسے ہی برجستہ دو مطلع فی البدیہہ ارشاد کیے۔ تب تو میرزا مان گئے کہ حضرت واقعی آپ اوستاد ہیں۔

مُشاعرہ جس کا اس حکایت میں مذکور ہی ۱۲۴۸ھ میں قائم ہوا تھا۔ چوں کہ راجہ حوصلہ مند تھا اور فراغت نے بے فکری کی بساط بچھا رکھی تھی مشاعرہ تقریباً ربع صدی تک برسوں ایک طور سے قائم رہا۔ بڑے بڑے نامی شعرا اپنے جوہر طبع دکھانے وہاں تشریف لاتے تھے اور فرش سے عرش تک اپنے کلام کا غلغلہ بلند کرتے تھے۔ جو اوستاد ہوتے تھے اُن کی راجہ کی طرف سے کچھ نقدی قدردانی بھی ہوتی تھی۔

ایک مولوی گلزار علی آگرے میں وہ بھی تھے جو سینٹ جمیس کالج میں نوکر تھے۔ ان کو اُس کالج سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نظیر نے جب قضا کی تو اُن کی خلافت ان کو ملی۔ کاشی والے راجہ اور رائی تھان والوں کے پڑھانے کو مقرر ہوے۔ ستر روپے ماہوار آتے تھے۔ گوالیار میں بھی خلیفہ جی کے دو گھوڑے تھے۔ بیس ان کے آتے تھے۔ فی گھوڑا بائیس روپیہ مقرر تھا۔ جس میں سے بارہ وہیں کٹ جاتے تھے۔

خلیفہ گلزار علی صاحب کے دو دیوان ہین۔ ایک تو اکبر آباد ہی میں چھپ بھی گیا ہی۔ دوسرا قلمی غیر مرتب

یوں ہی پڑا ہوا ہے۔ مسودے کے اجزا میرزا نوازش علی نے مجھ کو دکھائے۔ گل چینِ انتخاب نے اُن کے گلزار سے یہ پھول چُنے ہیں:-

ثبوت ہے اپنے اُجلے پن کا صفائیِ دستِ تیغ زن کا یہ کیا کہ بچنا خار سے اور گل کو دیکھنا کیا سیدھی سی زلفوں کے لکھوں شعر اسیرب ساقی کا کیا میٹھا ہے یا علی بجتِ سیہ میرے کو روشن کردو	نہ عضو مٹی ہوا بدن کا نہ تار میلا ہوا کفن کا جب صُلح گل سے ٹھہری تو پھر گل کو دیکھنا اٹکے ہے کہیں دل نہ اُلجھتی ہے کہیں طبع کڑوا پیالہ پیجے کیوں تم کو شمعِ حرم لم یزلی کہتے ہیں
دُنیا میں انسان کی اور آنسو کی قدر برابر ہے عجب کچھ تفرقے سے شہرِ آب دگل میں پھرتا ہوں شمع ساں بزم میں مارے ہوے تن من میں ہوں	خاک میں ملتے جاتے ہیں آنکھوں سے گرتے جاتے ہیں مجھے ڈھونڈے ہے دل میں جستجوے دل میں پھرتا ہوں جب کوئی آگ لگا دے مجھے روشن میں ہوں
داغ تو دل میں ہوا ہے چرخِ کہن چھوٹا سا مجھے رعشہ تو ہے چنچل مُصتور سے کھنچے کیوں کر ترار کھا جو شگوں نے عصاے بغلی کو افسردہ دل جو ہووے تو شورِ فغاں نہو آنکھوں میں اس کو رکھیے کہ دامن میں پلیے یک گزدو فاختہ کی یہ پھبتی کہی اسیر	ہے بڑا لطف جو گھر میں ہو چمن چھوٹا سا مری تصویر پیری میں، تری تصویر طفلی میں شاخوں میں جریدوں کی لگے بیر لحد میں مٹی کو لاکھ طرح جلائیں دھواں نہ ہو طفلِ سرشک لاکھ برس میں جواں نہ ہو تھی سرو پر جو فاختہ، بالاے فاختہ
خار صحرا ایک چھوڑیں گے نہ تن میں آبلے	ہیں پکھا لیں پانی کی دیوانہ پن میں آبلے

اشک یاں چشم میں ہی غم دل میں ہی جاں ہاتھ میں ہی غصہ بھی آئے تو بے جا نہ سخن سے رد ہو	اپنے قاتل کی بہار اور خزاں ہاتھ میں ہی جس کے کہنے میں ہی گویا وہ زباں ہاتھ میں ہی

کس نیند چڑھا پھرتا ہی ہشیار ہو غافل مال رہ جائے کسی پاس نہ دولت رہ جائے تن میں ہوا جو ہی کوئی دم کی بندھی ہوئی توشہ مسافران عدم کو ضرور ہی	جو پہلا کرایے کا ہی یہ گھر کا نہیں ہی یہ بڑی چیز ہی دنیا میں جو عزت رہ جائے گھڑی یہ غافلو ہی بھرم کی بندھی ہوئی ٹکیا رہے کلیجے پہ غم کی بندھی ہوئی

حکیم میر محمدی ظاہر صاحب تذکرہ کے والد تھے اور حضرت میر ضیاء الدین جبپوری سے ان کو بیعت حاصل تھی جو خلیفۂ خاص مولنا محمد فخر الدین کے تھے۔ اصل میں ان کے اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ عرب سرا میں رہتے تھے۔ جو شاہجہاں سے تین کوس کے فاصلے پر ہی محاربات شاہ گردی میں ان کے دادا حکیم میر واجد علی جو مولنا کے عمائد خلفا میں تھے پریشان ہو کر اکبرآباد آئے۔ اور تلج گنج میں عمر خاں کے کٹرے میں ممتاز محل کے روضے کے زیر دیوار قیام پذیر ہوئے۔ طبابت سے اوقات بسری کرتے تھے۔ فخر الدولہ نواب احمد بخش خان مرحوم جو نواب مرزا الٰہی بخش خان مرحوم کے بڑے بھائی اور عارف خان برادر شرف الدولہ قاسم جان کے بڑے بیٹے تھے وہ ان کی خدمت سے سعادت اور توقیر حاصل کرتے تھے۔

ظاہر نے میاں نظیر سے فیض سخن حاصل کیا اور اپنے تئیں شاگردوں کے زمرے میں داخل کیا۔
۶ صفر ۱۲۵۹ھ روز چہارشنبہ کو پہر رات گئے ہوے سفر آخرت کیا۔ ایک مختصر دیوان ان کا ہی۔

حمد میں لکھتا ہوں نام اُس خالقِ غفار کا خیال اُس لطف کا دل سے مرا اصلا نہیں جاتا	نعت میں دم مارتا ہوں احمد مختار کا بہت اپنی سی کی پر آہ یہ سودا نہیں جاتا

نہ بھاتی تھی جس شخص بن دل کو سیر	سو آیا ہے اے لو وہ یادش بخیر
چشم اور لبِ لعل اُس کے ظاہر	بولے کہ جو دل کو پائیں گے ہم
آنکھوں نے کہا کریں گے ہم قتل	لب بولے کہ پھر جلائیں گے ہم
غبارِ خاکِ راہِ دل بہ جا لاکے آنکھوں میں	سمجھ کحل البصر گر ہم نہ دیں تو خاک آنکھوں میں
اگو خلدِ بریں کی تو صبا اور ہی کچھ ہے	سرِ یار کے کوچے کی ہوا اور ہی کچھ ہے

حکیم میر محمد مہدی طاہر کے بیٹے حکیم میر قطب الدین باطن جنھوں نے تذکرہ گلستانِ بے خزاں جمع کیا اپنے آپ کو پابند سلسلۂ شاگردیِ میاں نظیر لکھا ہے۔ لیکن شائد اُنھوں نے میاں نظیر کا بہت زمانہ نہیں پایا۔ اسی لیے اُنھوں نے بعد میں خلیفہ گلزار علی سے بھی استفادۂ سخن کیا۔

اپنے حالات میں اپنی شاگردی کو اِن لفظوں میں لکھا ہے:۔

پابند سلسلۂ شاگردی میاں نظیر صاحب اور خواہانِ فیضِ صحبت بدل و جان۔ اِن کی تعلیم کے استفادے سے حرف شناسِ سخن ہو جائے گا۔ گلِ سخن اس کا رنگین تر از چمن ہو جائے گا۔ اور اسیر کے حالات میں یوں:۔

درختِ سخن راقم آثم کا فیضِ شگفتگی گلہائے تلطفِ ہادیِ شعرا حضرت نظیر سے بار ور ہوا۔ گلِ مراد احقر کا نسیمِ الطاف اُن کی سے شاخِ مضارع بہ رنگِ بوقلموں ثمر بر لایا۔ نخلِ ابیاتِ ناقصہ اپنا دستِ صنعتِ باغبانِ طبع اِن کے سے پیوند ہوا اور رہِ نظارگیِ باغِ سخن نے اِن کے سلسلۂ کلام میں سراسر دلِ شوریدہ کو پابند کیا۔

ذو بحرین

واسطے سر کے مرے پتھر بنا	واسطے پتھر کے میرا سر بنا

شرمِ گنہ پہ دھیان گیا جب خیال کا
دریا بہا دیا عرقِ انفعال کا

کیا اعتماد خواب کا کیوں ہو گئی یہ محو
بچہ نہ کچھ زلیخا تھی یوسف جواں نہ تھا

وہ ظرف ہے خُمِ وحدت کو ہیں چڑھا جاتا
ترا جمال جو اِس جام میں سما جاتا

قفس میں آتی چمن کی مجھے جو یاد کبھی
وہ نالہ کرتا کہ صیاد بلبلا جاتا

گنہ سے توبہ کر اے دل سمجھتا ہی نہیں الٰہ
حیما اور غنا قا جزا، اور وفا قا کیا

چاند پہ شیشہ شیشے پہ نیچہ نیچے میں قطرہ زیب فزا
تکیے پہ زانو زانو پہ ہاتھ اور ہاتھ میں دانہ سمرن کا

ترے در سے خالقِ انس و جاں جو ملے تو لوں میں بلا طلب
نہ چلے یہ پاے ہوس طلب نہ بڑھے یہ دستِ دعا طلب

طرح طرح کے دکھاتا ہے اب زمانہ رُوپ
بدل رہا ہے یہ بہروپیا بھی کیا کیا روپ

حضرتِ یعقوب کی خدمت میں یوسف کو بگاڑ
ساتار وہن بن گئے ہیں گرگ پیراہن سمیت

یہ دیر کے رستے سے وہ کعبہ کی گیا راہ
ان برہمن و شیخ میں اک راہ کا تھا پیچ

روش پہ قمری و بلبل میں بحث ڈلوا کر
یہ لال بن کے لڑاتا ہے چڑیاں صیاد

ذقن کو دل گیا ہر گز نہ رکھا کان نیچ پہ
گرا اندھے کنوئیں میں خضر اک بوسے کے لالچ پہ

تمھارا حسن ہر عالم میں اک دورِ قیامت ہے
جو لڑتے تھے تو فتنے تھے ہوے آفت جواں ہو کر

انھیں رونا مچلنا بس کلیدِ قفلِ مطلب ہے
زباں بوڑھوں کی کھلواتے ہیں بچے بے زباں ہو کر

نسیم حالِ خزاں کا جو سن گئی ہوگی
وہ بادلی سی تو ہی تنکے چن گئی ہوگی

عروسِ گور سے ہونے کو ہم کنار آئے
اکیلے چار پیادوں پہ ہم سوار آئے

طلب بھی بوسے کی دشنام کا سوال بھی ہے
جواب دے اے ممسک تو کچھ زوال بھی ہے؟

خیال آیا جو باطن کو وفورِ عشق کا اپنے | تو یکسر شرم کا یاں بلبّوں سر سے بڑھا پانی
گزشت از سر چو آبِ غم چہ یک دست و چہ یک نیزہ | بلائے جاں ہوا جب سر سے اونچا ہو گیا پانی
راحتِ ہستی معدوم ہوا خوابِ عدم | نیند آئی مجھے یٰسین کے افسانے سے
جو ایک اشک بھی آسیری چشم تر سے پھرے | تو پانی اتنا ہو اونچا کہ عرش پر سے پھرے
پائینتی سے بھی چلنے لگے سرہانے والے | کاندھی دے جاتے ہیں نعشے کے اٹھانے والے
خیالِ کاکلِ پیچاں میں چرخ کج رو کے | دھوئیں اڑا دیے ہونگے جو آہ کی ہو گی
عقلِ کل طفلِ دبستاں ہے وہ کیا سمجھے گا | جو کچھ اس خاک کے پتلے میں بھی حکمت ہوگی
نہ پوچھو کچھ ہماری کس طرح اوقات کٹتی ہے | غضب میں دن گزرتا ہے قیامت رات کٹتی ہے
خدا کی حمد ہے وصفِ بتاں ہے | بس اک دو کام کو منھ میں زباں ہے
ہزاروں رنگ سے کرتے ہیں نغمہ | ہمارے منھ میں بلبل کی زباں ہے
بڑی دقت سے گزرا رستمِ دل | ترا کوچہ بھی راہِ ہفتخواں ہے
بنایا تو نے حکمت سے اسے موتی اسے انساں | گہر اور آدمی دونوں کی اصل اک بوند پانی ہے

محو تخلص منشی حسین علیخان مولد و منشا اکبر آباد۔ اصل کشمیر۔ برادرِ حقیقی قاضی واجد علیخان توقیر کے آدمی تھے سرکارِ انگریزی میں جلیل القدر عہدے پر سرفراز تھے۔ باطن کے والد سے ازبس یک جہتی تھی۔ عرصہ دراز تک سرکارِ مہاراجہ گوالیار مختار رہے۔ سنہ ۱۲۵۰ھ میں قضا کی۔ آدمی خوش فکر ہیں۔ ہادیِ شعراء مرحوم کی صلاحِ سخن کے ذکر ہیں

آج آیا مجھے اس رشکِ قمر کا پرزہ | میں بھی بھیجوں گا جواب اپنے جگر کا پرزہ
ترا تیرِ نگہ ظالم سپر مجروح کی چھاتی ہے | مجھے خورشید کے احوال پر اب مہر آتی ہے

(انشا نظیر کا متبع ہے)

میں نے جب شروع شروع کلیات نظیر دیکھنا شروع کیا اور ان اشعار پر پہنچا تو چھوٹتے ہی خیال میں آیا کہ یہ طرز انشا کی ہے۔

کہا جو تم نے کہ منکا ڈھلا تو آؤں گا	ہے بات کچھ نہ کچھ اس میں بھی مکر و فن کی سی
وگرنہ سچ ہے تو اے جان اتنی مدت میں	یہی بس ایک کہی تم نے میرے من کی سی
وہ دیکھ شیخ کو لاحول پڑھ کے کہتا ہے	یہ آئے دیکھیے ڈاڑھی لگا کے سن کی سی

غور کر کے دیکھا تو پہلی غزل کلیات کی بھی انشا ہی کی طرز میں نظر آئی۔

سحر اس جھمک سے آیا نظر اک نگار رعنا	کہ خور اس کے حسن رخ کو لگا تکنے ذرہ آسا

پھر ان غزلوں پر بھی یہی خیال بڑے زور سے پیدا ہوا تھا جن کے مطلع کے اشعار یہ ہیں:-

کہتے ہیں یاں کہ مجھ سا کوئی مہ جبیں نہیں	پیارے جو ہم سے پوچھو تو یاں کیا کہیں نہیں
زاہد رضنہ رضواں سے کہو عشق اللہ	عاشقو کوچۂ جاناں سے کہو عشق اللہ
اے شوخ ہر گھڑی نہ ہوس آشنا کو چھیڑ	ایسا ہی چھیڑنا ہے تو اہل وفا کو چھیڑ

چنانچہ حاشیہ پر بطور نوٹ کے لکھ بھی دیا تھا کہ ان اشعار سے طرز انشا جھلکتی ہے۔ لیکن اس وقت تک اچھی طرح یہ امر محقق نہ تھا کہ نظیر کا زمانہ کیا ہے۔ آیا انشا سے متقدم یا متاخر۔ تحقیق سے اب ظاہر ہو گیا ہے کہ نظیر گو باعتبار موت کسی قدر متاخر ہیں مگر باعتبار ولادت و سنین عمر یقیناً انشا سے متقدم۔ بس خاص طرح کہا جا سکتا ہے

کہ اس طرز خاص میں انشا نظیر کا پیرو ہے۔ جب انشا کا دیوان دیکھا گیا تو اُس میں کئی غزلیں نظیر کی طرح میں پائی گئیں۔ نظیر کا مطلع ہے:-

عشق کا دُور کرے دل سے جو دھڑکا تعویذ	اِس دھڑکے کا کوئی ہم نے نہ دیکھا تعویذ

انشا کہتے ہیں:-

لکھ دو آخون جی صاحب کوئی ایسا تعویذ	کہ مرے منھ سے لگے اُس کے گلے کا تعویذ
دل دھڑکنا ترے عاشق کا نہ جاوے ہرگز	گرچہ سو لاکھ طرح لکھ دے مسیحا تعویذ

نظیر کا مطلع ہے:-

دیکھ عقدِ ثریا ہمیں انگور کی سوجھی	کیوں بادہ کشو ہم کو بھی کیا دُور کی سوجھی؟

انشا فرماتے ہیں:-

پھبتی ترے مکھڑے پہ مجھے حُور کی سوجھی	لا ہاتھ ادھر دے کہ بڑی دُور کی سوجھی

اس طرح میں جرأت کی بھی غزل ہے۔ نقل مشہور ہے کہ جرأت نے انشا کے سامنے اپنا ایک شعر پڑھنا شروع کیا۔ ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ۔ اُس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سوجھی۔ کہ انشا نے چھوٹتے ہی کہا تاریکی میں اندھے کو بڑی دُور کی سوجھی۔ اس پر جرأت مارنے کو اُٹھے۔ نظیر کا مطلع ہے:-

دیکھ کر کرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی	دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی

انشا کا مطلع ہے:-

بندگی ہم نے تو جی سے اپنے ٹھانی آپ کی	بندہ پرور خیر آگے قدردانی آپ کی
اپنی آنکھوں میں تراوٹ آگئی یک بارگی	دیکھ کر یہ لہلہی پوشاک دھانی آپ کی

چھیڑ کی طرح میں انشا کی غزل یوں شروع ہوتی ہے:-

ای دل سمجھ کے اُس کی تو زلفِ رسا کو چھیڑ	ظلم بحث کیا کرے، ہے نہ کافر بلا کو چھیڑ

نظیر زلف کے مضمون کو یوں لہراتے ہیں:-

بھپرے گا جب تو پیش نہ جاوے گا کچھ فسوں	ای دل نہ اُس کی افعیِ زلفِ دوتا کو چھیڑ

ازار بند والی طرح میں بھی دونوں کا کلام ہے:-

(انشا) جاڑا لگے ہی کھینچ لے مجھ کو لحاف میں	پاجامہ یخ ہی۔ برف ہے۔ اولا ازار بند

فقط یہی نہیں کہ اتفاق سے یہ چند طرحیں دونوں کے دیوان میں واقع ہوئی ہیں۔ نہیں بہت سی باتیں دونوں شعرا کے کلام میں یکساں اور متحد ہیں۔ بعض سخت قافیوں پہ دونوں طبیعت آزمائی کرتے ہیں اور اس قسم کے قافیوں سے دونوں کو ایک قسم کا عشق معلوم ہوتا ہے۔ کلام میں چوچلے کو دونوں شعرا شریک کرتے ہیں۔ دونوں شعرا آزادوں کے لہجے میں اکثر خیالات ظاہر کرتے ہیں ظرافت کے مضامین دونوں کے کلام میں بڑے زور سے دخل پاتے ہیں۔ شاعر کو اکثر دونوں کے کلام میں ایک بہروپیہ کا کیرکٹر دیا گیا ہے۔ عبارتِ عربی اقتباساً دونوں اپنے کلام میں ایک لطیف پیرایے میں داخل کرتے ہیں۔

(انشا) ای عشق جلوہ گر ہے خود تجھ میں ذاتِ مولا	والسابحات سبحا فالسابقات سبقا
سبزا اگرچہ رہا نا منظور سبح دم ہو	تو لیجیے برگ کوئی والناشطات نشطا

ہندوستانی تیوہاروں اور تقریبوں کو شاعرانہ رنگ آمیزیوں سے لُطف اُٹھا اُٹھا کر دونوں بیان کرتے ہیں۔ ہنود کے الفاظ و اصطلاحات بھی دونوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ مختلف زبانوں اور لہجوں سے دونوں کام لیتے ہیں۔ صوفیانہ مذاق کو دونوں دخل دیتے ہیں۔ چوں کہ ذہین مقلد اکثر اپنے امام پر سبقت

لے جاتا ہے اس لیے ان امور میں سے بعض میں انشا نے کسی قدر نظیر پر فضیلت حاصل کی ہے۔ مثلاً اُس کے کلام میں عربی کی عبارتیں اقتباساً نظیر سے زیادہ برجستہ طور پہ واقع ہوئی ہیں۔ یا آزادوں کے لہجے کو وہ ایک خاص لطافت سے ادا کرتا ہے۔ یا مختلف محاورات اُس کے ہاں زیادہ شوخی کے ساتھ ہیں۔ لیکن دیکھنے والے پر صاف یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ کسی کا مقلد ہے۔ نظیر سے پہلے غزلوں اور اشعار میں اس قسم کے خیالات کسی نے ظاہر نہیں کیے تھے۔ اِس طرز کا نظیر امام ہے۔ اِس نے احاطۂ شاعری کو وسعت دی۔ انشا نے اس طرز جدید کی تقلید کی اور عمدہ طرز پر تتبع کر کے بعض باتوں میں کچھ اُس کو ترقی دی۔ بعض کلام دونوں شاعر کے ایسے ہمرنگ ہیں کہ مجھ کو اکثر ایک پر دوسرے کے کلام کا دھوکا ہوا ہے۔ مثلاً وہ غزل:-

نظر پڑا اک بتِ پری وش نرالی سج دھج نئی ادا کا

انشا کہتے ہیں:-

آئی تھی ایک حور مجھے دیکھ ہٹ گئی	دانتوں کے نیچے داب زباں چٹ پلٹ گئی
آہٹ کو میری تاڑ کے چوکھٹ سے جھٹ اچک	جھٹ پٹ وہ ہٹ کواڑ کے پٹ سے چمٹ گئی

اس پر صاف نظیر کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔

انشا کہتے ہیں:-

میں دبے پاؤں اور ہی چپکے سے جو پہنچا بیٹھے تھے جہاں وہ	سن کہنے لگے میرے دبے پاؤں کی آہٹ ہی ایک تو نٹ کھٹ

اس پر بھی نظیر کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔

تین غزلیں جو ذیل کے مطلعوں سے شروع ہوتی ہیں وہ بھی طرز نظیر میں ہیں:-

کو صولتِ سکندر و کو حشمتِ دارا ہی صاحب فطرت	پڑھ فاعتبروا یا اولی الابصار کا آیا ہو تجھے عبرت

ہی نام خدا وا چھڑے کچھ زور تماشا یہ آپ کی رنگت	گات ایسی غضب قہر بھبھیں اور جھمکڑا اللہ کی قدرت
لینے جو بلائیں لگے ہم آپ کی چٹ پٹ تو بول اٹھی جھٹ	چل جا لبے رے ہا در بدر وہ موپر سے ہٹ ہی سب یہ بناوٹ

انشا کو متبع ماننے کی ایک وجہ یہ بھی ہی کہ زبان انشا کی کسی قدر نظیر سے شستہ اور تہذیب یافتہ ہی۔ اور معلوم ہوتا ہی کہ ایک زینہ وہ نظیر سے نیچے ہی۔ نظیر کے ہاں وہ عیوب جو میرا ور سودا کے کلام میں متعلق لغت یا عروض کے ہیں بعینہٖ ہیں۔ انشا کے ہاں وہ عیوب نہیں ہیں۔ انشا نے کسی قدر زبان کی اصلاح شروع کردی ہی۔ وہ الفاظ کی صحت کی رعایت بہت کرتا ہی۔ غلطی بسکون لام اُس کے نزدیک بڑی رکیک غلطی ہی۔ گو موٹے موٹے رکیک ہندی الفاظ کو آزادی کے ساتھ داخلِ کلام کرتا ہی لیکن فارسی اور عربی لغات کی صحت شعرائے فارس کے معیارِ صحت کے مطابق کرتا ہی۔

متاخرین اگر بعض خاص امور کی تہذیب کریں تو متقدمین کے کلام کو ان متاخرین کے نصاب سے ناپ کر خراب اور کم رتبہ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن بعض خاص قسم کی غلطیِ خیالی سے لوگ بعض متقدمین پر غلط الزام لگاتے ہیں۔ نظیر انھی بے جا الزام یابوں میں ہی۔ انشا کے قوانینِ اصلاح و تہذیب کا نظیر کیوں کر پابند ہو سکتا تھا۔

(نظیر اور انشا کی ظرافت میں فرق کیا ہی)

ظرافت دونوں کے کلام میں ہی۔ لیکن نظیر کی ظرافت اُس وضع کی ہی جیسے کوئی رئیس کسی سے مزاح کرے اور انشا کی ظرافت کا ڈھنگ وہ ہی کہ جو مصاحبوں اور بعض اربابِ نشاط کا ہوتا ہی۔ وہ جس کو چھیڑتا ہی اُس کی نسبت فقط زبان سے کام نہیں لیتا۔ بلکہ ہاتھ پانوں سے بھی بعض حرکات اُن کی تضحیک کی کرتا جاتا ہی اُس کو منہ چڑا دینے میں کوئی باک نہیں۔ اُس کو تضحیک میں ڈالے ہوئے شخص کی ناراضی و خوشنودی کا کچھ خیال نہیں وہ چاہے بیزار ہو کر خودکشی کیوں نہ کرے مگر اُس کو چھیڑے جانا۔ اُس کو مقصود ہی صرف اپنے مربی کو

خوش کرنا۔ نظیر کا کوئی مُربی نہیں ہے وہ اپنے کلامِ ظرافت التیام میں مصاحبت نہیں خرچ کرتا۔ وہ چٹکی لیتا ہے مگر اُس کے دل میں ہمدردی بھی جوش مار رہی ہے۔ جیسے بعض رُؤسا کہ بعض تفریح طلب لوگوں سے تفریح کرتے ہیں۔ چپت مارتے ہیں۔ ناک میں تیلی کر دیتے ہیں منھ میں کالک لگا دیتے ہیں۔ جوتے کا ہار گلے میں ڈال دیتے ہیں۔ لیکن اخیر میں کچھ دے بھی نکلتے ہیں۔ غرض نظیر کی ظرافت خود مختار اور آزاد ہے اور آزادی کی تمام فضیلتوں سے مالامال۔ اور انشا کی ظرافت بھانڈوں اور مصاحبوں کی ظرافت کی طرح پابند۔ نظیر کی ظرافت کا مقصودِ اعظم نوعِ انسانی کی اصلاح اور انشا کی ظرافت کا مقصود فقط چند لوگوں کو ہنسا دینا اور بس۔

نظیر کی تشبیہ برن سے

میرے ایک نہایت قابل اور خوش طبع دوست نے اثنائے گفتگو میں نظیر کو برن سے تشبیہ دی۔ میں جب اُن سے مل کر گھر آیا تو اوقاتِ فرصت میں اس تشبیہ کے نکات پر وقتاً فوقتاً غور کرتا رہا۔ اِس اعتبار سے کہ برن بہت ہی کم عمری میں مرگیا۔ کوئی مشابہت نہیں۔ اِس اعتبار سے کہ وہ بہت شراب پیتا تھا کوئی مناسبت نہیں۔ اِس اعتبار سے کہ وہ ارادے کا مستقل اور عادت پر قابو رکھنے والا نہ تھا کوئی مماثلت نہیں۔ مناسبت کی وجہیں شاید یہ ہوں کہ اولاً تو دونوں کا زمانہ ایک ہی۔ گو برن پہلے مرگیا[لہ]۔ جن دنوں برن کی شاعری ممالکِ فرنگ میں اپنے خاص رنگ میں دلوں کو رنگ رہی تھی نظیر کی شاعری وہی رنگ یہاں ہندوستان میں جھمکا رہی تھی۔ برن نے اپنے ملک کی خاص زبان اختیار کی تھی۔ نظیر گو اِس خصوص میں اُس کی پوری نظیر تو پیش نہیں کرسکتا مگر اس میں کسی طرح کا شبہ نہیں کہ اُس نے بھی زبان کو بہت کچھ آزادی دی۔ شعرا عوام کے بازاری محاورات اور روزمرہ استعمال کرتے ڈرتے ہیں۔ اِس نے نہ فقط بازاری محاورات استعمال کیے بلکہ اُن محاورات کے جادو سے ایک بولتا چالتا اچھا خاصہ بازار بسا دیا۔ اُس کو کسی لفظ کے استعمال میں عذر نہیں اور ہو بھی تو کیوں ہو۔ وہ شاعری نہیں کرتا بلکہ خیالی طور پر خاص خاص روپ بھرتا ہے جس طرح برن نے زبانِ انگریزی کو خاص خاص الفاظ اور خاص خاص محاورات دیے ہیں اُسی طرح نظیر نے زبانِ اردو کو دیے ہیں۔ الفاظ و لغات کی کثرت جدّتِ استعمال کے ساتھ اُس کے کلام میں اس قدر ہے کہ اِس خصوص میں حالی نے اُس کو میر انیس پر ترجیح دی ہے۔

لہ ۲۱۔ جولائی ۱۷۹۶ء برن کی وفات کی تاریخ ہے اور ۲۹۔ جنوری ۱۷۵۹ء تاریخِ ولادت ۱۲

میرے خیال میں بعض فرہنگ نویس کے لیے یہ ایک عمدہ منصوبہ ہے کہ وہ صرف نظیر کے لغات سے اور مترادف الفاظ اور ہم معنی محاورات کا التزام کر کے اردو کی ایک جامع فرہنگ تیار کرے جس طرح میرے ایک نہایت بلند خیال کامل العلوم دوست نے مقاماتِ حریری کے متعلق التزام کیا تھا۔ میں جانتا ہوں زبانِ اردو میں کسی شاعر کا کلیات ایسا نہیں ہے جس میں اس قدر مختلف صیغوں کے الفاظ اس کثرت سے پائے جاتے ہوں سیکڑوں الفاظ ایسے ہیں جن کا پہلے پہل اُس کے ہاں استعمال ہوا ہے۔ اور اگر پہلے پہل استعمال نہیں ہوا تو یہ تو یقیناً ہے کہ اس خوبی اور اس پہلو سے پہلے ہی پہل ہوا ہے۔

مختلف مضامین کے اعتبار سے بھی برن اور نظیر مماثل ہیں۔ برن کے ہاں بھی اسی طرح ہر طبقے اور درجے کے خیالات ہیں جس طرح نظیر کے ہاں۔ مضمون چاہے کتنا ہی پست کیوں نہ ہو مگر شاعرانہ نقاشی کے لیے دونوں کے موقلم یکساں طور پر تلے ہوئے ہیں۔ برن سہمے ہوئے زندہ چوہے کو ہمدردی بڑھانے کے لیے پیش کرتے ہیں تو نظیر مُردہ چوہوں کی ایک مظلوم جماعت کو خوان میں لگا کر لاتے ہیں اور ہنستے ہنستے رُلا دیتے ہیں۔ برن کتّے کی دوڑ بھاگ دکھاتے ہیں تو نظیر اُچھلتا کودتا ہرن سامنے لاتے ہیں۔ برن کے فوجی مذاق کی نظموں کے مقابل میں نظیر کا جنگ نامۂ خیبر اور اسی وضع کی اور نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ برن کے اگر سونگ ہیں تو نظیر کے بھی گیت ہیں جو موج اور لہر کے گلے سے ادا ہو رہے ہیں۔ برن کے جام میں اگر بادۂ ارغوانی (اسکاچ ڈرنک) ہے تو نظیر نے بھی ادھر سبزی چھانی ہے۔ برن کا ونٹر ہے تو نظیر کا جاڑا۔ برن کی صفائی کے ساتھ مُڑنے والی ڈیون ہے تو نظیر کی مینڈھا بھنور اُچھالن جگہ سمیٹ ملاذالی جمنا ہے۔ برن کو اگر مضامینِ اڈیسن کا وظیفہ ہے تو نظیر کو مقالاتِ سعدی کا۔ برن کو رسمی پادریوں سے انحراف ہے تو نظیر معمولی عالموں اور عالموں کو بہکا اور بھٹکا ہوا جانتا ہے ؎

پڑھے بھٹکے ہیں لاکھوں اتا گروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے ٭ جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔

کسی قدر شوخیِ طبیعت میں بھی دونوں کو شرکت ہی۔ سب سے بڑی بات یہ ہی کہ ہمدردی دونوں کی گھری ہی یہ گھری ہمدردی کا اثر ہی کہ نظیر اور برن دونوں کا کلام ہر گھر مین پڑھا جاتا ہی اور ہر شخص کی زبان پر ہی۔ اونچے محلوں میں بھی یہ راگ اسی طرح بلند ہی جس طرح ذلیل جھونپڑوں میں۔ مسجد اور گرجوں میں بھی یہ آوازہ اسی طرح گونجتی ہی جس طرح مندر اور سیکدوں میں بڑے بازاروں میں بھی اس سودے کا اسی طرح رواج ہی جس طرح چھوٹی دکانوں میں۔ شاعری پہلے بہت بلندی پر تھی۔ جو لوگ سوسائٹی کی پستی میں تھے اُن کا ہاتھ اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا وہ دُور ہی سے درشن کر کے چلے جاتے تھے۔ برن اور نظیر دونوں کی کوشش سے وہ اپنا سنگھاسن چھوڑ کر جھروکے سے نیچے آئی اور اکبر اور شاہ جہاں نہیں بلکہ ہماری ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریا کی طرح اخلاق کے ساتھ ہر سوبجرا اور سیلرا اور ہر سپاہی اور خلاصی سے باتیں کرنے لگی۔ ہر ایک شخص کا حال پوچھا اور ہر ایک کے ساتھ اُس کے مناسب حالت سلوک کیا۔ جو روتے تھے اُن کے آنسو پونچھ دیے۔ جو اداس تھے اُن کی باچھیں کھِلا دیں۔ جو مسکراتے تھے اُن سے قہقہے سنوا دیے۔ غرض ایک آن کی آن میں سارے مجمع میں ہنسی خوشی پھیل گئی۔ اب وہ جھروکۂ درشن پر بھی جا کر کیوں نہ بیٹھے۔ یہ خوشی جوں کی توں پھیلی رہے گی جس طرح برن کی نسبت کہا گیا ہی۔ عام انسانی قلب کی گہرائی میں اُس کی قوت رہ کر زور دکھاتی ہی اُسی قوت اور اُتنی ہی سچائی کے ساتھ نظیر کے حق میں بھی کہا جا سکتا ہی برن کی ہمدردی پہلے گھر اور کنبے میں ظاہر ہوئی پھر رفتہ رفتہ عالم گیر ہو گئی۔ اسی طرح نظیر کی ہمدردی بال بچوں سے شروع ہوئی اور پھر تمام بنی نوع پر پھیل گئی۔ دونوں اپنے گھر کے روح پرور حلقے میں ہمدردی کی ایک جان بخش اور دل نواز گرمی پھیلاتے ہیں اور جب نظر اٹھا کر ملک کو دیکھتے ہیں تو پرتوِ آفتاب کا کام کرتے ہیں۔ دونوں کے اشعار دل سے نکلتے ہیں اور پھر سیدھے دل ہی میں جا کر ٹھہرتے ہیں۔ دونوں ہر ماں باپ کے دل کو چھوتے ہیں۔ نہیں بلکہ دونوں کے ہاں کچھ نہ کچھ ہر شخص کے

لیے ہی۔ کیڑوں کے لیے بھی دونوں کے دل ویسے ہی دُکھتے ہیں جس طرح آدمیوں کے لیے۔ بقولِ حالی:۔

تُونے دل ایسا دُکھایا ہی کہ دُکھ جاتا ہی
چیونٹی کا بھی اگر دل ہی دُکھایا جاتا

بُرے سے بُرے آدمی حتے کہ شیطان اور شیطان کی خالہ کے لیے بھی دونوں کے دل میں رحم ہی اسی عام ہمدردی کا نتیجہ ہی کہ دونوں کا کلامِ منفعت نظام ایک ذخیرۂ عام ہی جس میں ہر شخص اپنی حاجت کی چیز پاسکتا ہی۔ مرحلۂ زندگی کا ہر مسافر اثنائے سفر میں اس سے استقلال اور ہمت حاصل کرسکتا ہی۔ چُور تھکا ماندہ زخمی ہر ایک کوئی نہ کوئی تریاق اس سے لے سکتا ہی۔

(نظیر اُردو کے شیراز کا سعدی ہی)

نظیر شیکسپیر تھا بالقوہ - برن تھا بالفعل من غیر ارادہ - سعدی تھا بالقوہ - بالفعل - بالارادہ جیسا کہ مختلف مواقع پر بیان ہو چکا ہی پیشہ اُس کا معلّمی تھا اور سلسلۂ تعلیم و تعلّم دونوں میں حضرت سعدی سے مُلاقات ایک ضروری - مناسبتِ فطری سعدی سے نظیر کو ایک عشق کا مرتبہ بخشتی ہی - مکتب میں جب وہ گلستاں بوستاں کا درس دیتا ہی تو وہ اپنے آپے میں نہیں رہتا - اُس پر قریب قریب وہ کیفیت طاری ہوتی ہی جو صُوفیوں کو عالمِ وجد و حال میں - اُس پر سعدی کے کلام کا سماں چھا جاتا ہی - وہ اُس کی شرح نہیں کرتا - بلکہ خود شرح ہو جاتا ہی - وہ زبان سے حلِ مطلب نہیں کرتا بلکہ سر سے پا تک مطلب ہو جاتا ہی اُس کے چہرے پر پسندیدگی کی چمک ہی اُس کی بھنوؤں پر عظمت کی کشش - اُس کے ہاتھوں کو نکتہ فہمانہ حرکت - اُس کے جسم کو متواجدانہ جنبش اُس کی نگاہوں میں کیفیتِ استغراق - وہ ایک خاص خانقاہ میں پہنچا ہوا ہی اور ایک خاص شیخ سے فیض لے رہا ہی اُس کی کیفیت پھیل رہی ہی اور مستفیضوں کو اپنے رنگ میں رنگ رہی ہی -

غور کر کے دیکھیے تو نظیر اور سعدی میں علاوہ مناسبتِ فطری کے اور بھی بہت سی باتیں مشترک تھیں گو نظیر نے سعدی کی طرح مختلف دیار کی سیر نہیں کی مگر بالکل گھر میں بھی بیٹھا نہیں رہا - دہلی سے آگرے آنا تو ایک امرِ اضطراری تھا مگر وہ متھرا گیا - بھرت پور گیا - اکثر فرخ آباد جاتا تھا بعض الفاظ سے اُس کے حیدرآباد کی بُو بھی پائی جاتی ہی - اُس نے سعدی ہی کی طرح عمر بھی بہت پائی ہی گو سعدی کی طرح سو سے تو متجاوز نہیں ہوا مگر عشرۂ ثمانہ سے قریب قریب ربع صدی آگے نکل گیا تھا - سعدی جس طرح شیراز میں اپنی ظرافتوں سے نقل محفل ہی تو

آگرے میں ہی جس طرح اُن کی خوش طبعی نے سیکڑوں لطائف ایران میں پھیلائے ہیں اُس کی زندہ دلی نے ہندوستان میں- ایک بڑی سلطنتِ اسلامی کا چراغ اُن کے وقت میں بھی گُل ہوا اس کے وقت میں بھی بڑے بڑے انقلاباتِ تمدنی سے جس طرح اُن کو عبرت کا موقع ہاتھ آیا تھا اُسی طرح اس کو بھی- اُنھوں نے سلطنتِ عباسیہ کی تباہی کا مرثیہ لکھا ہی تو اس نے بھی شہر آشوب کے پردے میں سلاطینِ مغولیہ کی بربادی پر اشک حسرت بہائے ہیں- وہ جس طرح کمالِ فارسی کے ساتھ اعلیٰ درجے کے ادیبِ عربی مانے جاتے ہیں یہ کمالِ اُردو کے ساتھ اعلیٰ درجے کا ماہرِ ہندی خیال کیا جاتا ہی نصیحت و ظرافت جس طرح اُن کے کلام میں شیر و شکر ہی اُسی طرح اِس کے کلام میں-

وہ قطعہ جو مشہور ہی-

در شعر سہ تن پیمبرانند	ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را	فردوسی و انوری و سعدی

اِس میں سعدی کو صرف غزل کا اُستاد مانا گیا ہی- اِس اعتبار سے ہند میں دو شخص سعدی قرار دیے جاسکتے ہیں- متقدمین میں امیر حسن سجزی معاصرِ حضرت امیر خسرو دہلوی اور متاخرین میں میر تقی-

نظیر کو سعدی کہلانے کا صرف اسی قدر استحقاق ہی کہ اُس کے اکثر اشعار پر میر کے اشعار کا دھوکا ہوتا ہی چوں کہ وہ میر کا معاصر بھی تھا اور آگرے کے تعلق سے ہم وطن بھی لہذا اِس قسم کا تشابہ کوئی امر مستبعد بھی نہیں ہی مبصر جانتے ہیں کہ نظیر کی سلجھی ہوئی باضابطہ غزلوں کی تشبیہ سوا میر کے اور کسی کے کلام سے ہو نہیں سکتی وہ سچے عاشقانہ خیالات ایک خاص درد کے ساتھ سیدھے سادے بولوں میں ادا کر دیتا ہی جس سے سامع بے اختیار ہو جاتے ہیں- یہی حال سعدی کا ہی اور یہی حال میر کا- تصوّف کی چاشنی بھی ایک خاص کیفیت کے ساتھ تینوں

اُستادوں کے کلام میں شریک ہے۔

لیکن حقیقت میں نظیر ہندوستان کا سعدی نہ اس لحاظ سے ہے کہ وہ غزلوں میں شیخ کا مقلّد ہے بلکہ اس لحاظ سے کہ وہ اُس کے نصائح کے سرچشمے سے سیراب ہوا ہے اور کچھ اُسی طرح کے سرچشمے سے سیراب بھی کرتا ہے۔ اُردو کے شُعرا میں سعدی دکنی سے لے کر حالیِ پانی پتی تک کوئی شاعر ایسا نہیں گزرا جس کا کلام نظیر کی طرح نصائح کا مقبول اور پُر تاثیر اور بیش بہا ذخیرہ ہو۔ متقدمین میں خاص نصیحت کو تو اوّلاً کسی نے لیا ہی نہیں اور جس نے لیا بھی تو اس بے دلی سے کہ اُس کی نصیحت کا رنگ نہ جما۔ غزلوں کو دیکھیے تو اُس میں عشق۔ مثنویوں کو دیکھیے تو اُس میں عشق۔ قصائد میں کچھ تفنّن ہے تشبیب سے کچھ اشعار پند و نصیحت شاید نکل سکیں۔ مگر وہ شخص پند و نصیحت کیا کرے گا جس کو آگے چل کر شدت سے خوش آمد کرنی ہے وہ زیادہ تر بہار پہ لٹو ہے تاکہ ہتھیلی پر سرسوں جما کر خوشامد کے سبز باغ دکھانے کا پُر بہار موقع ملے۔ مسدس کے جہاتِ ستّہ بھی اسی آفتِ عشق سے گھرے ہوئے ہیں۔ لکھنؤ کے مرثیہ گویوں نے البتہ کچھ اس روش میں عقیدت کے ہاتھوں سے نصیحت و پند کے پھول لگائے ہیں مگر غم و ہم کی سموم وہاں اس شدت سے چلی ہے کہ پھولوں سے آئی ہوئی شگفتگی رخصت ہو گئی ہے اکثر کیاریوں پر طوفانِ گریہ نے پانی پھیر دیا ہے۔ جہاں گرم ہوا کا جھونکا نرم ہے وہاں لفاظی کے خس و خاشاک اس قدر پھیلے ہیں کہ پھول نظر نہیں آتے۔ گل چیں کانٹوں کے ڈر سے دامن سمیٹے الگ بیٹھے ہیں۔

اُردو کے شُعرا میں نظیر ہی ایک شاعر ہے جس نے خاص نصیحت پر اپنی نظر جمائی ہے اُس کے نصائح بلند پروازی کے پر لگا کر نہیں اُڑتے بلکہ تجربے کی گہرائی سے اُبلتے ہیں اور خوش نما طرز پر آ بلتے ہیں۔ اُس کے لفظوں میں قطراتِ باراں کی لطافت چمک صفائی اور شیرینی ہے۔ اُس کے فقروں میں آبشار کی سی روانی اور شور ہے اُس کی نظموں میں جھرنے کا سا قدرتی جوش ہے۔ مثنوی تو اُس نے بہت کم لکھی ہے۔ میری نظر سے اُردو میں صرف ایک گزری قصہ بھی

علیٰ ہذا - مگر مسدّس اور مخمس اس کے اکثر عقیدت حکمت اور نصیحت کے رنگ ڈھنگ سے جواہرات کی سچ لڑیاں ست لڑیاں ہیں - افسوس ہے کہ اس کا کُل کلام میّسر نہیں ہے ورنہ سعدی کی ہر نصیحت کے مقابلے میں اس کی ایک نصیحت پیش کی جا سکتی - ناصحانہ مجموعوں کے جمع کرنے والے مجبوری اس کے باغِ طبع سے گُل چینی کرتے ہیں - اوّلاً تو ایسے مجموعے کم ہیں مگر جو چند ہیں اُن میں کوئی مجموعہ میری نظر سے ایسا نہیں گزرا جس میں کثرت سے نظیر کے اشعار نہ لیے گئے ہوں - غرض یہی نصیحت ہے جو نظیر کو اُردو کا سعدی بناتی ہے - جب تک نصیحت کا شیراز آباد ہے اس کو اس خطاب سے کوئی اتابک سعد محروم نہیں کر سکتا -

اُردو کے شعرا میں شیکسپیر ہونے کی صلاحیت کس میں ہے

شمس العلما مولوی امداد امام صاحب ایک دن مجمع احباب میں اپنے زمانۂ گزشتہ کا ذکر کر رہے تھے۔ جب وہ ممالکِ مغربی و شمالی میں کسی مقام پر پیشۂ وکالت کرتے تھے۔ کسی انگریز سے اُن سے بہت ربط بڑھ گیا تھا۔ اُس کو چوں کہ اُردو فارسی کا بہت شوق تھا اور یہ ایک مستعد آدمی تھے اکثر ان سے علمی مذاکرہ کیا کرتا اور فائدہ اُٹھاتا۔ ایک دن اُن سے اُس نے یہ سوال کیا کہ کیوں مولوی۔ تمھارے اُردو کے شاعروں میں شیکسپیر کا ہم پلہ بھی کوئی ہے۔ یہ سوال ایسا تھا کہ جس کا جواب بہت آسان نہ تھا۔ غور میں آئے اور تھوڑی دیر کے بعد یہ جواب دیا کہ ہماری زبان میں ڈرامہ کا رواج نہ تھا۔ اِس سبب سے واقع میں تو کوئی بھی شیکسپیر کے مقابلے میں کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن باعتبارِ قوّت ہم سودا میں شیکسپیر کا سا مادہ پاتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ بعض نظموں میں اُس کی اعلیٰ درجہ کی زباں دانی کی مثالیں موجود ہیں۔ چنانچہ فیضو چیک باز کی ہجو+ جو لکھی ہے اُس میں میر شکاروں کی اصطلاحیں اور قوش خانے کی تفصیلات اِس کثرت سے ہیں کہ اُس کی وسیع النظری اور کامل

+ سودا کا قوش خانہ دیکھا گیا۔ باز۔ شاہیں۔ جُرّہ۔ باشہ۔ باشین (مادہ باشہ) بشکرہ۔ تُرمتی۔ کُہی۔ بسیرا۔ چیک۔ دھوبی۔ کوئی گیارہ جانور ہیں اور اِن کی زد پر یہ طیور نظر آئے:۔ بٹیر۔ چڑیاں (مادہ لال) سارو۔ ڈھڈھو۔ تیتر۔ پنگ (ایک چڑیا کا نام) لٹک۔ نوغائی۔ ڈھیٹر۔ بیٹر۔ سبزک۔ بگلا۔ کبوتر۔ ٹیٹری۔ بزے۔ قمری۔ تیتر۔ لوے۔ ابلقے۔ تاز۔ قرقرے۔ کلنگ۔ سارس۔ حواصل۔ بیمرغ۔ کوّے۔ مینا۔ طوطے۔ چوہے مار۔ گد۔ پودنی۔ شکاری غیر شکاری دونوں ملا کر کوئی بیالیس ہیں۔ نظیر کے ہاں ۵۰ سے بھی کچھ زیادہ ہیں۔ سودا کے ہاں ترمتی۔ کہی۔ بسیرا۔ چیک۔ دھوبی۔ پنگ۔ چڑیاں۔ چوہے مار۔ یہ سات وہ ہیں جو نظیر کے ہاں نہیں ورنہ سب ہیں۔

معلوماتِ لسانی پر دلیل کافی ہوسکتی ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ سودا کی معلوماتِ لسانی واقع میں بہت ہی وسیع ہے۔

وہ ہر طبقے اور گروہ کی اصطلاحوں سے اس طرح واقف ہے جیسے وہ مدتوں انھی میں رہا اور انھی میں پلا پرورش پایا ہو۔ وہ جب کسی پتنگ باز لونڈے کی ہجو کرتا ہے تو خود ایک چھٹا ہوا پتنگ باز ہے۔ کبھی کسی کی پیندی میں پھندنا لٹکاتا ہے کبھی کسی کو کسی کے پیچھے پچھالا بناتا ہے۔ کہیں کسی کو سوسو بار گھر نیس کھلاتا ہے۔ کہیں نئی ترکیب سے ارگجا مل کر زردو باز بناتا ہے۔

موتڈھوں پہ ارگجا ملے ہے یہ جب	زرد اس کو دوباز کہتے ہیں سب

کبھی کسی کے ہاتھ میں شیشہ دے کر مانجھا چڑھاتا ہے۔

رگڑا شیشے کا دو جو اس کے ہات	پھیر مانجھا چڑھاؤ ساری رات

کبھی کسی کے کنّے ڈھیلے کرتا ہے۔

پاس کے آدمی کا یہ جی لے	خوب کنّے نہ ہوئیں تا ڈھیلے

اصطلاحوں کی کثرت سے نظم میں وہ کیفیت پیدا کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے دا ایک وسیع میدان ہے اس میں پتنگ بازی کا میلا ہے۔ آسمان کنکوؤں سے چھایا ہوا ہے۔ کوئی یہ کٹا وہ کٹا کر رہا ہے۔ کوئی ڈھیل دے رہا ہے

+ ٹھڈا۔ پیٹا۔ ڈھیل۔ لوہائی۔ ہوا نہ پانا۔ لوٹ لینا۔ یہ کٹا وہ کٹا۔ کنیانا۔ پیچ میں لانا۔ کاٹ دینا۔ پیچ میں آنا۔ ٹوپی والی لنگوٹیا۔ بوندھ ہونا۔ سپولیا۔ پیچ دُہرم کرنا۔ بدھی دار۔ چوٹی دار۔ کنّے ڈھیلے ہونا۔ ڈھانا۔ کھڑا تنا ہونا۔ لولنگر۔ چھٹی پیندی کو جوڑنا۔ موڑنا۔ اتارنا۔ چڑھانا۔ بگلا۔ چکر۔ جھپ کھانا۔ مانجھا چڑھانا۔ کنکوا۔ شہ دینا۔ گرہ پڑجانا۔ لڑنا۔ خوط دینا۔ دودھارا۔ کھپنا۔ بڑھانا۔ تکل۔ کلسرا۔ پتنگ۔

پچھار۔ دم چھالہ۔ کنکوے یا پتنگ کی دم۔ دنبالہ۔

کہیں پیچ دُہرم ہوگیا ہے۔ کوئی غوطہ دے رہا ہے کسی کا کنکوّہ جھنجل ہو رہا ہے اور سر دُھن رہا ہے۔ کوئی اُتار رہا ہے کوئی بڑھاتا ہے۔ کسی نے ڈھیل دے کر کاٹ دیا ہے۔ کھینچے آ رہا ہے۔ کنکوہ بُونبد ہو رہا ہے۔

جب کسی بقّال اصل شاعر کی خدمت میں مصروف ہوتا ہے تو پورا بنیا نظر آتا ہے۔ وہی پرکھا۔ وہی رام وہی گھنا۔ وہی بیچ گیر۔ وہی نکد۔ وہی مُپھت۔

ہنس کے لگا پوچھنے "کی ہے جی یہ جب نور
سُن کے کہا بنیے نے "مرگ ہے یہ اپنی بھاؤن
پھر وہ لگا پوچھنے "کہ یہ تو جینوے ہے کیا"
"سانچ بتاؤ مجھے باج کا کی بھاؤ ہے
سنتے ہی پر بھاؤنی اس میں ہے کیا تیری مت
پیسے مرے کرج ہیں ایک سپاہی کے پاس
باج بڑا ہی سا ایک دیکھا میں اُس کے کنے
بنینی۔ بولی بنینی یہ سُن "اُذت[ف] تجھے کھیر ہے
بنیا۔ سُن کے کہا بنیے نے "کی کہی یہ تیں نے بات

پرکھا ہم سے کہو لے چلے اس کو کدھر"
سانچ کہو پرکھا باج اسی کا ہے ناؤں"

+ + +

ایک کھریدار کو اس کا گھنا چاؤ ہے"

+ + +

اس سے نکد ملنے کی مجھکو نہیں ہے اب آس
اس کو کھریدوں میں اب کال کو جو وہ نبے"
اس کی رسوئی ہے ماس، اس سے ہمیں بیر ہے"
ناہ ری پر بھاوتی، رام کی سوں دو دو بھات"

کنکوا۔ تُکل۔ چنگ۔ پتنگ۔ لنگوٹیا۔ سیولیا۔ بگلا۔ بڈھی دار۔ چوٹی دار۔ کلسا۔ دوباز۔ ٹوپی والی۔ دودھارا۔ بھمنا۔
سات تانوں میں گور کھواسے مُوند + یہ بھمنا ہو اُس جگہ سے بھی بُونا۔
بھو گھڑا۔ شوق ہے گھر گھر کے جانے کا + جامہ پہنے ہے چار خانے کا۔
بو ہائی۔ ٹھڈّا۔ پیٹیا۔ لو لنگر۔ ڈھیل۔ یہ کٹا وہ کٹا۔ ذغیرہ۔ وغیرہ۔

ف اُذت۔ (۱) بن بیاہا۔ کنوارا۔ وہ مرد جو بیاہ ہونے سے پہلے مر گیا ہو۔ (۲) بے وقوف۔ احمق (۳) نامراد۔ لاولد۔ بے اولادا۔

بنیی بولی "جو یہ سانچ ہے، لاکے اسے تو سوئیر — تھوڑے گھٹے کو نہ سوچ، جوں بکے توں بیچ گیر"

بنیا۔ آکے سپاہی کے گھر بولا کہ "مرجا جی آؤ — کرکے حساب آج تم لینے کو سیرے چکاؤ"

بنیا۔ بنیے نے سن کر کہا "کرج میں کچھ بھیر ہے — کھیر جو بتلاؤ ہو، آج تمھیں کھیر ہے

سیانے تھے مرجا جی تم ہم سے کرج لینے میں — تیکھے ہوے جاتے ہو کاہے کو اب دینے میں

ہو جو چکو تامرا باج کے بکنے ہی پر — باج کو ہی دو مجھے سانچ کا کچھ بھاؤ کر"

بنیا۔ بول اٹھا بنیا یہ سن پرکھا کی کھیر ہے — "کرج کسو کا نہ دے کوئی عجب شیر ہے"

بنیا" دیکھ تو پر بھاوتی، پرکھا، کی باج ہے — رام جی کے پھچل سے آج ہمیں راج ہے

بنیی۔ دیکھ کے اُن نے کہا "اوت تجھے ہی لوم — یہ تو جنا ور ہے وہ، ترک کہیں جس کو بوم

ناؤں نہیں لیویں ہیں پر تھی میں اس کا سوئیر — کھو یا کرج ساتھ تیں نکدر وپیوں کا ڈھیر"

بنیا۔ کہنے لگا "ہاے وہ کیا یہ دگا دے گیا — سونگ اور دو کی جنس گھر سے مپھت لے گیا"

بنیا" سانچ بتا میری بات، لینے پہ کچھ تو بھی ہے — سب ہے دیا رام کی، یہ بھی ہے آلو بھی ہے"

جب کسی ضائع روزگار لکڑی باز لونڈے کے ساتھ ہاتھ ملاتا ہے تو پورا پہلوان ہے۔ مرزا مفت برجی بن کر آتا ہے اور یوں اکھاڑے میں ڈنڈ پیلتا ہے:-

دیکھ کر دست بوس ہی میں سبھاؤ — کر گئے مرزا پور پوریہ داؤ

رکھ کے گردن پہ ہاتھ، مارے اڑے — کیا کہوں کس طرح سے کشتی لڑنے

کرکے یک دستی اور پیچھے جاے — گرہ دکھنے سے اس کو پیچھے بلاے

کسے ہفتہ، چڑھا دیے گھتے — اور کیا کیا کیا، کہوں کس سے

کس چکا کاچھ کے تئیں جس دم	پھر ہوا سامنے بجا کر خم[۱]
مرزا نے دھج بنا قدم گاڑا	لونڈے کو ڈھاک پر چڑھا مارا
نیچے سینے کا مرزا نے کر ٹھاٹ	کیا لونڈے پہ دوں ہی دھوبی پاٹ[۲]
چاہے تھا رانوں میں آسے جکڑا	لونڈے نے دوڑ ما لکھم پکڑا
کر کلا زنگ سے دے بغل کے بیچ	کیا کیا اس کو دکھائے اونچ اور نیچ
دے لنگوٹے میں ہاتھ چیرنا پھاڑ	کیا کہوں کیسی کی اکھاڑ پچھاڑ
دھس کے ٹھپوں میں پھر اٹھا لے چٹ	کہا "کہہ اب کے چت کروں یا پٹ"
کشتی کا لونڈے کو پڑا جو مزا	کہا "ہو جس طرح سے تیری رضا"
غرض اس رم میں اس کو بیچ کیا	ٹنگڑیاں کھینچ زور بیچ لیا
دے کے آسن بہت دو دم میں کلا	ٹانگیں جب دیکھیں مور چال چلا
الغرض اس طرح سے کشتی لڑ	ڈال ٹیکا بگلے میں، پاؤں پڑ
بولے مرزا "برا نہ مانوگے	اپنا اوستاد مجھ کو جانوگے"

جب الغراب حسین کی ماں کی زبان سے بین کرتا ہے ایک دکھیاری عورت نظر آتا ہے۔

ٹک تو پیارے لب کو کھول	غوں غاں کر با در سے بول
ہی ہی میرے لال انمول	جی ماں کا ہے ڈانواں ڈول

۱ے خم ٹھوکنا یعنی ٹھوکنا ڈنڑ بجانا۔

۲ے دھوبی پاٹ کشتی کا ایک پیچ جس میں حریف کو کمر پکڑ، کر دے مارتے ہیں۔

تجھ بن میرے نور العین
کیوں کر ہو اِس دل کو چین

روتا ہیں کس کو بہلاؤں
چھاتی آگے کس کو سلاؤں

دودھا تچھک کر کس کو پلاؤں
جھولے میں اب کس کو جھلاؤں

تجھ بن میرے نور العین
کیوں کر ہو اِس دل کو چین

بچے کو چڑیا جو کھوائے
دانا پانی اِس کو نہ بھائے

جنگل جنگل ڈھونڈنے جائے
رین[1] بسیرے، نیند نہ آئے

تجھ بن میرے نور العین
کیوں کر ہو اِس دل کو چین

گائے بھی تب اڑاتی ہے
آٹھ پہر دکھ پاتی ہے

بچھڑے جو چھوٹ جاتی ہے
میری تو کیا چھاتی ہے

تجھ بن میرے نور العین
کیوں کر ہو اِس دل کو چین

جاگ پیارے، ہوئی اوبیر
مجھ ماں سے مت آنکھیں پھیر

سومت، لالا، اتنی دیر
زیست سے مجھ کو مت کر سیر

[1] رین بسیرا رات کاٹنا۔ شب باشی۔

	تجھ بن میرے نور العین کیوں کر ہو اس دل کو چین	

لیکن اس امر میں کچھ سودا ہی مختص نہیں ہے۔ میر صاحب کی زباں دانی اعلیٰ درجے کی تھی۔ اس میں کسی طرح کا شک نہیں۔ لیکن ان کا کلام جس قدر موجود ہے اس سے اُس قدر گہری واقفیت کا اُن کے ثبوت نہیں ملتا۔ عام زباں دانی اُن کی بہت خاصی ہے۔ لیکن وہ زباں دانی کہ جس گروہ کے خیالات ظاہر کیے جائیں معلوم ہو کہ خود اُسی گروہ کا آدمی بول رہا ہے اُن کے موجودہ کلیات سے مستنبط نہیں ہوتی۔ اُن کی زبان ایک ثقہ شاعر کی زبان ہے۔ شستہ ترکیبیں اُن کے مزاج کا خمیر ہو گئی ہیں۔ وہ شاعری کے بلند زینے سے بمشکل نیچے اُترتے ہیں۔ چوں کہ بے دماغی بڑھی ہوئی تھی۔ مزاج میں ایک خاص خلوت پسندی تھی۔ سوسائٹی میں کثرت سے اُن کو ملنے جلنے کا کم اتفاق ہوتا تھا۔ ہر طرح کی صحبت میں شریک ہونا اُن کے نفس پر کسی قدر شاق ہوتا تھا۔ ثقاہت اتنی تو اجازت دیتی ہی نہ تھی کہ رقص و سرود کی محفل میں گھڑی دو گھڑی کو شریک ہو کر غم غلط کر لیں۔ با ایں ہمہ اس سے انکار کرنا کہ وہ ہر طبقے کی زبان سے واقف تھے اور اگر چاہتے تو ہر طبقے کی زبان خاصی طرح نہایت فصاحت اور برجستگی کے ساتھ لکھ سکتے تھے اُن کی زباں دانی پر بہت بڑا نقص عائد کرتا ہے۔ اُن کی شستہ اور متین ہی عبارت میں کہیں کہیں ہم اُن کی مفصل معلوماتِ زباں کی جھلک دیکھتے ہیں۔ مثنوی تو مثنوی غزل کی تنگ وسعت میں بھی اُن کی تفصیلی زباں دانی اکثر اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ آصف الدولہ کے شکار نامے میں شکاری معلومات کسی قدر تفصیل کے ساتھ نظر آتی ہے۔ مرغ بازوں کی مثنوی میں زباں دانی کی پالی میں تحقیق کے مرغ اچھے لڑے ہیں۔

پھر و پرزہ درست و یکساں ہے	مرغ تصویر کا بھی حیراں ہے

لات کی گھات کر جو مڑ جاوے	نسرِ طائر کا رنگ اُڑ جاوے
ٹینی کے سر پہ آج ٹیکا[1] ہی	اس کے آگے کیپنل پھیکا ہی
مرغ لڑتے ہیں ایک دو لائیں	سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
ان نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے	ان نے کی نوک یہ کڑکنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج	ساتھ اُس کے بدلتے ہیں سج دھج
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ	ایک کہتا ہی بس گیا اب لوٹ
جھکتے ہیں آپ کو چُراتے ہیں	لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں

ہولی کی مثنوی بھی اس رنگ سے رنگین ہی۔ سانگ بھی خاصے ہیں۔ آتشبازیاں بھی اچھی ہیں۔

گل فشاں ہیں پڑیں جو پھلجھڑیاں	کھلتیاں ہیں دلوں کی گلجھڑیاں
باؤ سے دو دیے ہوے گر ماند	دغیں مہتابیاں کہ نکلے چاند

میر صاحب کی زباں دانی واقع میں کتنی ہی ہو مگر سودا کے مقابلے میں ہم اُن کو کھڑا نہیں کر سکتے
سودا کے مقابلے کے لیے ہماری تحویل میں دو شاعر ہیں۔ ایک تو نظیر۔ دوسرا انشاء اللہ خاں۔
اب میر اور سودا اور نظیر اور انشاء اللہ خاں میں جو فرق ہی اُس کو ملاحظہ کیجیے۔ سودا کے
مزاج میں بالخلقۃ معرکہ آرائی ہی۔ وہ مزاج کا لڑاکا واقع ہوا ہی۔ اس کو جب غصّہ آتا ہی کسی طرح اپنے
مزاج پر قابو نہیں رہتا ہی۔ جو کچھ اُس کے منھ میں آتا ہی بک دیتا ہی۔ وہ تعلّی کے مضامین کو اپنے کلام
میں خوب چمکاتا ہی۔ وہ رسمی مشائخ اور خشک زہّاد پر اچھی ٹیپ جماتا ہی۔ ہجو کی گرمی کماں کو شعرا اردو میں

[1] ٹیکا خصوصیت کا نشان جیسے اُردو کے میرے ماتھے ٹیکا + مجھ بن بیاہ نہ ہونیکا۔

پہلے پہل اسی نے زہ کیا۔ جس قسم کی کمان اُس نے اپنے لیے تجویز کی تھی۔ اُس کے زہ کرنے کو کچھ اسی کی قوت بھی درکار تھی۔ لوگوں کو ہنساتا ہی مگر آپ نہیں ہنستا۔ جس قدر زیادہ ہنسانا چاہتا ہی اُسی قدر زیادہ مُنھ بنا تیوری چڑھا لیتا ہی۔ جس کے ذریعے سے وہ اپنے مخاطب پر خوش دلی کا اثر پیدا کرتا ہی معلوم ہوتا ہی کہ اُس سے اس کو ایک خاص کاوش ہو گئی ہی۔ بھانڈوں کی طرح وہ نقلی جوتے گدّے پر نہیں جماتا۔ وہ سچ مچ کا پکا سولھواں سر پر ہے کر مستعد ہو جاتا ہی۔ وہ بھانڈوں کی طرح اُن کو مہلت نہیں دیتا۔ جب تک چاند گنجی نہ ہو لے وہ ہاتھ نہیں روکتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہی کہ اس کی طبیعت میں کس قدر زور تھا۔ اس غیر معمولی زور کے نکلنے کے لیے ڈراما سے بہتر کوئی رستا نہ تھا۔ اُس میں یہ زور مختلف اشخاص پر تقسیم ہو کر ایک اچھا خاصا اثر پیدا کرتا۔ اس کی زباں دانی مختلف فرضی اشخاص کے مُنھ میں فصاحت کے لب و لہجے سے مناسب تقریر کرتی اور عمدہ طور سے پھولتی پھلتی۔ اس کی کاوش پسند خوش مزاجی اور کینہ کش زندہ دلی خیالی مسخروں پر دل کش اور مفید طور پر اپنا مسرت بار بخار نکال سکتی۔ غرض میری رائے میں وہ ایک عمدہ کمک رائٹر (ظریف انشا پرداز) ہو سکتا تھا جس کے قلم سے شاید اعلیٰ درجے کے ناٹک نکل سکتے تھے۔ رُلانے کی قابلیت اس میں میر سے زیادہ نہ تھی۔ میر کی طرح وہ دل برشتہ کہاں سے لاتا۔ یہ برشتگی میر صاحب کو فطرت سے ملی تھی۔ ایک آنچ کی کسر تھی وہ مصائب نے مٹا دی۔ زمانے کے مصائب نے اُن کے دل کو ایسا گداز کر دیا تھا کہ اُن کے ہر شعر سے دل پر ایک چوٹ بیٹھتی ہی اور ہر نظم سے ایک خاص اُداس اثر قلب پر پیدا ہوتا ہی۔ اسی سے لوگ کہتے ہیں کہ اُن کے کلام میں ستر دو بہتر نشتر ہیں۔ دنیا کی معلومات اس شخص کی بھی کم نہ تھی۔ اگر اس شخص کی طبعی ٹریجیڈی کے آتش فشاں سے اُبلتی تو آنکھوں سے اشک کے چشمے ایک خاص خوش نمائی سے جاری ہوتے۔ ان کی آہِ سرد نسیمِ سحر کا کام نہیں دے سکتی تھی اور کسی طرح اِن کی ہوائے طبیعت کے جھونکے

سے کمیڈی کے گلزار میں پھول کھل نہیں سکتے۔ خلاصہ یہ کہ سودا ٹریجیڈی کے لیے ناموزوں تھے اور میر کمیڈی کے لیے پورے شیکسپیر نہ یہ ہو سکتے تھے نہ وہ۔ ہاں کسی طرح دونوں روحوں کو قدرت ایک قالب میں پیدا کرتی تو شاید ہم شیکسپیر کا جواب ایک شخص کے ذریعے سے دے سکتے۔

اب انشا اور نظیر میں فرق سنیے۔ انشا کے مزاج میں ظرافت غایت درجے کی ہے، وہ اخذِ زبان کا ایک خاص ملکہ رکھتا ہے۔ ابھی وہ پنجابی بولتا ہے۔ ابھی پشتو میں "ڈوڈے او خرڑا" کر رہا ہے۔ پل میں وہ ایران پہنچا ہے اور شاہِ ایران کی زبان بن کر یوں سناتا ہے: "بوکہ من ہم زعنایاتِ تو حظے ببرم"۔ دم میں ترکستان پہنچتا ہے اور والیِ ترکستان کی زبان سے یوں ہانک لگاتا ہے: "شاہ سن ایلہ گدا او ستنہ ای شاہ کرم"۔ پھر عرب کا شاعر بنتا ہے اور یوں ارشاد کرتا ہے ؎ مثلہ لیس شجاعٌ و امیرٌ فی الدھر ٭ خصہ اللہ مغیثاً لجمیع العالم ٭ پھر اطراف خراسان سے یہ زمزمہ سناتا ہے:

ہو کہ در عشقِ تو دوبا در مجہم	بزمیں در مبلیم بہوا در مجہم
دلبرِ مو بنشا پور دوالی بشد	تو ببیں موز کجا تا بکجا او زمجہم
حلتہ عہد مرا یوسف او شاہ براغ	مو نمک خوردہ رلار مطبخہ منظر بدرم

کبھی رجپوت کا روپ بھرتا ہے اور دشمن کے چھریاں مارتا ہے:

کائیں باندھا چھری بیری جو ہو جائے بھسم

کبھی زمان شاہ کی زبان سے کابل سے یہ لہجہ سناتا ہے:

زر زماراں زما دوار پتا صدتے کرشم

کبھی گنگ انگریز بن کر یوں گٹ پٹ کرتا ہے:

او مئی لارڈ یو نو آلمٹی یور سلیو

پیشوا بن کے کبھی یوں امامِ فصاحت بنتا ہے:-

داداری اکڑی آلہ نچہ سلہدار ری بوا

حاکم کشمیر بن کر کبھی یوں بندگی بجا لاتا ہے:-

یہ بندہ بھی فدوی تجھ کو ہے بے دام و درم

زری ل محلہ موں سکونت درزیدہ	یا نہیں مجھکو دیا چاہیے کا او ساک کرم

برج کی گوپیوں کی زباں سے کبھی یوں بنتی[۱] کرتا ہے:-

ڈھونڈرے درم کے پنگھٹ ہوں تبی آی جو	جھوم رے سیام برن کیس چھپے چھلکے تم

کبھی مجھمی کی زبان سے یوں مژدۂ دولت سناتا ہے:-

تورے چرنوں لگی ہوں چھاڑو تے سگرو گھم

کبھی کسی مُغلیے سے تمسخر کر رہا ہے:-

تمھارے ہاتھ سے ساقی جو شیشہ توت گئی	بلا ہوا کہ دگر تم بلا سے چوت گئی
چہ جوت جوت دروغے کہ ناک میں دم ہے	مُغل جو تم سے ملا قسمت اُس کا پوت گئی (پھوٹ گیا)
مثالِ ماہیٔ بے آب میں تڑپتی ہوں	نکل کے دل سے آں ہو یہ بیچ جوت گئی
چہ چیز جالہ مکری ہست زالِ محتالہ	جوے کے تار سخن را چو عنکبوت گئی
عطا مہ نخرہ چوں فدائے نخرۂ او	اور اُس کی زلف کی جوں آنکھ چپ سے توت گئی

[۱] بنتی: عذر خواہی، معذرت، منت سماجت، عرضِ التجا۔

جو اُس پری کو میں دیکھا یہی کہا انشا
کہ فوجِ غلبہ آئی مغل کو لوٹ گئی

کبھی اہلِ خطہ کی خاک اُڑا رہا ہے:-

ایک اہلِ خطہ مجھ سے ہو کر خفا یہ بولا
چاہیئے اوقف پکڑتا تو بے عقل شعُور ہست
میں نے جو اُس کو کانا کچھو دیا چمن میں
مجھ کو اندر خندہ کے گالی کیا چمن میں

مُغلوں کی نقل ایک اَور:-

سُنکر اسیر بادسبس آغا نے اک جریب
کہنے لگا چرن جی چرن جی تو بولے آپ
ایں مردمانِ ہند مرامی کنند اسیر
دی پُشتِ برہمن پہ بہ زورِ تمام چھوڑ
کردی تو بددعا م چرا رام رام چھوڑ
ام با باگ جاویں گے بس ایں مقام چھوڑ

لہجہ برہمہ و ہنود:-

مہاراج جی تم نے یہ سچ کہا
کہے ہیں اُنھیں دیکھ کر راجہ اندر
جنھیں درشن ات ہیں اُنھیں درشن اُت
یہ تجلیات ہیں تمتیں دامن کی ذات

انگریز کی نقل:-

کرچ لے کر آہ کی کہتا ہے یوں دل چرخ سے
تم سے وَل بو گر بڑا صاحب لڑائی مانگتا

اہلِ عرب کی نقل:-

عجب طرح کا یہ مضمون ہاتھ آیا تھا
تو اہلِ ہند کے سمجھانے کو یہ کہتا تھا
کسی عرب کی جو ضربت سیدہ تھی کفِ دست
ہنا مُلاحظہ شُفُ انّ ہذہ اچھوت است

اسی طرح عربی۔ فارسی۔ اُردو۔ کو بھی قیاس کر لیجیے۔

غرض اُس کے منھ میں پندرہ سولہ زبانیں ہیں۔ ہر چند یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہر زبان کو مصنّفانہ قابلیت کے ساتھ جانتا تھا لیکن اس میں کسی طرح کا شبہہ نہیں کہ وہ زبان سیکھنے کی ایک خاص صلاحیت ازل سے لے کر آیا تھا۔ وہ ہر آدمی کا لہجہ اختیار کر لیتا تھا اور نہایت ہی عُمدہ طور سے اُس کی نمائش کرتا تھا۔ یہ ایک خاص قدرت ہی جس کو ڈرامہ نویسی سے زیادہ ڈراما کے ایکٹ کرنے میں دخل ہی۔ خوش طبعی اور ظرافت کا مادہ بھی اسمیں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ سعادت علی خاں کے دربار میں جہاں یہ پہنچا معلوم ہوا کہ ایک طائفہ بھانڈوں کا آگیا۔ کبھی نواب کی ڈھول کھا رہا ہی۔ کبھی کسی کشمیری کو بیٹھا چڑا رہا ہی۔ کبھی بیگم کی طرح دوپٹہ اوڑھ کر ناز نخرے کے ساتھ ریختی کے اشعار پڑھ رہا ہی۔ دلوں میں کمر کولے کی لچک اور مٹک چٹک دیکھ کر مردانہ گدگدی پیدا ہو رہی ہی۔ حاملہ عورت بنا ہی۔ دردزہ کی بے اختیارانہ چیخیں دُور دُور تک پہنچ رہی ہیں لوگ سمجھتے ہیں واقعی کوئی نیک بخت بچہ جن رہی ہی۔ کبھی وہ بچہ ہی جو ابھی پیدا ہوا ہو۔ اُسی طرح رو رہا ہی۔ لوگ ہیں کہ مارے ہنسی کے بے اختیار ہو رہے ہیں۔ نواب رزیڈنٹ سے ملاقات کر رہے ہیں۔ یہ نواب کی کرسی کے پیچھے رزیڈنٹ کو دکھا دکھا کر کھڑا چھرے کی لے رہا ہی۔ وہ جھیپ کر سر نیچا کر لیتا ہی۔ خلاصہ یہ کہ ندیمی کے اسٹیج کا خورشید جی تھا۔ جو حرکت تھی مُضحک، اور جو بات تھی ہنسانے والی۔ اگر اس کو کسی واقعی اسٹیج پر باضابطہ تعلیم دی جاتی تو یقیناً اول درجے کا گیٹرک ہوتا۔ زبان کے اخذ کی غیر معمولی قُدرت۔ مزاج کی جبلی شوخی۔ طبیعت کی طبعی شگفتگی۔ اعلیٰ درجے کا انتقال ذہن۔ کافی علمی استعداد۔ یہ باتیں اُس کو ایک عمدہ ڈرامہ نویس بنا سکتی تھیں۔ لیکن متانت کی اس میں بھی ایسی قلت تھی کہ شاید وہ عُمدہ ٹریجیڈی نہیں لکھ سکتا تھا۔ اُس کے کلام میں کوئی ایسی مثال مجھ کو نہیں ملی جس سے دل پر کوئی گہرا اثر رقت کا پڑے۔ وہ انسان کے عادات و خصائل کو کوئی غائر نظر سے دیکھتا نظر نہیں آتا۔ وہ سرسری طور پر ہر مجمع پر نظر ڈال

جاتا ہے۔ خیالات کی انجمنیں، اور اغراضِ متفرق کی کمیٹیاں جو دلوں میں جمی ہوئی ہیں اُن کی کارروائی اور رووداد کی بہت کم پروا کرتا ہے۔ اِس لیے وہ اُس عالم کے متعلق کبھی کوئی سنجیدہ اور فہمیدہ رائے نہیں دیتا۔ ڈرامہ کے لکھنے میں سب سے بڑی چیز انسان کے اطوار اور اخلاق ہی کا پہچاننا ہے جس کو مختلف اشخاص کے خصوصیات خیالی کا زیادہ علم ہے وہی عُمدہ طور سے اُن اشخاص کی تصویر بھی کھینچ سکتا ہے۔ آخذ زبان میں نظیر کو بھی ہم کسی طرح کم رتبہ نہیں پاتے۔ اُس نے ایک نظم لکھی ہے جس میں سات زبانیں ہیں۔

(۱) فارسی

پری رُخ من، شکر لب من، دمی تو باز آ بہ پیشِ چشم	بیا دِ سروِ تو بے قرارم، نہالِ عشقت شدہ است بالا

(۲) عربی

فدائے وجھک عشی شر قک، دُموع تجری من فراقک	کثیر حُزنی مع الھموم ثقیل ہجرک کالجبالا

(۳) پنجابی

تساڈی ملنے نوں دل ہے بے کل، ایہی وہ گلاں نت اکھدا ہے	سانوں ایہنوں دی اپنے گھر وچ نہیں تو اتی اسادے نالا

(۴) ہندی (بھاشا)

تہاری آسا لگی ہی نیس دن، تہاری درشن کو ترسیں نیناں	دُلاری سُندر، انوٹھے ابرن، ہٹیلے موہن، انو کھے لالا

(۵) مارواڑی

اپن کے من کو جو چھینیوں تہیں لے یار کائیں لگائی اتنی	پھر انجھیں آکر کھر لو مہا نکی پلک کٹار اجہ تھانے گھالا

٭ پنجابی زبان کے دو شعر باطن نے دیوان سے بھی نقل کیے ہیں۔ یہ حسن دی بہاراں جن دلی آندیاں ہیں + کہ کہ طرح جگر وچ دھومیں مچاندیاں ہیں
کوئی نہ تکھدا ہے، دیکھو ادھر تو پیارے + تم بن ہماری انکھیاں آنجھو بہاندیاں ہیں۔
ہوکے خفا اور تیوری چڑھا کر بولی ہیں اپنی کہا نظیر + آپن نے جد گھالی تھی نہیں بن ٹھن ادھو کا بن چھے۔

(۶) پوربی

ارے سجیلے، ارے چھبیلے، ارے ڈھبیلے، کبھی تو آنان	اگن برت ہی ہیا میں مورے برہ میں تیرے اے من موہنواں
تورے جو نینوں نے موہا مھکوں نہ چینوں تنکو بھوا دکھالا	

(۷) برج

جگت سبھا امت بر ہکھ اٹک کھسو امن کرن کہا		دوائی کینی تُمن سُرجن، نہ سُدھ کی گر، پہ، نہ بُدھ کی جھالا

ان سات زبانوں کے علاوہ آٹھویں زبان وہ اُردو بھی جانتا تھا۔ اِس زبان کے نکات جیسے اُس کو معلوم تھے شاید کم کسی پر کھلے ہونگے۔ آزادوں کے لہجے میں جب وقت گفت گو کرتا تھا معلوم ہوتا تھا واقعی اُنھیں کے میل کا آدمی ہی۔ جوگیوں کی اصطلاحوں میں جب اپنے خیالات ظاہر کرتا تھا کوئی سُن کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ جوگی نہیں ہی۔ ہندوؤں کے مردانہ اور زنانہ خیالات کی تصویریں جو اُس نے کھینچی ہیں اُن کا کسی مسلمان کے قلم سے نکلنا ایک قسم کا تصرف معلوم ہوتا ہی۔ وہ گنواریوں کے روزمرے اِس خوبی سے ادا کرتا ہی معلوم ہوتا ہی کبھی شہر میں اُس کا گذر بھی نہ ہوا تھا۔ ریختی کو اُن دنوں شروع شروع رواج ہو رہا تھا۔ ہنوز اُس کو پوری قبولیت حاصل نہ ہوئی تھی۔ اساتذہ شعرا اُس کی نسبت رکیک خیال ظاہر کرتے تھے۔

میر صاحب دیوانِ سوم میں فرماتے ہیں:۔

	خیروں نے ریختی کو دوں ریختہ بنایا	جوں اِن دنوں میں بالے لڑکوں کی بالیاں ہیں	

میر درد کے ایک شاگرد میر عفیر غینی دیّانی نے کوچہ بلاقی بیگم کی بی نورن سے جو ایک مشہور تقریر کی ہی اُس میں اُنھوں نے بھی ریختی کے باب میں اپنے خیالات خلاف میں ظاہر کیے ہیں وہ اُس سب سے زیادہ ایک ور سُنیے کہ سعادت یار، طہماسپ کا بیٹا، انوری ریختے کا آپ کو جانتا ہی۔ رنگین تخلص ہی۔ ایک قصہ کہا ہی

اُس مثنوی کا "دل پذیر" نام رکھا ہی۔ رنڈیوں کی بولی اُس میں باندھی ہی۔ میر حسن پر زہر کھایا ہی۔ ہر چند اُس میر مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔ بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اِس کو شعر کیوں کر کہیے سارے لوگ لکھنؤ کے اور دلی کے رنڈی سے مرد تک پڑھتے ہیں۔ بیت

چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی	کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

سو اِس بچارے رنگین نے بھی اُسی کے طور پر قصہ کہا ہی۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ سالدار مسلم، لیکن بچارا بر چھے بھالے کا رکھنے والا، تیغے کا چلانے والا تھا، تو ایسا قابل کہاں سے ہوا۔ اور کرہائی[ھ] پن دکھائی پن جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہی تو ریختے کے تئیں چھوڑ کر ریختی ایجاد کی ہی اِس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں اور اِن کے ساتھ اپنا مُنھ کالا کرے۔ بھلا یہ کلام کیا ہی ع

یہاں سے ہی کپ پیسے ڈولی کہارو

اور نچوڑی انگیا۔ اور نگوڑی انگیا۔ اور مروڑی انگیا۔ اور مرد ہو کے یوں کہے ع

کہیں ایسا نہ ہو کم بخت میں ماری جاؤں

اور کتاب بنائی ہی اُس میں رنڈیوں کی بولی لکھی ہی۔ اوپر والیاں چیلیں۔ اوپر والا چاند۔ اُجلی دھوبن۔ اندر والا دل۔ اور دوگانا[۱] سہ گانا بیگانا زناخی[۲] الایچی دوست۔ لیکن جب آدمی کو واقعی شاعرانہ مذاق ہو وہ عورتوں کی

ھ کرہائی = مرد شبیہ بزناں در لباس و کلام و حرکات۔

۱ دوگانا۔ ہم عمر عورتوں کا ایک رشتہ جو دو مغز کا بادام کھا کر جوڑا جاتا ہی۔ گر دوگانا وہ نہیں ہی تیری ہر دم تو یہ پھر چھیڑتی ہی تجھے کیوں آن کے سوسن کو کا (رنگین)

۲ زناخی قلعے کی عورتوں کا دستور تھا کہ وہ آپس میں اِس طرح کے رشتے مقرر کرکے ایک دوسرے کو خطاب کیا کرتی تھیں جس طرح سہیلی بھینیلی کہتے ہیں اِسی طرح وہ کسی کو دل و جان کسی کو جان من کسی کو دشمن کسی کو زناخی کہا کرتی تھیں۔ زناخی کا رشتہ اور رشتوں سے زیادہ مضبوط اور قابل قدر گنا جاتا تھا۔ جب اُنھیں کسی کو زناخی بنانا منظور ہوتا تھا تو وہ باہم مل کر زناخ یعنی کبوتر یا مرغ کے سینے کی جڑی ہوئی ہڈی کو توڑا کرتی تھیں۔ گویا اِس طرح پکی یاری بدی جایا کرتی تھی۔ ہر زناخی مری وہ لال پری + ہو جسے دیکھ کر نڈھال پری + (رنگین) بیگمات قلعہ جب کسی عورت سے بہنا پا کر کے الایچی کے دانے باہم کھاتی تھیں تو اُسے الایچی کہا کرتی تھیں۔ (طبق زنوں کی اصطلاح)

پیاری بولی کو کیوں کرنا پسند کرسکتا ہے۔ عورتوں کی زبان مختلف اسباب کی وجہ سے آمیزش سے محفوظ رہتی ہے
اُس میں زبردستی کے عربی فارسی الفاظ شریک نہیں ہوسکتے۔ اس میں غیر زبانوں کے محاوروں کا خام ترجمہ دخل نہیں
پاسکتا۔ تکلّف کے استعارے اور تشبیہیں اُس میں مائی نہیں رکھتیں۔ استعارے سیدھے سادے اُلجھاؤ سے
دور تشبیہیں برجستہ، قدرتی تکلّف سے الگ۔ پھر آوازوہ کہ چڑیل بھی اگر پردے میں بول رہی ہو تو معلوم ہو
کوئل کوک رہی ہے یا بلبل چہک رہی ہے۔ دل میں اُن کے خیالات بھی ایسے ہی لطیف اور نازک اُبلتے ہیں
کہ اُس کوثر کی دھوئی ہوئی زبان کو زیب دیں۔ عشق و محبّت کے خیالات مردانہ دلوں میں اُتنے لطیف نہیں
ہیں جتنے زنانہ دلوں میں ہیں۔ عورتیں گویا قدرت کی طرف سے خاص اُلفت و ہمدردی ہی کے لیے پیدا
کی گئی ہیں۔ اُن سے ایک زمانے تک بچّوں کا رکھ رکھاؤ متعلّق رہتا ہے۔ وہ کیا کیا تکلیفیں اُن کی پرورش
کی اُٹھاتی ہیں اور پیشانی پر بل نہیں آتا۔ جب تک بچّے بے شعور رہتے ہیں راتوں کو اُن کی نیند حرام رہتی ہے
ذراسی پلک لگی اور بچّہ رو دیا یا بے چین ہوا، آنکھ کھل گئی۔ بہلانے کو گھنٹوں گود میں ٹہلا رہی ہیں۔ تھپک
رہی ہیں۔ لوریاں دے رہی ہیں۔ دودھ پلانے کے زمانے میں بیسیوں قسم کے کھانے کے پرہیز کرنے پڑتے
ہیں۔ پرہیزی کھانا کس قدر بدمزہ ہوتا ہے لیکن اُن کو اُسی میں مزہ ملتا ہے۔ بچّہ آئے دن بیمار پڑا کرتا ہے دس دن
اچھّا ہے تو پندرہ دن بیمار۔ مرد اگر ہو تو غضب میں جان آجائے۔ ایک ہی دو دفعہ کی بیماری میں بھاگ کھڑا
ہو۔ لیکن یہ کبھی نہیں اُکتاتیں۔ اور دن رات نہایت خوش دلی سے اُس کی تیمارداری میں مصروف رہتی ہیں
غرض ہمدردی و اُلفت جیسی عورتوں میں ہے واقعی مردوں میں نہیں۔ اسی لیے اُن کی زبان عاشقانہ اور
ہمدردی آمیز خیالات ظاہر کرنے کے لیے ایک قدرتی ذریعہ ہے۔ لطیف جاذباتِ دلی۔ شوق۔ محبّت۔
اُلفت۔ ہمدردی۔ دل سوزی۔ رحم۔ شفقت۔ تاسّف۔ عورتوں ہی کی زبان میں کچھ خوب ادا ہوتے ہیں۔

جو مضمون وہ ایک فقرے میں ادا کردیں گی دفتر کا دفتر سیاہ کردینے سے بھی ادا نہ ہوگا۔
نظیر اس مضمون کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اُس کا تجربہ عورتوں کے باب میں بہت وسیع تھا۔ اُس نے فقط اپنے گھر ہی میں اُن کی زبان نہیں سُنی تھی بلکہ اُس کی لطافت سے محظوظ ہونے کے لیے وہ مختلف جمگھٹوں اور میلوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ بلدیوجی کا میلا ہے۔ گنواری عورتیں ایک جگہ جمع ہیں۔ اُن میں ایک کو کوئی دھکا مار کر شرارت سے نکل گیا۔ یہ گر کے یوں گالی دے رہی ہے:-

کیسو اٹھلا ب چلے ہے داڑھی جار

نظیر کی نوٹ بُک میں داخل۔
کاشی والے راجہ اور مائی تھان کی سرکار میں تعلق تھا۔ ان دونوں سرکاروں میں اکثر رنڈیاں اونچی اونچی آتی تھیں۔ بذلہ سنج۔ لطیفہ گو۔ شیریں کلام۔ اپنی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کی خاص سفارش سے اُن کی خدمت میں پہنچتا اور تقرب ہم کلامی حاصل کرتا۔
بجبتری محال کا بھی اُس کو کم تجربہ نہیں ہے۔ اکبرآباد میں رنڈیاں بکثرت آباد ہیں۔ شاید اس قدر رنڈیاں دوسرے شہر میں کم ہوں گی۔ اکثر دُور سے اُن کی خوش کلامیوں سے فائدہ اُٹھاتا اور بعض وقت وہ اپنے شاعرانہ مقاصد سے اُن کے کوٹھوں پہ جا کے گھڑیوں بیٹھا کتابِ ناز و نیاز اور دیوانِ حُسن و جمال کی ورق گردانی کرتا۔ شرعی قانون نے ہمارے ہاں عورتوں کی سوسائٹی کو مردوں کے استعمال کے لائق نہیں رکھا۔ معمولی آدمیوں کو شاید اس پُرلطف سوسائٹی کی ضرورت اور احتیاج چنداں محسوس نہ ہوتی ہو لیکن شاعر بعض وقت ایسی سوسائٹی کے نہ ہونے سے جی میں بہت کُڑھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اصلی خیالات ان کے دریافت کرے لیکن اُس کو عورتیں اس مطلب کے لیے کافی طور پہ نہیں ملتیں۔ ہارے درجے طوائف کی دُنیا کی

طرف جھکتا ہے۔ گو باعصمت دُنیا کے خیالات سے یہ دُنیا کسی قدر الگ ہے لیکن پھر بھی بہت سے خیالات ملتے جلتے اور اکثر مشترک ہیں، اِس سے اُس کی تلاش کی پیاس اور تفحّص کی بھوک کچھ تسکین پاتی ہے۔ نظیر نے بھی اِسی مقصد سے اِن لوگوں کے ہاں اپنی آمدورفت جاری کی تھی۔ حقیقۃً یہ اُن کی رغبت اور نفرت سے بہت اچھی طرح واقف ہوگیا تھا اور اُن کے خیالات پہ اُس کو کامل عبور تھا۔ اُن کی زبان کی معلومات بھی اُس کو اچھی خاصی تھی۔ ہمدردیِ عام جو اُس کی فطرت کا خاصہ تھا اُس کو اِن عورتوں کی صحبت میں بیٹھتے بیٹھتے اور بھی ترقّی ہوئی۔ شاید اسی ترقی دینے کا صلہ ہے کہ اُس نے اِس ناپاک طائفے کا بھی جہاں ذکر کیا ہے اپنی خاص ہمدردی سے محروم نہیں رکھا۔

عورتوں کی زبان کی معلومات اِن بندوں سے کسی قدر ظاہر ہوسکتی ہے جن میں ایک برہن[۱] کے عاشقانہ حسرت آلود خیالات کس خوبی کے ساتھ آگ بھڑکا رہے ہیں۔

بن دلبر اب کیوں کر بھولے میرے دل کی کلی کلی
گشت لگا کوتوال کا پھرنے، چوکی بیٹھی گلی گلی
قول بچن کر کر چھوٹا مجھ سے پھر جھوٹی خبر نہ لی
اُس بن جی گھبراتا ہے اور لگتی نہیں کچھ بات بھلی
شام گزر گئی، یار نہ آیا رات بھی آدھی آن ڈھلی

[۱] برہن بروگن برہ کی ماری فراق زدہ۔

حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں ایک عفیفہ نے یہ شعر تقاضائے فطرت پڑھے تھے جو نظیر کی نظم سے بہت مناسبت رکھتے ہیں:۔

تطاول ہذا اللیل - تسری کواکبہ
وارّقنی اَنْ لاضجیعاً - اُلاعبہ
فواللہ لولا تخشّیٰ - عواقبہ
تزعزع من ہذا السریر جوانبہ
مخافۃ ربّی والحیاء یصدنی
واکرم بعلی ان تنال مراتبہ

اُس چھوٹے کی راہ کو تکتے تکتے آنکھیں گئیں پتھرا
پھول پلنگ پر سیج کے میرے غم سے سوکھ گئے مرجھا
کاجل ڈھلکا، سرمہ بگڑا، منہ میں پان ہوا پھیکا
جی اُکتاوے، دل گھبراوے آہ، بھلا اب کیجے کیا

شام گزر گئی، یار نہ آیا، رات بھی آدھی آن ڈھلی

کیا دُکھ روؤں، رات کی میری مُفت گئی سب تیاری
کاجل مستی پھیکی پڑ گئی اور سنگھار ہوا بھاری
انگیا میں کچھ پھڑک پھڑک کر سست ہوئیں پیاری پاری
سینہ پھڑکے، کلیجہ دھڑکے جاؤں میں کیدھر بن یاری

شام گزر گئی، یار نہ آیا، رات بھی آدھی آن ڈھلی

نیند اُچٹ گئی، کروٹ جل گئی، کاٹے نہیں کٹتی ہے رات۔ کیا ہی بروگ کی آگ میں پڑا جل رہا ہے۔ برہ کی کوک ہے جو دل میں چھید کرتی ہے۔

عشق معشوق کے دل میں اثر کرتا ہے۔ اور اُس کے مُنہ سے بے اختیاری شوق میں یہ بول نکلواتا ہے

اب تجھ سے میں اک کوڑی بھی، پیارے، نہیں لونگی
یاں کھول تجھے اپنی میں چنپا کلی دوں گی
جاوے گا جہاں تو، میں تیرے ساتھ چلوں گی
خدمت سے تری ٹک نہ ٹلی ہوں نہ ٹلوں گی

نائیکا نوچی کو نصیحت کر رہی ہے۔

نوچی مُنہ پیٹ کر ہمسائی سے کہتی ہے۔

بھینا! * *
ناحق کی لڑائی ہے، نہ لینا ہے نہ دینا

اک چار گھڑی سے مجھے پٹواتی ہے بڑھیا

ہمسائی کے دل میں سنتے ہی کٹاری لگی اور نوچی کی طرف دار ہو کر گھر میں سے پُکاری۔

کیا بات ہوئی تجھ سے وہ کچھ مجھ کو بتا ری
جس بات پہ دوپہر سے ٹرّاتی ہے بڑھیا

نوچی

بھینا! یہ گزرتی نہیں ڈھڈھو[1]	اور قہرِ خدا سے بھی یہ ڈرتی نہیں ڈھڈھو
لب اپنے ذرا بند یہ کرتی نہیں ڈھڈھو	کیا سخت خرابی ہی، یہ مرتی نہیں ڈھڈھو
ایسا جو مرے پاس لگی جاے گی جھانپو[2]	اک روز مجھے گھر سے نکلوائے گی جھانپو
سب کھا چکی مجھ کو بھی یہ اب کھاے گی جھانپو	وہ کون سا دن ہوگا، جو مرجاے گی جھانپو

کیسے پورے پورے خیالات ہیں اور کیا ہی مناسب زبان۔ اسی کو کمال زباں دانی کہتے ہیں مختصر یہ ہی کہ نظیر نہ فقط مردانہ حصۂ زبان و خیالات سے واقف تھا، بلکہ اُس نے اپنی تحقیق کو عورتوں کی زبان سے بھی کافی مزہ اُٹھانے کا موقع دیا تھا، اور اُن کے خیالات کے کمروں میں اُس کو آزادانہ آمد و رفت کی اجازت تھی۔ زباں دانی میں اُس کے مقابل کے بہت سے شعرا انگلیس گے لیکن خیالات کا عمق جو اس کو حاصل تھا شاید بہت کم شعرا کو نصیب ہوا ہی۔ وہ جس مجمع میں کھڑا ہوتا تھا لوگوں کے خیالات ہی کی چھان میں مصروف رہتا تھا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اشخاص کی صورت دیکھ رہا ہی لیکن وہ صورت سے معنی کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ انسانی طبیعت کا طلسم بہت کم لوگوں پر کھلا ہی۔ لیکن جن معدودے چند پر کھلا ہی الحمد للہ کہ نظیر بھی اُنھیں میں ہی۔ اُس نے خوب خوب اس طلسم کی سیر کی ہی اور خوب خوب تماشے دیکھے ہیں اُن کا ایسا گہرا اثر اُس کے دماغ پر ہی کہ بے اختیار اُس کی زبان قلم سے اُن کا تذکرہ نکل ہی جاتا ہی۔ عجائبات

[1] ڈھڈھو ایک مشہور شور مچانے والی مٹیالے رنگ کی چڑیا کا نام جو اکثر باغوں میں اپنے گروہ کے ساتھ پھرتی اور ڈھونڈتی کھلاتی ہی بڑھیا عورت۔ زن فرتوت۔ بکواسی۔ بکی۔ جھکی۔

[2] جھانپو ایک چڑیا کا نام جو اکثر دُم اُٹھاتی اور ڈھکتی ہی جسے دھوبن بھی کہتے ہیں سچھنال۔ اچھال چھکا

جو وہ بیان کرتا ہے اُس کو پرانی لکیر کے پیٹنے والے رسمی شعرا گو حدیثِ خرافہ کی پھبتی کہیں لیکن واقعی وہ بڑے کام کی باتیں ہیں اور اِس لائق کہ آبِ زر سے لکھ لی جائیں۔

آتی ہے یہ آواز خود اپنے سر سے	شایاں ہے لکھ رکھیں گر آبِ زر سے
دنیا کے عجائبات مجھ میں ہیں بھرے	بہتر ہیں میں ہر ایک عجائب گھر سے

انشا اس خصوص میں نظیر سے کسی طرح لگا نہیں کھا سکتا۔ وہ ایک محض معمولی ٹھٹھول تھا۔ دن رات اس کی اوقات ہنسی دل لگی، کھیل تماشے میں گزرتی تھی۔ اُس نے کبھی کسی چیز کو متانت اور سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں۔ اگر وہ متانت سے کسی بات پر غور کرنا بھی چاہتا تو کر نہ سکتا۔ نواب دن رات اس کو اپنے مشاغل تفریح میں لگائے رہتا تھا۔ اس تفریح کی حد یہاں تک پہنچی تھی کہ قواعدِ زبان اور عروض منطق کے رسالے لکھے جاتے ہیں اور اُس میں بھی دل لگی بازی چلی جاتی ہے۔ تعقیدِ معنوی کی مثالیں عیان بیان ہوتی ہیں۔

(۱) کل گنا سبز دوپٹا اوڑھے بیٹھی تھی۔ مجھے کہنے لگی کہ میری طرف دیکھا تو اندھا ہو جاوے گا۔ میں نے کہا کہ میں کالا ناگ ہوں۔ مجھ سے ذرہ ہنس کر کہا کہ دوپٹے کا رنگ تو دیکھ۔ کس طرح اندھا نہ ہو جاوے گا۔

(۲) بنّو کی باتیں بھی ٹینے کی تلوار سے ہاتھی کے زینے پر کچھ کم نہیں۔

عروض میں شاید ارکان کو ظرافت نے یوں پشواز پہنائی ہے۔

بُری خانم = مفاعیلن۔ چنچل پری = مستفعلن۔ نور بائی = فاعلاتن۔ چت لگن = فاعلن۔ پیا زو =

۱۔ میا ایک قوم ہے نٹوں کی جو راجپوتوں کے ملک کے۔ جواہر سنگھ سورج مل جاٹ کے بیٹے کو کسی میتا نے ہاتھی پر چڑھتے وقت مار ڈالا تھا۔

فعولن - صاحب بخش - مفعولات -

نوچیوں اور لونڈیوں کی بھی ایک بھیڑ ہے جو زحاف کا بناؤ سنگار کیے بیٹھی ہیں -

قلندرو - ملاگیر - گجراتن - بی جان - پری - جان - جی - البیلی - نوربخش - انمول - جادی بیگی جان

سبحنی - سبحنی جان - مال دہی - دیدار بخش - گوری پیازو - مراد بخش - نورجہاں - بڑی پیازو - راج دلاری

شروع سے آخر تک جہاں نظر ڈالیے بس انھی کم بختوں کا ہجوم ہے - عروض کا رسالہ کیا ہے خاصی بختہ ری

محال کی ڈائرکٹری ہے -

منطق میں تحصیل حاصل کی مثالیں اس طرح ہیں :-

(۱) بابوجی، ہیں ہیں، مکھا، جسے ہم مکہ کا لڈو کہیں ہیں - اسے، مکھا، لوگ کی کہیں ہیں - نارائن جانے

ہوروں کے کھانڑ ماں بھی آوبے ہے کہ نا ہیں - بھلا، بابوجی، ہم لوگ تو سب مکہ کا لڈو کہیں ہیں - ملوم نہیں

کہ ہم لوگ یا سے اس کا نانو کچھ اور بھی کہیں ہیں کہ یوں ہی کہیں ہیں -

(۲) یہ جو ملّا صدر ہیر باقر کیر علم معقول ماں شاگرد رشید، آہ، کچھ بوجھی نا نہیں پڑت، کہ معقول کیری

کتب کیسے پڑتے ہیں -

منطق کی اصطلاح بھی مسخرے سے خالی نہیں -

گپت = نظری - پرگھٹ = بدیہی - انجھاسوت = تسلسل - ایرپھیر = دور - جوڑ = حرف رابطہ - جون کا توں

تصدیق = دھیان - تصور - بول = موضوع - بھرپور = محمول - پورا جوڑ = توجیہ - پوراتوڑ = سالبہ بولتی ہوئی = لفظی دلالت

پتا = معرّف - بت کہاؤ = حجت - چپ چپاتی - دلالت غیر لفظی - مراد کا گھر = معنی - بھچکل = مفرد - پھنسا ہوا = تقییدی

چھٹا ہوا = غیر تقییدی - اکہری اونچ نیچ = عموم و خصوص مطلق - دوہری اونچ نیچ = عموم و خصوص من وجہ -

دلالت کی مثال میں منطق میں بھی رنڈیوں نے ہجوم کیا ہے۔

(۱) گُنّا کے چہرے سے پایا جاتا ہے کہ شہرانن نے کچھ اُس پر غُصّہ کیا ہے۔

(۲) وزیرن کے آج میلے میں نہ آنے سے یہ پایا جاتا ہے کہ حضور کے ہر کاروں کا پاس بہت منظور رکھتی ہے۔

(۳) کلّو کا آج مجرے میں نہ جانا ہی کہتا ہے کہ شام کو حضور میں جایا چاہتی ہے۔

(۴) بنّو کی دھج یہی پکارے کہتی ہے کہ جناب عالی مجھے ایک مرتبہ دیکھیں تو اکثر یاد فرماویں۔

موجبۂ جزئیہ کی مثال سُنیے

بعضے کبوتر گُلی خال ہیں۔ دلیل۔ جو غٹ غوں غُٹ غوں کرتا ہے وہ کبوتر ہے۔ اور سب گُلی خال غٹ غوں غُٹ غوں کرتے ہیں۔ نتیجہ۔ بعضے کبوتر گُلی خال ہیں۔

سالبۂ کلیہ کی مثال ملاحظہ کیجیے۔

جو بگلا ہے وہ کبوتر نہیں۔ دلیل۔ جو غُٹ غوں غُٹ غوں کرتا ہے وہ کبوتر ہے۔ اور جو بگلا ہے وہ غُٹ غوں غُٹ غوں نہیں کرتا۔ نتیجہ۔ جو بگلا ہے وہ کبوتر نہیں۔

جس کو ظرافت نے اِس درجے اپنے بس میں کر لیا ہو وہ کب کسی دقیق مسئلے پر غور کر سکتا ہے، اور کب وہ انسانی طبیعتوں کے باریک پہلوؤں سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ اُس کے پاس منسانے کا سرمایہ بہت ہے لیکن دل میں جن باتوں سے سوز و گُداز کی کیفیت پیدا ہو اُن کی اُسے خبر بھی نہیں۔ وہ معلومات کے وہ تیز نشتر نہیں رکھتا کہ دل کو چھیڑ کر آنکھوں سے اشک کے فوارے جاری کر دے۔

انشا کے پاس اشخاص کے مختلف خیالات کی پوری پوری تصویریں نہ تھیں۔ وہ مختلف اشخاص کو

اُن کے خاص خیالی خصوصیات کے ساتھ دیکھنے کا موقع ہی نہ رکھتا تھا۔ بخلاف اِس کے میاں نظیر اِس خصوص میں یکتاے زمانہ تھے۔ میرے خیال میں اُردو کے شُعرا میں شاید ہی کسی کو انسانی طبیعت کا اِس قدر صحیح اور ٹھیک تجربہ ہو۔ اُس کی ہر نظم سے پایا جاتا ہے کہ اُس کی دن رات اسی کام کے لیے آنکھیں کُھلی رہتی تھیں۔ وہ دن رات انسان ہی کا تماشا دیکھا کرتا تھا۔ اور انسان ہی کے حالات کے دریافت کرنے کو مقصد اعظم جانتا تھا۔ میلے ٹھیلوں میں اگر وہ گیا ہے تو اسی کام کے لیے۔ رنڈیوں کی صحبت میں بیٹھا ہے تو اسی غرض سے۔ سیر و سیاحت کی ہے تو اسی مطلب سے۔

اُس کو مختلف اشخاص کی خُصوصیتِ خیالی کا اِس قدر گہرا علم ہے کہ جس کی تھاہ ہی نہیں ملتی۔ وہ ایسا اُن خیالات میں ڈوبا ہوا ہے کہ اُس کی ذاتی خصوصیتِ خیالی کا مُشکل سے پتا ملتا ہے۔ اُس کی طبیعت ایک ہموار بحر ہے جسمیں نہ مینڈھوں کی ٹکّر ہے نہ بھنور کا چکّر۔ کسی قوم کا جہاز ہو بہت آسانی سے گزر جاتا ہے اور کسی ملک کی کشتی ہو تیر کی طرح ساحلِ مقصد پر پہنچ جاتی ہے۔ کوئی کیسا ہی گُنہگار ہو اُس کی وجہ سے کشتی چکر میں نہیں آتی۔ اور کوئی کسی قسم کا ظالم و سیہ کار ہو اُس کے سبب سے طوفان اُٹھ کر عالم کو تیرہ و تار نہیں کرتا۔

شیکسپیر کے حالات میں گرین نے کسی مقام پر لکھا ہے کہ "باوجودے کہ مُتاخرین مُحققین نے بڑی کوشش و جاں فشانی کی لیکن پھر بھی ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کی بھی کوئی تفصیل اُن کو نہیں مل سکی جس سے اُس کے قبل موت گوشہ گزیں ہونے کے زمانے کے کچھ حالات روشن ہو سکتے۔ یہ جو ہم عصروں کے حافظے پر کوئی خاص مُمتاز خصوصیت کا نشان اس نے نہیں چھوڑا اُس کا باعث شاید یہ ہے کہ شیکسپیر کی طبیعت مُفرد اور یکتا واقع ہوئی تھی اور اُس کے خیالات میں غایت مرتبے کا اعتدال تھا۔ اُس کی ذہانت کی عظمتِ شان

اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اُس کی تصنیفات میں ہم اُس کی ذاتی خصوصیت مزاجی کا کوئی اثر نہیں پاتے
یہ جو لوگ قیاس کرتے ہیں کہ سانٹ میں اُس نے کچھ اپنے خیالاتِ خاص ظاہر کیے ہیں اُس کی حالت ایسی مشکوک
ہے کہ زبردستی کے قیاسات سے بھی اُس کی حالاتِ زندگی کے متعلق صرف چند موٹی موٹی باتیں معلوم ہوتی ہیں
اپنے ڈراموں میں وہ ہمہ تن اشخاص قصہ ہو گیا اور اُس کے اشخاص قصہ تمام قلم روِ انسانیت میں پھیلے ہوئے
ہیں۔ ایک شخص بھی ان ڈراموں میں ایسا نہیں کہ اُس کو یا اُس کے اقوال و افعال کو خود شاعر کی ذات
یا خیالات سے بجنسہٖ مستقیم نسبت دے سکیں“ یہ خصوصیت ہم نظیر میں بھی پاتے ہیں۔ اُس کی طباعی کے
انٹرنیشنل اگزبیشن میں سیکڑوں اشخاص بھرے ہیں۔ مختلف مذہب و ملت کے لوگ خوش خوش
پھر رہے ہیں۔ کوئی گپ کر رہا ہے۔ کوئی ہنس رہا ہے۔ کوئی اپنی تعلّی میں مصروف ہے۔ کوئی ڈوت دات
ہانک رہا ہے۔ لیکن موسیو ژدبیر کا کہیں پتا ہی نہیں۔ وہ صُلحِ کُل کے آفس میں بیٹھا ہوا چُپ چاپ لوگوں کو
ٹکٹ بانٹ رہا ہے۔

نظیر کے خیالات اور تجربوں کا ذخیرہ کسی طرح شیکسپیر سے کم نہ تھا۔ ظرافت اور شوخ طبعی بھی اُس میں
اُسی مرتبے میں تھی۔۔ ذہانت کا حصّہ بھی اُسی قدر ملا ہوا تھا۔ دل میں ہمدردی کا بھی ویسا ہی جوش تھا
ہر چند اُس نے ڈرامہ نہیں لکھا تو کیا ہوا۔ اُس کی اکثر نظمیں ڈرامے کا کام دیتی ہیں۔ جس نظم کو دیکھیے معلوم
ہوتا ہے ڈرامے کا کوئی خاص سین ہے۔ خیال کے اسٹیج پر کبھی میاں قلندر اپنا ریچھ کا بچا لے کر تشریف لاتے
ہیں۔ وہی سوا من کا سونٹا جس پر لوہے کی کڑی کھڑکتی ہوئی۔ وہی کاندھے پر جھولنا[1]۔ وہی ہاتھ میں پیالا۔
وہی ڈفلی[2]۔ وہی لڑکوں کا ہجوم۔ وہی کشتی کے داؤ پیچ۔ وہی کھڑا ناچ۔ کبھی طوفان کا سماں دکھلائی دیتا ہے

[1] جھولنا فقیروں کی وہ تھیلی جس میں روٹی ٹکڑا آٹا مانگ کر رکھتے ہیں۔ [2] ڈفلی ایک دائرے کی وضع کے باجے کا نام۔

چاروں طرف سے آندھی گھر آئی ہے۔ رستے میں کوئی معشوق مل گیا ہے۔ لگا کر گھر لیئے جا رہے ہیں۔ گھر پہنچ کر مزے کی خاطر مدارات ہوتی ہے۔ رقیبا کو خبر لگتی ہے۔ آ کر گھر کو گھیر لیتے ہیں۔ لیکن ہر شخص کا گھر اپنی جگہ میں قلعہ ہے۔ کب ان کی کوئی تدبیر چلتی ہے۔ طوفان کی زد میں بیٹھے بیٹھے صورت دیکھنے ہی کے قابل ہو گئی ہے۔

تلے کوٹھے کے بیٹھے اٹ گئے سب گرد کے مارے		بھری نتھنوں میں اُن کے خاک بس دس سیر آندھی ہیں

کبھی ہولی کی مجلس کا رنگ جمتا ہے۔ رنڈیوں کی بھیڑ ہے۔ بھوبیوں کے لڑکوں کا ہجوم ہے۔ ناچ ہو رہے ہیں ہولیاں گائی جا رہی ہیں۔ پچکاری آتی ہے۔ رنگ کا چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ گالیوں کی اس سے زیادہ بوچھاڑ ہے۔ پھر ہاتھا پائی ہاتھ پاؤں نکالتی ہے۔ اور ایک عجب پُر لطف بھاگ دوڑ مچتی ہے۔ پھر کبھی بنیواؤں کا رنگ نکلتا ہے۔ جوگیوں کا قافلہ آتا ہے۔ کسی موقع پر پالی کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ شوقین اپنی بُلبلیں لے کر پہنچے ہیں۔ کھلاڑیوں نے اپنا اپنا پٹھا چھوڑا ہے۔ گھمسان لڑائی ہو رہی ہے۔ کہیں کوئی صاحب بایں ہیئت کذائی کہ ڈاڑھی کے بال بڑھے ہوئے ہیں۔ منھ زرد ہے۔ آنکھوں میں آنسو سے بھر رہے ہیں۔ سر پر میلی پگڑی ہے۔ انگرکھے کے ٹکڑے اُڑے ہوئے ہیں۔ لڑکوں کے مجمع میں نمودار ہوئے ہیں۔ اور لڑکوں کے فریفتہ کرنے کو ایک خاص ادا سے گلہری کا بچہ نکالتے ہیں۔

	کمر کو دیکھ، ڈھونڈی جیب۔ پگڑی کو ٹٹول اُس جا وہیں ہم نے نکالا ڈھونڈھ کر بچہ گلہری کا	

اشخاص خاص خاص مزاج اور خیالات کے ساتھ جو اُس کے مُرقّع میں اپنی تصویریں دکھا رہے ہیں بہت ہیں۔ طوائف کی تصویر اس میں موجود ہے۔ نوچیاں اپنا جلوہ اس میں دکھا رہی ہیں۔ عاشق مزاج تعلّی باز بوڑھے یہیں نکھار رہے ہیں۔ "دیدہ بازی خدا راضی" کے پروفیسر یہیں بہروپ دکھا رہے ہیں۔

۱؎ [illegible]

بھنگڑ یہیں گاڑھی چھان رہے ہیں۔ نوجوانوں کی عیش و تفریح کی مجلسیں یہیں جمی ہوئی ہیں۔ بخیلوں کے سر پر یہیں ٹیپ جمائی جا رہی ہے۔ سنجیوں کو یہیں اونچی کرسی دی گئی ہے۔ چھپیس پیشے والے اسی بازار میں اپنی دکانوں پر بیٹھے ہیں۔ پہلوان اسی اکھاڑے میں ڈنڈ پیل رہے ہیں۔ کبوتر باز اسی باغ میں کبوتر اڑا رہے ہیں۔ تیراک اسی دریا میں تیر رہے ہیں۔ بھکاری اسی دروازے پہ بھیک مانگ رہے ہیں ٹھگوں[1] کی مشکیں یہیں کسی گئی ہیں۔ جوگیوں نے یہیں بھبوت رمائی ہے۔ صوفی اسی مجلس میں حال قال کر رہے ہیں جوگی۔ اتیت۔ جنگم۔ سیوڑا۔ نانک شاہی۔ کبیر پنتھی۔ بھرتھری۔ ہندو۔ مسلمان۔ فاسق۔ عابد۔ امیر فقیر۔ ہر مشرب اور ہر طریق اور ہر خیال اور ہر خصلت کے لوگ یہاں موجود ہیں۔

مختلف اشخاص کی تصویریں اُس نے جس عنوان سے کھینچی ہیں بہت ہی قابلِ مدحت، بلکہ بعض اوقات میں موجبِ رشک ہے۔ وہ اشخاص کے خط و خال کو پورا پورا قائم رکھتا ہے۔ اپنی طرف سے کوئی زائد رنگ بھر کر اُن کی تصویر کو بہت زیادہ دل فریب بنانے کی کوشش نہیں کرتا۔ نقص جتنے ہیں اُن کو بھی نہایت ایمانداری سے تصویر میں دکھاتا ہے۔ وہ بدنیتی سے اُن کے بدنما دکھانے کے لیے کوئی خراب تیور اُن میں اپنے جی سے پیدا نہیں کرتا۔ یہ مصوّرانہ ایمان داری ایک ڈرامہ نویس کے لیے گویا اعظم صفات ہے۔

نظیر میں ہم متانت اور ظرافت دونوں بتا چکے ہیں۔ یہ دونوں صفتیں ایک خاص اعتدال کے ساتھ اُس کے مزاج میں شریک ہوئی تھیں۔ نہ متانت ظرافت پر غالب آتی تھی اور نہ ظرافت متانت کو دباتی تھی۔ گویا دونوں کا پلّہ برابر تھا۔ وہ اگر کوئی کلام سنجیدگی سے کرتا تھا تو نہ اس وجہ سے کہ ظرافت پر وہ قادر نہیں بلکہ اِس جہت سے کہ وہاں ظرافت کا موقع نہ ہوتا تھا۔ اور اگر کسی کلام کو شوخیِ طبع کے رنگ میں رنگتا تھا تو

---

[1] ٹھگ ایک قوم جس کا پیشہ مسافروں کو زہر یا پھانسی دے کر مار ڈالنا اور طرح طرح سے چھلنا ہے۔

نہ اِس لحاظ سے کہ اُس کے ہاتھ سے متانت کی باگ جاتی رہی ہی بلکہ صرف اِس نظر سے کہ وہ موقع ہی ظرافت کا ہی۔ کسی موقع پر وہ ظرافت اور متانت دونوں کو شیر وشکر بھی کردیتا ہی اور یہ بھی اُس کا ایک فعل اختیاری ہی۔ دونوں وضع کلام پر اس قسم کا قابو بہت شاذ لوگوں کو نصیب ہوتا ہی۔ نظیر کو واقع میں ایک بہت بڑی دولت حاصل تھی۔ یہ وہ دولت ہی کہ اگر اُس کے زمانے میں شیکسپیر کی طرز انشاپردازی کو رواج ہوتا تو اِس کی بدولت ٹریجیڈی (غم کا ناٹک) اور کمیڈی (خوشی کا ناٹک) دونوں میں وہ پوری شہرت حاصل کرسکتا۔ اُس نے کسی قدر اپنی ڈرامہ نویسی کی قابلیت کا اُن دو قصّوں میں جلوہ دکھایا ہی جو اُس کے کلیات کے اوّل و آخر میں موجود ہیں۔ کلیّات کے آغاز ہی میں لیلی مجنوں کا قصہ ہی۔ اُس کا انجام ٹریجک (غمناک) ہی۔ بحر جس میں اُنھوں نے اُس قصے کو نظم کیا ہی ایک خاص اثر غم رکھتی ہی۔ یہ بحر اب اُن چند بحروں میں داخل ہی جن میں مرثیہ کہنے کا معمول ہوگیا ہی۔ حمد و نعت ہی سے دل پر ایک اداسی چھانے لگتی ہی درا خیر قصہ تک پہنچتے پہنچتے ایک خاص رقت قلب میں پیدا ہوتی ہی جس کو انسان کسی طرح روک نہیں سکتا۔ بیان میں لکھنؤ کے مرثیہ گو اساتذہ کی طرح رُلانے کا کوئی اہتمام نہیں پایا جاتا۔ سیدھی سیدھی بندشیں ہیں۔ اور معمولی باتیں۔ لیکن نہیں معلوم کس دل سے لکھا ہی کہ آدمی جوں جوں پڑھتا جاتا ہی اثر غم بڑھتا جاتا ہی۔ انھی سیدھی سادی بندشوں میں نہیں معلوم کہاں کے گُپتی نشتر چھپے ہوے ہیں کہ آدمی کا دل بے قرار ہو جاتا ہی۔ لیلی مجنوں تو ٹریجیڈی کی مثال ہوئی۔ اب کمیڈی کی مثال مُلاحظہ فرمائیے گو کم لو دیکھتے ہیں مگر واقع میں دیکھنے ہی کی چیز ہی۔ مہادیو کا بیاہ کس خوبی سے لکھا ہی کہ سُبحان اللہ۔ کلیّات میں کنھیاجی کی راس سب سے اخیر میں درج ہی۔ اس سے پہلے جو نظم ہی وہی مہادیو کا بیاہ ہی۔ تکلّف اس نظم میں یہ ہی کہ چوں کہ مہادیو کے بیاہ کا مذکور ہی اور وہ ہندوؤں کا ایک دیوتا ہی پوری نظم ہندوؤں کی زبان میں

لکھی ہے۔ شروع سے آخر تک زبان کی لطافتوں اور باریکیوں کو اس خوبی سے قائم رکھا ہے کہ آدمی کے منھ سے خواہ مخواہ واہ واہ نکل جاتی ہے۔ اس میں مختلف کیرکٹر (اشخاص) ہیں۔ ہماچل۔ ہماچل کی رانی۔ ہماچل کی بیٹی قصّے کی ہیروین (مطلوبہ) ہماچل کا پردھان یعنی وزیر۔ ہماچل کا پروہت۔ مہادیو قصّے کا ہیرو (طالب) ان تمام اشخاص کے خیالات اُنہی کے خاص محاوروں میں نہایت عمدگی سے ظاہر کیے ہیں اور واقعی اس نظم میں کسی قدر ڈرامہ کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ کمیڈی کی قوّت بڑھانے کو بعض خاص سین تفریح کے بھی دیے ہیں مثلاً: براتیوں کا بیان :-

برات

پھر اور ہزاروں ساتھ چلے جو بھوت پری اور راکھس تھے
ڈیل اونچے اُن کے برج سمان اور سیس بھی اُن کے کلس تھے

ہر ایک گز اُن کا سو من کا اور موٹے رسّوں کے پٹکے
اور پگڑوں پر پٹڑوں کی طرح تھے ساکھو بر کے برسکھے

کوئی ننگے سر وہ بال اُس کے جوں بانس بڑے دس دس گز کے
کوئی منڈ، کوئی رنڈ، اور کوئی بن پاؤں ناچے اچھلے کودے

کوئی ہاتھی رکھے کاندھے پر، کوئی اونٹ بغل میں دبکائے
کوئی ارنا بھینسا گود لیے، کوئی گینڈا سر پر بٹھلائے

کوئی سانپ گلے میں لپٹائے، پھن اُن کے دم پر دم چمکے
کچھ لمبے سونٹے لوہے کے، کچھ ہاتھ لیے بھاری لکڑے

کوئی گاوے پھاڑ گلا اپنا، کوئی نرت کرے چک پھیری لے
کوئی شور کرے خوش حالی سے یوں جیسے ہاتھی چنگھاڑے

کوئی ہاتھ نچاوے رہ رہ کر، کوئی نین خوشی سے مٹکادے
کوئی لمبے لمبے ڈگ رکھے، کوئی دس دس گز کی جست کرے

کچھ رنگ عجب، کچھ ڈھنگ نئے، سب ہنس ہنس دھج دکھلاتے تھے
تھے دھوم مچاتے رستے میں، ہر آن اچھلتے جاتے تھے

اس نظم کی بحر بھی ایسی دھوم دھام کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ہر شعر میں بڑا شادیانہ بج رہا ہے۔ نظیر نے اپنی قدرتِ تصویر کشی کو بھی اس میں ختم کر دیا ہے۔ ہر سین کو اس خوبی سے نقش کیا ہے کہ اصل سین سے مستغنی کر دیا ہے

جہاں باجوں کا ذکر چھیڑا ہی معلوم ہوتا ہی واقعی باجے بج رہے ہیں۔ جس جگہ آتش بازی میں آتش بیانی دکھائی ہی صاف نظر آتا ہی کہ انار چھوٹ رہے ہیں۔ ہاتھی گھوڑے بھڑک رہے ہیں۔ غرض جس سین کو لکھا ہی تصویر کھینچ دی ہی۔ اتنی قوّت کے ساتھ اُس نے بہت کم نظمیں لکھی ہیں۔ اِس سے اُس کی طبیعت کا اصلی زور ظاہر ہوتا ہی۔

یہ دو نمونے پُوری طرح ثابت کرتے ہیں کہ اگر وہ ناٹک کے طور پر لکھتا تو یقیناً حُزن اور عیش دونوں کی پُوری پوری داد دیتا۔ پس پُورے شیکسپیر ہونے کی صلاحیت اگر کسی میں تھی تو وہ میاں نظیر علیہ الرحمۃ تھی

زبان اُردو کے ڈاکٹر جانسن مُنشی سید احمد دہلوی بھی نظیر کو شیکسپیر کا مُعزز خطاب دینے میں میرے ہم زبان ہیں۔ اُن سے میں نے کسی موقع پر نظیر کی نسبت خیالات دریافت کیے تھے تو اُنھوں نے یہ مختصر مُفید مطلب عبارت لکھ بھیجی تھی:-

بعض دہلی کے تذکرۂ شعرا جمع کرنے والوں نے صرف اِتنا لکھا ہی کہ وہ ایک مُلّا مکتبی صحتِ الفاظ سے مُعرّا۔ پُرگو۔ اور عوام النّاس کی بلکہ جُہلا کی زبان لکھنے والا تھا۔ لیکن میری راے میں وہ ہندوستان کا شیکسپیر اور فطرتی و قُدرتی مضامین کے بیان کرنے میں یدِ طولیٰ رکھنے والا تھا۔ اُس نے ادنیٰ ادنیٰ اور رکیک مضمونوں کو اِس خوبی سے باندھا اور عُمدہ نتیجہ نکالا ہی کہ دوسرا نہیں نکال سکتا۔

مضامین کے اعتبار سے نظیر کے کلام کی قسمیں

میں نے مضامین کے اعتبار سے نظیر کے کلام کو غور سے دیکھا تو اُس کی چودہ قسمیں نظر آئیں۔ اور وہ اُمورِ ذیل سے متعلق ہیں:-

(۱) تقریبات۔ (۲) موسم اور فصل۔ (۳) مختلف مراتبِ زندگی۔ (۴) لوازماتِ تمدنی (۵) ایام لیالی اور نور و ظہورِ قدرت۔ (۶) مشاغلِ تفریح۔ (۷) عمارات۔ (۸) اشیائے قدرتی۔ (۹) نادر امثال اور مفید حکایات۔ (۱۰) مذہب اور تصوف۔ (۱۱) حسن و عشق۔ (۱۲) اخلاق اور انقلاب و فنائے جہاں سے جو اثر عبرت کا دل پر مترتب ہوتا ہے۔ (۱۳) بعض قصص۔ (۱۴) ہزل و ظرافت۔

اگر اُس کے کلام کو دوسری نظر سے دیکھیں اور کسی صفت سے متصف کریں تو یہ قسمیں پیدا ہوتی ہیں:-

حکیمانہ۔ ناصحانہ۔ عارفانہ۔ عبرت مندانہ۔ صوفیانہ۔ عاشقانہ۔ عقیدت مندانہ۔ رندانہ ظریفانہ وصّافانہ۔ ہزالانہ۔ سُوحّدانہ۔ شیعیانہ۔ واعظانہ۔ آزمودہ کارانہ۔ جوانانہ۔ خوش طبعانہ۔ قلندرانہ۔ مُصّورانہ۔ مترجمانہ۔ مَعاملہ بندانہ۔ ہندوانہ۔ سپاس مندانہ۔

(۱) عارفانہ۔ عبرت مندانہ۔ صوفیانہ۔ عقیدت مندانہ۔ موحّدانہ۔ واعظانہ۔ سپاس مندانہ۔ شیعیانہ
ان آٹھ قسموں کو ایک دوسرے سے علاقہ ہے۔ یہ سب ایک ہی دل سے لکھے گئے ہیں۔ وہ دل جس کا رُخ عقبیٰ کی طرف مُڑا ہوتا ہے۔

(۲) آزمودہ کارانہ۔ ناصحانہ۔ حکیمانہ۔ یہ تینوں قسمیں بھی گویا ایک ہی دل سے لکھی گئی ہیں۔ ان میں عقبیٰ کے خیالات کو بخطِ مستقیم دخل نہیں دیا گیا۔ معاملاتِ دنیا کو جس طرح ایک حکیمانہ خیال آدمی دیکھ کر اُن سے گہرے تجربے حاصل کرسکتا ہی اور نشیب و فراز زمانہ دیکھنے کے بعد آزمودہ کاری کے زینے سے جس طرح لوگوں کو خیر خواہانہ نصیحت کرسکتا ہی اُسی قسم کے مضامین کو اِس قسم میں داخل کیا گیا ہی۔

(۳) رندانہ۔ قلندرانہ۔ خوش طبعانہ۔ ظریفانہ۔ ہزالانہ۔ یہ پانچ قسمیں ہمرنگ ہیں۔ یہ سب کچھ ایک ہی قسم کے خیالات سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب اُن کو کوئی مذہبی رنگ میں نہیں رنگا گیا تو رندانہ ہیں۔ رندانہ کلام پر مذہبی رنگ چڑھا دیا گیا قلندرانہ ہوگیا۔ عاشق نے وصل کی کامیابی میں خوش خوش اپنے خیالاتِ عشرت کسی قدر معمولی متانت کے احاطے سے نکل کر بیان کیے وہ خوش طبعانہ ہوگئے۔ خوش طبعی کچھ زیادہ بڑھی پوری ظرافت ہوگئی۔ ظرافت نے اور ہاتھ پاؤں نکالے ہزل ہوگئی۔

(۴) وصافانہ۔ معاملہ بندانہ۔ مصورانہ۔ یہ تینوں قسمیں بھی آپس میں دست بغل ہیں۔ کسی شی کی صفت عمدہ طور سے بیان کی گئی تو یہ وصافانہ ہوا۔ کسی واقعے کو عمدہ طور سے قلم بند کیا گیا تو یہ معاملہ بندانہ ہوا۔ اور کسی سمیں کو اس طرح بیان کیا گیا کہ وہ سماں آنکھوں کے تلے پھر جائے تو یہ مصورانہ ہی۔ وصافی اور معاملہ بندی کا مصوری گویا کمال ہی۔

(۵) عاشقانہ۔ جوانانہ۔ جوانانہ کلام عشق میں محدود نہیں۔ تعلّی اور دوت دات بھی اُس کا حصہ ہی۔ لیکن عاشقانہ کلام منحصر فی العشق ہی۔ ازبس کہ عشق نتیجۂ جوانی ہی جوانانہ اور عاشقانہ دونوں کلام میں ایک خاص تعلق ہی۔

(۶) مترجمانہ وہ کلام ہی جس میں فقط کسی مشہور قصّے کو معمولی طور پر نظم کر دیا گیا ہو۔ ہرن اور گدھی کی

دوستی کا قصہ اِس قسم میں داخل ہے۔

(۷) ہندوانہ وہ مضامین ہیں جن میں ہندوؤں کے عقائد۔ ہندوؤں کی تقریبات۔ ہندوؤں کے قصص۔ ہندوؤں کے مختلف پیشواؤں کا ذکر اس دل سے کیا گیا ہے جو ایک ہندو کے لیے شایاں ہے اور کسی قسم کا تعصب کہیں دکھایا نہیں گیا۔

اِس طور پر سات قسمیں نظیرؔ کے کلام کی پیدا ہوتی ہیں۔ متنرجانہ کلام بہت کم ہے۔ دو تین نظموں سے زیادہ نہیں۔ لہٰذا اِس کو ساقط کرنا چاہیے۔ پس اصل میں اُس کے کلام کی مستقل اور قابلِ اعتبار چھ ہی قسمیں ہیں۔

نظیر کے کلام نظم کی قسمیں

اس میں شک نہیں کہ نظیر ایک بڑا ہی متفنّن شاعر تھا جس صنفِ کلام کا ذکر کیجیے اُس کے ہاں موجود۔ غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ رُباعی۔ مخمّس۔ مسدّس۔ مثمن۔ معشّر۔ قطعہ بند۔ ترکیب بند۔ ترجیع بند۔ واسوخت۔ بحرِ طویل۔ تضمین۔ اِن میں سے کون سا فن ہی جس میں وہ بند ہی۔

حکیم باطن اپنے تذکرہ میں یوں لکھتے ہیں۔

ہرگاہ عنصرِ لطیف سمتِ ترقیمِ نظم متوجّہ ہوا اور صیادِ فکر نے دامِ طبع بچھایا مُرغانِ مضمونِ لامکاں پرواز اُڑنے سے باز آکر بخوشی صید ہوے (ایک ہلکا سا اشارہ نظیر کے ہنس نامے کی طرف ہی) تو غزل۔ مستزاد مثلّث مربّع مخمّس۔ مسدّس مسبّع مثمّن۔ معشّر رُباعی قطعہ بند۔ ترکیب بند۔ ترجیع بند تضمین۔ واسوخت۔ بحرِ طویل وغیرہ ہر ایک کو متعدد تحریر فرمایا۔ یہ کچھ برائے گفتن و نوشتن نہیں۔ بلکہ فی الواقع بلا تصنّع۔ اور اُس میں کُل صنعتیں شاعری کی ختم کیں۔

غزل۔ نظیر کی غزلوں سے کون واقف نہیں۔ غزلیات کا دیوان ہی موجود ہی۔ اکثر غزلیں گائی بھی جاتی ہیں۔ باطن نے اپنے تذکرے میں غزلوں سے جو اشعار انتخاب کیے ہیں تو اُن میں اس بات کا خاص التزام کیا ہی کہ اکثر ردیف کے اشعار ہوں تاکہ یہ معلوم ہو کہ دیوان اُس کا ردیف وار مرتب ہی۔ وہ ردیفیں جن کے اشعار نہیں ہیں یہ ہیں۔

ردیف ٹ۔ ردیف ث۔ ردیف ڑ۔ ردیف غ۔ ردیف ف۔ ردیف ق۔ ردیف ک۔

ردیف گ - اور علاوہ اِن کے ہائے مخلوط کے ساتھ جو ردیفیں ہیں جن میں غالباً کم شعرا طبع آزمائی کرتے ہیں۔

اِن متروک ردیفوں میں سے ردیف ڑ کی غزل کُلیات مروجہ میں موجود ہے۔ پس ترک دلیل اس بات کی نہیں ہوسکتی کہ اِن ردیفوں میں اُس کی غزلیں ہی نہ ہوں۔

قصیدہ۔ قصیدے کا ذکر حکیم باطن نہیں کرتے۔ شاید بالاستقلال کوئی بڑا مجموعہ اِن کے ہاں قصائد کا نہ ہو۔ لیکن خود باطن نے اپنے تذکرے میں جس قدر کلام نظیر کا دیا ہے اُس میں سے بعض صاف قصیدہ ہے وہی شوکت الفاظ۔ وہی تسلسل۔ شاید قلّتِ اشعار سے اُن کو داخل غزل کیا ہے۔ لیکن یہ قلّت اشعار کی بس ایک قصیدے میں ہے۔ دوسرے قصیدے میں وہ بھی نہیں۔ تو وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ یہ قصائد دیوان غزلیات سے لیے ہیں اسی لیے اُن پر اطلاق قصیدے کا نہیں کیا۔ میں اِن قصائد کو اپنے موقع پر بصیرت ناظرین کے لیے نقل کردوں گا۔

مثنوی۔ مثنوی کا بھی باطن کوئی ذکر نہیں کرتے۔ لیکن آخر وغیرہ کس دن کے لیے ہے۔ میں نے پہلے پہل تذکرہ باطن ہی میں اُس کی مثنوی دیکھی۔ اس میں نہایت عمدہ تمہید سے کشتی۔ دریا۔ شیرینی آب۔ خنکی آب موج۔ حباب۔ گرداب۔ ماہی۔ صدف۔ ریگ اور ساحل کی تعریف کی گئی ہے۔ اس مثنوی کو بھی اپنے موقع پر میں پیش کش کردونگا۔

رُباعی۔ رُباعی اُردو کی کوئی میری نظر سے نہیں گزری۔ کلّیات میں کوئی رُباعی نہیں ہے۔ باطن نے بھی گو فہرست میں ذکر کیا ہے لیکن کوئی مثال پیش نہیں کی۔ اُردو میں جب نہیں ہے تو فارسی ذخیرے میں ڈھونڈھنا چاہیے۔ اُس میں چند رُباعیاں نہایت دلچسپ موجود ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رُباعی سے

یہی اُس کی طبیعت کو خاص مُناسبت تھی۔ اکثر مضمون آفرینی کی راہ میں مجدّدانہ قدم مارے ہیں۔
مُربّع کی مثالیں مجھ کو نہ فارسی میں ملیں نہ اردو میں۔ شاید باطن نے کہیں دیکھی ہوں۔ کلمات کی فہرست میں اُس نظم کو مربّع لکھا ہی جس کی ترجیع کا بند یہ ہی ؎

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان		عاشق ہی تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

میرے خیال میں یہ ترجیع بند معشّر ہی۔ مخمس اور مسدّس کو نظیر کے نام کے ساتھ وہ نسبت ہی جو رباعی کو عُمر خیام کے ساتھ۔ غزل کو سعدی کے ساتھ۔ قصیدے کو خاقانی کے ساتھ۔ مثنوی کو فردوسی کے ساتھ۔ قطعہ کو ابن یمین کے ساتھ۔ مخمّس جتنے کُلیات میں ہیں وہ نول کشوری میں تو (۹۸) ہیں اور مطبع احمدی والے میں پورے (۱۰۰) جوگی نامہ۔ جوگن نامہ۔ جنگ نامۂ خیبر۔ وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ مُسدّس نول کشوری کُلیّات میں کوئی (۶۷) ہیں اور مطبعِ احمدی والے میں کوئی (۴۲)۔
مسبّع بھی میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ باطن لکھتے ہیں تو شاید کوئی ہوگا۔ مثمّن (۳) سے زیادہ نہیں دو ترجیع بند ہیں اور ایک ترکیب بند (۱) چاندنی۔ صحنِ چمن میں واہ دا روز کھلی تھی چاندنی۔ ترجیع بند (۲) برسات۔ رات لگی تھی واہ دا کیا ہی بہار کی جھڑی۔ ترجیع بند (۳) واسوخت۔ ای گُل تازہ کہ بوے زر وفا نیست ترا۔ ترکیب بند معشّر بھی گنتی ہی کے ہیں۔ (۱) ایک تو لیلی مجنوں۔ اِس کو ترکیب بند میں بھی شمار کرسکتے ہیں۔ (۲) دوسرے عالم بہار۔ شب کو چمن میں وہ وا کیا ہی بہار تھی مچی۔ یہ ترجیع بند ہی (۳) تیسرے تضمینِ فارسی۔ نظر آیا مجھے اک شوخ ایسا نازنین چنچل۔ اِس میں اُستادوں کے دوہرے اور اشعار تضمین کیے ہیں اس لیے یہ خاص تضمین کی مثال میں پیش کرنے کے قابل ہی (۴) چوتھے وہ ترکیب بند۔ مجھے ای دوست تیرا ہجر اب ایسا ستاتا ہی۔ اس ترکیب بند میں بھی دوہرے ہیں۔ (۵) پانچوں

ہر کی تعریف۔ میں کیا وصف کہوں یارو اُس شام برن اوتارے کی۔ (۶) چھٹے بلدیو جی کا میلا۔ کیا وہ دل بر کوئی نویلا ہی۔ یہ ترجیع بند ہی۔

دو ترکیب بند معشّر سے زیادہ ہیں۔ ایک میں تو ہر بند میں بارہ مصرعے ہیں۔ اثنا عشری کہہ لیجئے اور دوسرے میں سولہ مصرعے یہ شش عشری۔ جس میں بارہ مصرعے ہیں وہ یوں شروع ہوتا ہی۔ ادھر کو جس گھڑی اے ہم نشیں وہ یار آیا۔ جس میں سولہ مصرعے ہیں اُس کو عرف میں مہادیو کا بیاہ کہتے ہیں۔

واسوخت دو ہیں لیکن ایک تو وحشی کا ہی جو نہیں معلوم کیوں درج دیوان ہوگیا ہی۔ اور دوسرا خاص میاں نظیر کا۔ یہ واسوخت آٹھ مصرعوں کا ہی مثمن۔ سودا کے ہاں بھی آٹھ ہی مصرعوں کا واسوخت ہی۔ یہ واسوخت فارسی میں ہی۔ اردو کا واسوخت کوئی میری نظر سے نہیں گزرا۔ وحشی کا واسوخت شائد اس لیے لکھ دیا گیا ہی کہ بالمقابلہ دونوں کا لطف پوری طرح حاصل ہو کہ کون واسوخت کس پائے کا ہی۔ نظیر نے وحشی ہی کے واسوخت کا جواب لکھا ہی۔ دونوں تلے اوپر کلیات میں مندرج ہیں۔ مستزاد مثلث بھی صرف ایک ہی ہی شعر تو اس میں یہ کہے ہیں۔

سُدھ لے گئی بالے کی جھمک صبر کرن پھول۔ اور عقل کو بُندے
بالے کی گئی جھوک لگا سینے میں اک ہول۔ دل لے گئے جھمکے
اور جی کے تئیں لے گئی زنجیرۂ طلائی۔ زنجیر نچا کر
کاجل کی کھنچاوٹ نے کیا دل پہ یہ طوفاں۔ جو ہوش اُڑایا
مسّی کی دھڑی نے وہ کیا ظلم نمایاں۔ جو غش پہ غش آیا
ہاتھوں نے بھی اک آگ سی سینے میں لگائی۔ مہندی کو دکھا کر

ایجاد کی طرف نظیر کو اکثر جدت پسندی لے جاتی تھی اور اُس کی ایجادیں ایسی ہوتی تھیں کہ مقبولیت کے محکمے میں فوراً اُن کی رجسٹری بھی ہو جاتی تھی۔

مُستزاد میں پہلی ایجاد تو اُس نے یہ کی کہ دو مصرعے کی جگہ تین مصرعے کیے۔ یعنی شعر سے گزر کر مثلث اس فن میں تصنیف کیے۔ دوسری ایجاد یہ کی کہ فقرۂ مُستزاد ایک سے دو کر دیئے مثلث کی مثال تو لکھی جا چکی ہے۔ مستزاد مکرر کی مثال مُلاحظہ ہو۔

یوں ہجر میں روتا ہوں میں اُس گل کے شب و روز۔ کرنالہ و فریاد جیسے کہ کسی وقت
یُوسف کے لیے روئیں تھیں یعقوب کی آنکھیں۔ ہر شام و سحر کو۔ خوناب میں بھر بھر
خط میں نے جو بھیجا اُسے با حسرتِ دیدار۔ لکھ خونِ جگر سے۔ اور داغ کی کر مُہر
تکتی رہیں جا کر مرے مکتوب کی آنکھیں۔ اُس رشکِ قمر کو۔ حسرت سے سراسر

شاعر کے کلام کی مقبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اُس کے بعد یا خود اُس کے زمانے میں اُس کی نکالی ہوئی طرح یا طرز کو اساتذۂ وقت اپنی طبع آزمائی کا شرف بخشیں۔ نظیر کی اس ایجاد کی ہوئی طرز پر بعد اس کے انشاء اللہ خاں جیسے ذہین نے بھی طبع آزمائی کی۔ اور اُس نے دو سے ترقی کر کے پانچ پانچ مُستزاد فقرے لکھے۔ دوہرے فقرے کے مستزاد کا نام مستزاد در مستزاد رکھا ہے اور پانچ فقروں کے مستزاد کا نام مستزادِ خماسی۔

مستزاد در مستزاد۔

نسبت وہ جو آرام سے ہے ہاتھ کو سو کیا۔ کچھ سوچ کے بتلا۔ ہے اس میں کلائی
نوبت کو ترے نام سے ہے میل یہ کیسا مت کر تو اچنبھا۔ کہہ دے اری باجی

تالاب میں تیرا کرے دن رات جو چڑیا۔ کیا ہے وہ بھلاجی۔ بوجھو تو بھلی
ہر شخص اُسے دیکھ کے موڑ دے سراپنا۔ یہ چال انوکھی۔ ہے قبلہ نما کی

مستزاد مخماسی۔

میں چاند کے کل رات جو دیوار پہ جاتی۔ کنڈی نہ ہلاتی۔ جا کر نہ جگاتی۔ نیند اس کو نہ آتی
جوبن کی وہ ماتی۔ تیوری نہ ہلاتی

اور چٹکیوں میں میرے تئیں صبح اڑاتی۔ ہاتھوں پہ نچاتی۔ گاتی نہ بجاتی۔ کھانے کو نہ کھاتی
پھر تو نہ بلاتی۔ سوسو ہلے گاتی

بحر ذیل میں بھی اس نے خاصی طرح طبیعت آزمائی کی ہے۔ بحر طویل کا ایک اُردو شعر باطن نے لکھا ہے۔ در شعر مجھ کو فارسی کے بھی مل گئے ہیں۔ اپنے موقع پر نقل ہوں گے۔

قطعہ بند۔ قطعہ بند غزلوں میں داخل ہیں۔ سودا اور میر کے زمانے میں یہ ایک خاص فن قرار پا گیا تھا۔ غزل کی یکسانی سے اکثر طبیعتیں مشاعروں میں ملول ہو جاتی تھیں۔ اس ملالت کے رفع کرنے کے لیے یہ ایک اچھا نسخہ تھا کہ اخیر میں کسی خاص مضمون کو مسلسل طور پر بیان کیا جاتا تھا جس کی خیر اخیر شعر میں بڑے زور اور لطف کے ساتھ کھلتی تھی اور زحمتِ انتظار کا شوق کو پورا پورا صلہ مل جاتا تھا اِس طرز کو اس قدر مقبولیت ہوئی کہ مشاعرے کی غزلوں میں اکثر قطعہ بند سے لوگ مشاعرہ مار لینے کی کوشش کرتے۔ نظیر گو اُن لوگوں میں نہ تھا کہ مشاعرے میں جا کر زور آزمائی کر کے حریف کو داؤ پیچ سے چت کرنے کی کوشش کرے لیکن پھر بھی قطعہ بند کی لطافت سے وہ بے خبر نہ تھا۔ اُس کو غزل کی شاخ میں یہ ایک اچھا پھول معلوم ہوا۔ جب کبھی موقع ملتا وہ اپنے مشامِ فکر کو اُس کی خوش بو سے معطر کر لیا

مضامین چوں کہ اِس کے دل میں بہت اُبلتے تھے قطعہ لکھنا اس کے لیے ایک طبیعی بات تھی۔ اکثر غزل میں اِسکے خیالات اِس تسلسل سے آنے لگتے ہیں کہ وہ غزل۔ غزل باقی ہی نہیں رہتی۔ خود بخود قطعہ کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ ایک طرح کی تجدید تھی جس کو اُس کی اُستادانہ کوششوں سے مقبولیت خاص کا شرف حاصل ہوا۔ اِنشا نے اِس باب میں نظیر ہی کی تقلید کی ہے۔

اور جو عشق کا گلزار کھِلاتا ہے نظیر ۔۔۔ پنج تن پاک کا دُنیا میں کہاتا ہے نظیر
ریختہ۔ فرد۔ رُباعی بھی بناتا ہے نظیر ۔۔۔ کہ سخن عشق کا پھر سب کو سُناتا ہے نظیر

اُس کے سب حرف و حکایت سے کھو عشق اللہ

نظیر کی تصانیف

نظیر کا دماغ بہت قوی تھا۔ اُس کی نظر نہایت تیز تھی۔ اُس کے خیالات میں بڑی وسعت تھی اُس کے تجربے اِس قدر گہرے ہیں کہ اُن کی تھاہ نہیں ملتی۔ مشق سخن اس قدر بڑھی ہوئی ہی کہ دیکھتے ہیں وہ قلم ہاتھ میں اُٹھاتا ہی۔ زمین طرح کرتا ہی۔ اور پھر لکھ چلتا ہی۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ تصنیف کرتا ہی۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی کاغذ سے دیکھ دیکھ کر نقل کر رہا ہی۔ یا اشعار یاد ہیں اُن کو قلم بند کرتا جاتا ہی۔ زمانے نے بھی اُس کو کسی قدر فراغت دے رکھی تھی۔ اُس پہ عمر بھی ملی خاصی۔ اسی اور نو نواسی۔ اتنے سروسامان کے بعد یہ سمجھنا کہ اُس نے صرف وہی ایک کلیات لکھا ہوگا جو متداول ہی جس میں تخمیناً چھ سات ہزار شعر ہیں جس کا حجم بارہ جزو سے زیادہ نہیں، نہایت ہی غلطی ہی۔ نظیر شاعر نہ تھا واقعی ایک کل تھا جس میں دن رات شعر ڈھلا کرتے تھے۔ وہ بات بات پر ایک دلچسپ نظم لکھ دیتا تھا۔ کہیں سے لڑکے آئے۔ ہاتھ میں پیالیے ہوے ہیں۔ اُن کے خیال میں ایک مضمون پھڑکا۔ باتوں ہی باتوں میں دس پندرہ بند ہوگئے۔ لڑکے یاد کرکے تمام شہر میں پڑھتے پھرتے ہیں۔ گرمیوں کی فصل ہی۔ نئی نئی تپلی تپلی ککڑیاں نکلی ہیں۔ صورت سے لذت سے، تازگی سے، طراوت سے آنکھوں کو، دلوں کو خنکی اور ٹھنڈک بخشتی ہیں۔ نظر پڑنا شرط ہی، پھر کیا کیا مصرعوں کی قاشیں ترشتی ہیں، اور کس کس طرح شوق کی تشنگی کو بجھاتی ہیں۔ تربوز۔ جالیاں بھی اُس کے خیالی چاقو سے بچ نہیں سکتیں۔ کورے برتن میں پانی کی بوند کھنکی اور اِس کے خیال میں مضموں کا ایک دریا اُمڈ آیا۔

تازگی جی کی اور تری تن کی	واہ کیا بات کورے برتن کی

مکھیاں بھنبھنائیں اور اُس کے قلم نے کاغذ کی زمین دیکھی[۱] - برسات آئی - سبزہ لہلہانے لگا - مور جھنکارنے لگے - بگلوں کی قطاریں ابر میں اُڑتی دکھائی دیں - مینڈکوں نے شور مچایا - گھٹا اُمڈ رہی ہے - پھوہاریں پڑ رہی ہیں - جھولے پڑے ہوئے ہیں - پینگیں بڑھ رہی ہیں - ہمارا شیر بھی کسی گوشے میں کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا ہے - مضامین گھٹا کی طرح آئے - قلم پر برسات کے پرنالے کی پھبتی صادق آتی ہے - بقولِ امیر خسرو ساون بھادوں بہت چلت ہیں اور دن ماں تھوری - برس کر کھُل گیا ہے - حبس[۲] نے ہوا کو قید کر رکھا ہے - ایک پتے کو جنبش نہیں - مچھر اور پسوؤں کی فوج چاروں طرف سے ٹوٹ پڑی ہے - کھٹملوں نے دھاوا بول دیا ہے - انگاروں پسینا چلا آتا ہے - جدھر دیکھیے پنکھے چل رہے ہیں - مگر کسی طرح قرار نہیں - خلقت بولا اُٹھی ہے - اس عام بلا میں نظیر بھی گرفتار ہیں - لیکن یہ بلا کہیں طبیعت کی روانی کو روک سکتی ہے - کاغذ پر قلم ہے کہ چل رہا ہے - بند پہ بند قلم بند ہو رہے ہیں -

برسات رخصت ہو رہی ہے - جاڑے کا پیش خیمہ آگیا ہے - دن عمرِ عاشق کی طرح گھٹنے لگا ہے - راتیں زلفِ شبگوں کی طرح بڑھ رہی ہیں - گلابی جاڑا اپنا رنگ جما رہا ہے - ہوا کی خنکی معشوق کی سرد مہری سے زیادہ لطف دے رہی ہے - جس قدر سردی بڑھتی جاتی ہے بزمِ عیش و نشاط گرم ہو رہی ہے - اُمرا اور پیٹ بھرے رنگ رلیاں منا رہے ہیں - غربا سردی کی شدت کا تصور کر کے ابھی سے تھر تھر کانپ رہے ہیں -

---

[۱] زمین دیکھنا استغراق کرنا تک کرنا -

کثیف چاند ہے دیکھو نہ آسماں کی طرف + مجھے یہ ڈر ہے مبادا کہیں نہ میں دیکھو (ناسخ)

بیاز غم جو اُس کا کھا کر زمین دیکھے + خوش خوش وہ مقبروں کی جا کر زمین دیکھے (ذوق)

[۲] حبس - اُمس -

نظیر کو تو قدرت کی طرف سے عام پروانگی ملی ہوئی ہے۔ کیا محل، کیا جھونپڑا ہر جگہ اُن کی آؤ بھگت ہے
جہاں بیٹھے وہیں ایک قفلی نازک خیالی کی جما دی۔ غرض گرمی ہو۔ جاڑا ہو۔ برسات ہو۔ کوئی زمانہ ہو
کسی طرح کی واردات ہو۔ ان کے خیال کو فرصت نہیں۔ یہ ایک کل ہے کہ دن رات چل رہی ہے۔ اتنی
بڑی کل، اور یوں دن رات چلے، اور صرف چھ ساڑھے چھ ہزار شعر ڈھلیں۔ یہ کوئی قرینِ عقل بات
نہیں۔ مجھ کو معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ نظیر کو جس قدر لکھنے کا شوق تھا اُس قدر اپنے کلام کے جمع کرنے کا
اہتمام نہیں تھا۔ وہ زیادہ تر بہ تکلیفِ وقت لکھتا تھا۔ کوئی تقریب پیش آئی۔ دل میں خیال پیدا ہوا لکھا اور
پھینک دیا۔ دوست یا شاگرد اُٹھا کر لے گئے۔ تبرک سمجھ کر بیاض میں نقل کیا۔ خرمن نظیر کے ان خوشہ چینوں میں
مائی تھان کے کھتریوں کا نمبر سب سے اول ہے۔ کلیات جو متداول ہے اُنھی کے ہاں کی بیاض سے منقول ہے۔
نظیر کے زمانے میں کوئی ہندو رئیس تھا، بلاس رائے اُس کا نام تھا۔ اُس کے چھ بیٹے تھے۔ ہر بخش رائے
گوبر بخش رائے۔ مول چند رائے۔ تن سکھ رائے۔ اور دو اَور جن کے نام معلوم نہ ہو سکے۔ ازبس کہ تعلیم کے
باب میں بلاس رائے کے خیالات روشن تھے اُس نے اُن کی تعلیم کے لیے نظیر جیسا مستعد اور طباع اُستاد
مقرر کیا۔ ہندو تو اپنے اُستاد کی بہت قدر کرتے ہیں۔ اس خاندان میں نظیر کی بڑی قدر تھی۔ تنخواہ بھی کچھ کم
نہ تھی۔ ستر روپیہ ماہانہ ملتے تھے۔ نظیر کے خیالات درویشانہ نے اُن کی تعظیم و تکریم کے خیالات میں اور ترقی
بخشی تھی۔ وہ لوگ اس کو درویش کامل کی طرح مانتے تھے۔ اور دین و دنیا دونوں کی سعادت اُس کی
خوشنودی میں منحصر جانتے تھے۔ سعادت مند شاگردوں نے بزرگ اُستاد کے کلام کو بڑے شوق سے جمع کیا۔
نصیحت۔ حکمت۔ درویشی۔ ظرافت۔ عقیدت۔ کوئی رنگ ہو۔ کوئی ڈھنگ ہو۔ نظیر کا کلام ہونا چاہیے
بیاض میں نقل ہونا اُس کا ضرور۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جس قدر کلام نظیر کا تھا وہ سب اُن لوگوں نے

فراہم کرلیا۔ غزلیں جو کلیات میں درج ہیں چالیس سے زائد نہیں۔ وہ بھی غیر مرتب۔ حال آنکہ میرزا نوازش علی بیگ کے بیان سے معلوم ہوا کہ اِن کا ایک پورا دیوان ہے جو ردیف وار مرتب ہے۔ باطن نے اشعار منتخب کیے ہیں اُن سے بھی مستنبط ہوتا ہے کہ ہر ردیف میں ان کی غزلیں ہیں۔ میرزا نوازش علی بیگ نے تو یہ بھی کہا کہ فقط اُردو ہی کا دیوان نہیں۔ ایک دیوان اِن کا فارسی میں بھی ہے۔ میں نے اُن سے طلب کیا تو اُنھوں نے فرمایا دونوں دیوان ایک میرے عزیز گوالیار لے گئے ہیں۔ وہاں سے منگوا کر حاضر کرونگا۔ نہیں معلوم کیا سبب آج تک اُنھوں نے وعدہ وفا نہیں کیا۔ شاید اُن کے وہ گوالیاری عزیز دبا بیٹھے۔

(میرزا نوازش علی بیگ کے اخیر خط مورخہ ٣-اپریل ١٨٩٣ء کی عبارت دیوان کے متعلق یہ ہے:-

"دیوانِ مرحوم مغفور کے معاملات سخت مشکل ہیں۔ میں تو ایک متوسلان سے ہوں۔ دُور کا ناتہ رشتہ ہے گو کیسا ہی قریب کیوں نہ ہو مگر اُن کے نواسے کنواسے زیادہ مستحق ہیں۔ اتفاق سے اُن کا گزر مجھ تک ہوا۔ گوالیار سے تشریف لائے۔ بہت قیل قال بابت دیوان کے رہی مگر نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر غریب خانے پر رہ کر وعدۂ امروز و فردا ہی کرتے رہے۔ آخر وہ یہاں سے تشریف لے گئے۔ نہ خط و کتابت ہے۔ یہ تو کیفیت مختصراً عرض کی۔ مگر تدبیر ملنے دیوان کی گزارش کرتا ہوں کہ وہ حضرات عُہدوں پر ہیں یعنی میر بشارت علی صاحب نائب کوتوال شہر دھولپور ریاست میں ہیں۔ دو بھائی امجد علی صاحب وغیرہ چھاؤنی مُرار گوالیار میں۔ پتہ اُن کا عقب شفاخانہ سرکاری متصل بم پولیس کے مکان ہے۔ آپ ان صاحبان سے یہ لکھ کر کہ آپ لوگ خویش اور قریب میاں نظیر کے ہیں۔ آپ کے پاس دیوان میاں نظیر سنا جاتا ہے۔ نقل یا اصل جیسی ہو مجھ کو بھیج دیجیے۔ کیا عجب ہے کہ بھیج دیں۔"

اِس خط کے بعد حسبِ ہدایت میں نے سلسلہ جنبانی کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔)

کلیات کو چھوڑکر اور بھی بعض تصانیف نظیر کی میری نظر سے گذری ہیں۔ جوگی نامہ اور جوگن نامہ کلیات میں نہیں ہے۔ جوگی نامہ کے ۳۹ بند ہیں۔ اور جوگن نامہ کے ۴۶ بند۔ یہ دونوں مخمس۔ روٹی نامہ بنجارہ نامہ۔ کوڑی نامہ۔ پیسے نامہ۔ آٹا دال نامہ۔ گرہ بندِ نظیر (مکافات نامہ) ہنس نامہ کے ساتھ ۱۲۷۶ھ میں مطبع نظامی میں چھپے تھے۔ مخمس کے سوا کل نظمیں کلیات میں موجود ہیں۔

کلیات ابتداً مطبع آلہی واقع کٹنوہ دروازہ میں چھپا تھا۔ پھر بارِ ثانی ۱۲۸۲ھ میں مطبعِ احمدی واقع چارسو دروازہ میں چھپا۔ اِن دونوں چھاپوں میں بعض فحش بند اور بعض فحش نظمیں بھی تھیں جن کو منشی نولکشور نے اپنے ہاں کے اڈیشن سے موجودہ نفاست پسندی اور قانونی مصلحت سے خارج کردیا۔

نظیر نے کریما کی بھی پوری تضمین کی ہے اور یہ تضمین چھپ گئی ہے۔ ہر جگہ ملتی ہے۔ کریما کی تضمین کا رستہ مُعلّمی نے دکھایا جس کی وجہ سے اُس کو بہت زیادہ تعلق رہتا تھا۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے دل میں آگئی کہ لاؤ اِس کی تضمین کر ڈالوں۔ مذاق تو متفق تھا ہی۔ تھوڑے ہی دنوں میں پوری ہوگئی اُس میں کا ایک شعر دل سے نہیں بھولتا جو واقعی ضرب المثل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ضرب المثل ہے بھی سے سپیدی نے ڈالا سیاہی کو دھو۔ گئی پر نہ تجھ سے لڑکپن کی بو۔ بو نظیر کی زبان پر بواو مجہول ہے۔ قدیم میں لوگ اِسی طرح بولتے تھے۔

میری رائے میں اُردو کے شُعَرا میں آج تک نظیر سے بہتر کسی نے تضمین نہیں کی گویا نظیر تضمین کا بادشاہ ہے۔ باطن اپنے تذکرے میں لکھتا ہے کہ حافظ کے دیوان کی تضمین کر ڈالی ہے۔ گنتی کی غزلیں تضمین سے رہ گئی ہوں گی۔ چنانچہ اُس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"دیوانِ حافظ کی چند غزلیں زیورِ خمسہ سے مُعَرا ہیں۔ باقی سب جواہرِ فکر سے مرصّع ہوئیں۔" اگر حافظ کے

کلام چھ ہزار شعر ہوں تو ہر شعر پر ان کے تین مصرعے۔ چھ ڈیوڑھے نو ہزار شعر میاں نظیر کے ہوتے ہیں۔ کچھ غزلیں اگر چھوٹ گئی ہیں تو ہزار شعر چھوڑ دیجیے۔ آٹھ ہزار میں تو کوئی کلام نہیں۔

مخمّسوں کا یہ دیوان میں نے نہیں دیکھا۔ کُلیات میں جس طرح خسرو۔ سعدی۔ کی غزلوں کی تضمین ہے دو چار غزلیں حافظ کی بھی تضمین کی ہوئی ہیں۔ جن غزلوں کی تضمین کُلیات میں ہے اُن کے مطلع یہ ہیں:۔

سحر گاہانہ مخمورِ شبانہ	گر فتم بادہ با چنگ و چغانہ
دوش رفتم بدرِ میکدہ خواب آلودہ	خرقہ تر دامن و سجادہ شراب آلودہ
ساقی بنورِ بادہ بر افروز جامِ ما	مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکامِ ما
ساقیا برخیز و دردہ جام را	خاک بر سر کن غمِ ایام را
صوفی بیا کہ آئنہ صاف است جام را	تا بنگری صفائے مئی لعل فام را

حافظ انور خاں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے فرماتے تھے کہ ایک روز میں ایک پنساری کی دُکان پہ کھڑا تھا میاں نظیر کے ایک شاگرد بھی اُس دُکان پہ سودا لے رہے تھے۔ وہیں پہ اُنھوں نے باتوں ہی باتوں میں بیان کیا کہ نظیر کا کلام جو یہ چھپا ہے یہ تو بہت ہی مختصر ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک میرے پاس جس قدر کلام اُن کا ہے کوئی ڈیڑھ لاکھ شعر کے قریب ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں کسی قدر تخمین کی غلطی ہو، لیکن اس سے یہ بات تو صاف ظاہر ہوتی ہے کہ نظیر بہت ہی پر گو شخص تھا۔ آٹھ ہزار تضمین کے شعر، سات ہزار کُلیات کے، پندرہ ہزار تو یہ بھی ہوتے ہیں۔ چھ سات ہزار شعر دیوان میں بھی ہوں گے۔ ایک فقیر نظیر کی نظم کی ہوئی خیبر کی لڑائی پڑھتا تھا۔ میں نے اپنے کانوں سے سُنا بلکہ قصد کیا کہ لکھ بھی لوں لیکن فقیر بعض خام خیالی کے سبب لکھوانے پر راضی نہ ہوا۔ یہ نظم بھی کہیں چھپی نہیں۔ اور بہت سی نظمیں فقیروں کی زبان پہ ہیں جن کو چھاپے کا فائدہ ہنوز نہیں پہنچا

حقیقت یہ ہے کہ نظیر اکثر نظمیں لوگوں کی فرمایش سے بھی لکھا کرتا تھا۔ اور چوں کہ طبیعت دریاے مواج تھی اُس کو اپنے کلام کی چنداں پروانہ ہوتی تھی۔ لکھا اور صاحب فرمائش کے حوالے کیا۔ اس طرح بہت سی نظموں کی نقل خود اُس کے پاس بھی نہ رہی۔ اُن دنوں چھاپہ خانہ تو تھا نہیں۔ بڑا چھاپہ خانہ یہ تھا کہ گانے کی غزلیں ارباب نشاط کی زبانوں پر ہوں۔ شہروں شہروں رنڈیاں گاتی پھریں اور اُن کو شہرت ہو۔ عارفانہ کلام فقیروں کی پُر اثر صدا بن کر درِ قبول پر دھونی دے۔ رندانہ کلام بھٹیوں اور بھنگڑ خانوں میں اپنے اثر سے یاروں کو مست کرے۔ جہاں کوئی کلام کسی مذاق کا نظیر کے قلم سے نکلتا تھا وہ اُس کی اشاعت کے لیے بے چین ہوتا تھا۔ اُس کو اس کی چنداں پروانہ تھی کہ اُس کی کوئی نقل اُس کے پاس موجود رہے اور کلیات کے حجم کو بڑھائے۔ وہ شہرت کے چھاپے خانے میں اپنا کلام فوراً چھپوا لیتا تھا۔ پھر دیکھتا تھا کہ ہر دل میں اُسی کا نقش ہے، اور ہر زبان کو اُسی کا ورد۔ افسوس نسیان کے جھونکے نے بہتیرے اوراق اُڑا دیے۔ قلم کے کانٹوں سے اُلجھ کر جو رہ گئے ہیں وہی تو ہیں باقی سب برباد۔ یہ بچے کھچے بھی کوئی اکیس بائیس ہزار ہیں۔

نظم کے علاوہ نثر بھی نظیر نے لکھی ہے۔ لیکن اُن دنوں اُردو نثر کا رواج نہ تھا۔ لوگ نثر لکھتے ہوے ہچکچاتے تھے۔ اور مختلف خیال اُن کے دل میں پیدا ہوتے تھے۔ نظیر نے بھی اُنھی خیالات سے اُردو میں طبیعت آزمائی نہیں کی۔ نثاری کے اکھاڑے میں ایرانی پیترے کیے ہیں۔ باطن کا تو بیان ہے کہ نو نثریں اُنھوں نے لکھیں مگر میری نظر صرف پانچ سے روشن ہوئی۔ باطن کی عبارت یہ ہے:۔

"جس وقت مزاجِ عالی تحریر نثر پر ملتفت ہوا مضمون انشا ہاے نرمی گزیں۔ قدرِ متین۔ فہم قرین۔ بزم عیش رعنا زیبا حُسنِ بازار۔ طرزِ تقریر۔ وغیرہ نو عدد مثالِ نو رتن زیبِ بازوے شاہد مدعا ہو کر دست بستہ آن پہنچا۔"

گنوائیں گو نو ہیں مگر نام اُن کے ہاں بھی سات ہی کے ہیں۔ اِن سات میں نرمی گزین اور رعنا زیبا تو میرے پاس نہیں باقی سب ہیں۔ یہ نثریں چھپیں نہیں۔ میرزا نوازش علی بیگ کی نوازش سے مجھ کو قلمی نسخہ ہاتھ آیا۔ اُن کا بیان تھا کہ خود میاں نظیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ورق تھے۔ کتابت میں وضاحت۔ خط خوش خط نستعلیق۔ میرے پاس اُس نسخے کی نقل ہے۔ ہر چند یہ امر مسلّم ہے کہ میاں نظیر اچھے خوش نویس تھے۔ چنانچہ شاہ محمد اکبر ابو العلائی داناپوری نے بھی اپنے بیان سے اس کی شہادت دی۔ لیکن اس میں مجھ کو کلام ہے کہ یہ نثریں اُنھی کی کتابت سے ہیں۔ اس لیے کہ اُن میں بعض ایسی غلطیاں نقل کی ہیں جو سوا الکاتب کو دن کے مصنف سے ہو ہی نہیں سکتیں۔ مثلاً تصحیف جو کلھی نویسی کا دوسرا نام ہے۔ مصنف خود تصحیف کی غلطی نہیں کر سکتا۔ بعض نثروں کی تصحیح شاید خود مصنف نے کی ہے اور حاشیے پر غالباً اُنھی کا خط ہے۔ وہ خط بھی بُرا نہیں۔ بلکہ خوش خط ہے۔ بعض نثریں ایسی بھی ہیں جن کی تصحیح نہیں ہوئی۔ اُن میں اکثر نہایت فاش غلطیاں نظر آتی ہیں۔ جو مصنف کے قلم سے ناممکن ہیں۔

نظیر کی شاعری پر عام رائے

(۱) نظیر کا مفہومِ فطرت :۔ نظیر فطرت کو آبادی سے الگ خیال نہیں کرتا۔ اُس کی نگاہ میں فطرت صنعت سے ملی جُلی نظر آتی ہے۔ فطرت جو اُس کے خیال میں ہے وہ سراسر تمدّنی ہے۔ فطرت جو سوسائٹی سے الگ ہے اُس کی وہ چنداں پروا نہیں کرتا۔ سوسائٹی میں بھی فطرت کُل وجُل نہیں نہ جزوِ غالب بلکہ وہ ایک خوش نُما بیک گروانڈ کا کام دیتی ہے جو سوسائٹی کے خط و خال کو عُمدہ طور سے نُمایاں کر سکے۔ اُس کے ہاں پہاڑوں کی رُعب دار کیفیت کا بیان نہیں ہے۔ اُس کے ہاں جنگلوں کا پُر لطف وحشت ناک سماں نہیں دکھایا گیا۔ وہ پہاڑ پر برف کی چوٹیاں نہیں دکھاتا۔ وہ سمندر میں برف کے پہاڑ نہیں قائم کرتا۔ اُس کے ہاں سمندر نہیں۔ سمندر کا طوفان نہیں۔ اُس کے ہاں جوالا مُکھی نہیں۔ جوالا مُکھی سے بھونچال[۵۱] نہیں۔ وہ جنگلوں میں آگ نہیں لگاتا۔ وہ دشت میں بجلی نہیں گراتا۔ وہ آبادی میں ہے اور منجھ آبادی میں۔ وہ گانوں میں صرف ہوا خوری کو کبھی کبھی نکل جاتا ہے مگر زیادہ تر رہتا وہ شہر ہی میں ہے۔ اُس کی سوسائٹی میں آتے اُمراد اکابر بھی ہیں مگر انقلاب زدہ اور مُصیبت رسیدہ۔ زیادہ تر اُس کے ہاں بازاری خلقت بھری رہتی ہے۔ کبھی کبھی خوش پاکر اُس کو کم عُمر بچّے بھی گھیر لیتے ہیں بعض خاص وقتوں میں عاشق مزاج لوگ بھی آکر اپنا درد دُکھ اُس کو سُنا جاتے ہیں۔ وہ فطرت کے قہر و غضب کو بھی دکھاتا ہے مگر وہ قہر و غضب چشمۂ شفقت میں بجھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ غضب

[۵۱] بھونچال پر ایک نظم ہے جس کی ٹیپ یہ ہے ؎ دریا و کوہ و شہر جنگل سب ہلا دیا ٭ اک آن میں ہلا دیا اور پھر تھمبا دیا۔
یہ زلزلہ ۱۲۱۸ھ میں آیا تھا۔ شاعر نے اُس سے ایک واعظانہ اثر لیا ہے۔

کچھ اُسی طرح کا غضب ہی جس طرح کے غضب کا برتاو اچھّے نیک مزاج ماں باپ اپنے پیارے بچّوں کی بعض خفیف ناہموار باتوں پر کرتے ہیں۔ گویا وہ فطرت کو انسان کے ساتھ پُوری ہمدردی کرنے والی شفیق ماں سمجھتا ہی۔ کبھی کبھی اُس کے تیور پر میل بھی آتے دیکھتا ہی لیکن وہ دیکھتا ہی کہ تبسّم بھی اُس کے بعد ہی ہی۔

(۲) انسانی فطرت:۔ انسانی فطرت کے اُس جوش کو وہ بہت پسند کرتا ہی جو انسان کے مدنی الطبع ہونے کو زور سے ثابت کرتا ہی۔ اِس موقع پر اُس کی نگاہ میں کوئی عیب عیب نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ وہ جانتا ہی کہ گو بعض تفصیلات قابل گرفت ہوں مگر حقیقت میں اُن کے اجتماع کا باعث ایک امر محمود ہی جس پر تمام دُنیا کی آبادی کا دارومدار اور انحصار ہی۔

(۳) نظیر کی ہمدردی:۔ اشجار و طُیور و بہائم و احجار وغیرہ میں نظیر کی ہمدردی نافذ نہیں ہی مگر انسان کے کُل طبقات کے درمیان اُس کی ہمدردی الکٹرک کرنٹ (بجلی کی لہر) کی طرح پھیل کر تریاقی اثر پھیلاتی ہی۔

غیر ذی روح۔ کسی قدر کورے برتن میں اُس کی یہ روح بہت تری و تازگی کے ساتھ سمائی ہی۔ روٹیوں میں بھی نُور ظہور خاصہ ہی۔ تربوزا اور نارنگیاں بیک گروند میں پڑی ہیں۔ ککڑیوں میں کچھ جان ہی۔ ازاربند بھی اپنا مول تول خاصہ دکھا رہا ہی۔ موتی میں بھی آب و تاب ہی۔

طیور۔ بُلبلوں کی لڑائی اور بٹیری اور رازنے کی لڑائی میں طُیور کی جنگ آزمائی اور حُسن تدبیر کا تماشا دکھایا ہی۔ ہنس بلند شاخ سے اُڑا ہی اور پھر بلندی شاخ پر جا کر بیٹھا ہی۔ معاشرت کی ہوا اُس کو لگی نہ لگی دونوں برابر ہی۔ دکھایا ہی کہ طیور میں رنگِ محبّت اُسی طرح پھیکا ہی جس طرح انسانوں میں۔

چرند و درند۔ ہرن کی اُچھل پھاند خاصی ہی۔ حُسن اور ناز پروردگی اور اُمور دنیا سے ناواقفیت یہ باتیں ہرن میں جمع ہو کر اُس کو وقفِ ناز اور گرفتارِ بلا کرتی ہیں۔ کتّے کی دوستی اور ہوشیاری اور تجربہ کاری

اُس کو چھڑاتی ہے معجزے والی شیرنی شفقتِ مادری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

(۴) نظیر کا مفہوم موت:۔ موت کو وہ ایک عمدہ مصلحِ اخلاق جانتا ہے اور اُمرا و اکابر پر جو انقلابات طاری ہوا کرتے ہیں وہ اُس کے خیال میں اس غرض سے ہیں کہ عام خلقت کو عبرت ہو اور اُن کے اخلاق دُرست رہیں۔

وہ سوسائٹی کا اس قدر عاشق ہے اور اس کی اجتماعی خوش گوار کیفیت اُس کے دل پر اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ جب عین اس کیفیت میں وہ ڈوبا ہوتا ہے تو کبھی کبھی اُس کو موت کی مصلحت میں بھی کلام معلوم ہوتا ہے۔ کوئی موت کا نام لیتا ہے تو کانپ اُٹھتا ہے اور متوہم ہو کر اس کو ذکرِ موت سے منع کرتا ہے۔

(۵) نظیر کا خیالِ دین:۔ دُنیا اُس کے نزدیک اصل ہے اور دین اُس کی فرع۔ جو ہستی کہ دین میں ہو گی وہ گویا اس جہان کی ہستی پر منحصر ہو گی۔ وہ ایک عکس ہو گا جس کا سارا دار و مدار آج کل کی زندگی پر ہے۔ وہاں اغراض کی گرم بازاری نہ ہو گی۔ لوگوں میں ملنے جلنے کا مادہ نہ ہو گا کیوں کہ کسی کو کسی سے غرض نہ ہو گی۔ تعلّق اغراض سے روابط پیدا کرنے کی بہار نہ ہو گی۔ طلب و تلاش کی گرم بازاری سرد ہو جائے گی۔ ہر شخص فنا فی الحق ہو گا اور غرقِ لذاتِ عیشِ مطلق۔ ادیان کے اختلاف کو وہ کوئی امر مخلِ حکمتِ الٰہی قرار نہیں دیتا۔ اُس کے نزدیک خدا کے ماننے والے گویا سب بخشے جائیں گے۔ ہر مذہب میں اُس کے خیال کے مطابق انسان کی بھلائی کے لیے مفید نصائح ہیں۔ موت سے وہ ڈرتا ہے مگر اس وجہ سے کہ سوسائٹی اُس سے چھوٹتی ہے اور دُنیا کی بات دنیا کے ساتھ جاتی ہے۔

(۶) نظیر کے خیالات معجزوں اور خرقِ عادات کی نسبت:۔ وہ خدا کی قدرت کے آگے ان کو مطلق بعید نہیں سمجھتا۔

(۷) نظیر کے الفاظ:- ان کی تین قسمیں ہیں روڑے۔ سنگ ریزے۔ جواہرات۔ روڑوں میں وہ الفاظ ثقیل و دشنام آمیز شامل ہیں جو کچھ تو آزادوں کی طرف سے ملے ہیں اور کچھ سوسائٹی کی بدلگامی نے عنایت کیے ہیں۔

(۸) نظیر کی ترکیبیں:- الفاظ ایک خاص وضع سے اُس کے دماغ میں ترتیب پا گئے ہیں اور اسی ترتیب سے یکجہتگی کے ساتھ نکلتے ہیں۔ گویا اُس کے دماغ میں متفرق الفاظ نہیں ہیں جن کو وہ وقت پر ترکیب دیتا ہو بلکہ مختلف طول کی لڑیاں ہیں جو پروئی ہوئی رکھی ہیں اور وقتِ ضرورت خود بخود نکل آتی ہیں۔

(۹) نظیر کے قافیے:- قافیوں میں نظیر اکثر پہلوِ دقت اختیار کرتا ہے اور اس دقت میں آسانی کی ایسی راہیں نکالتا ہے کہ دقت سہلِ ممتنع ہو کر نظر آتی ہے۔ اکثر اس خصوص میں وہ استلزام مالایلزم کی رعایت کرتا ہے۔

(۱۰) نظیر کی بحریں:- رفتار اکثر کی سست ہے۔ نصیحت کی نظمیں اور بعض نظمیں جو تقریبات کے بیان میں ہیں اُسی طرح کی ہیں نصیحت کی بعض تیزی بھی دکھاتی ہیں اور وہ غالباً آزادوں کی زبان سے ہیں لڑائی کے بیان میں اکثر بحریں تیز ہیں۔

(۱۱) ہندی مضامین اور ہندی الفاظ:- ہندی مضامین اور ہندی الفاظ کا بھی اُس کے دماغ میں ایک عمدہ خمیر پیدا ہو گیا ہے اور اسی وجہ سے اُس کے اس قسم کے کلام میں بھی ایک خاص مزہ ہے۔

(۱۲) نظیر کی جدت:- غزل کے سوا نظیر پرانی لائن پہ چلنے کی بہت کم خواہش رکھتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات اُس میں بھی بہک جاتا ہے۔

(۱۳) تضمین:- نظیر تضمین کا آپ کو امام اور مجتہد جانتا تھا اور واقعی تھا بھی۔

(۱۴) ناصحانہ کلام:- اُس کے ناصحانہ کلام پر زیادہ تر اثرِ درویشی پایا جاتا ہے جیسے کوئی درویش دنیا سے

منہ موڑے ہوئے اپنے مریدوں اور چیلوں کو نصیحت کر رہا ہو۔

(۱۵) صنائع:۔ نظیر صنائع کا برتاؤ بہت کم کرتا ہے۔

(۱۶) اغلاط:۔ کچھ تو وہ ہیں جو غلطیِ کاتب کی وجہ سے ہیں کیوں کہ مُصنّف کو طبع کی طرف چنداں خیال نہ تھا۔ کچھ وہ ہیں جن کو وہ رواج اور استعمال کی وجہ سے صحیح سمجھتا تھا۔ غلط العام فصیح۔ اور کچھ وہ ہیں جو اَب داخلِ اغلاط ہیں مگر پہلے وہ یوں نہ تھے۔ یجوز للشاعر مالا یجوز لغیرہ کے قاعدے کو وہ کسی قدر وُسعت کے ساتھ برتتا ہے۔

(۱۷) نظیر کے کلام کی بقا:۔ نظیر کے کلام کا وہ حصّہ جو اُس نے اپنے خاص مذاق اور خاص خیال کے مطابق شاعرانہ جوش میں لکھا ہے کبھی فنا ہو نہیں سکتا اور اِس قسم کا کلام اُس کے مجموعے میں نصف سے زیادہ ہے۔

غزلوں پر رائے

غزلوں کے لیے سب سے بڑی چیز یہ ہی کہ شاعر کے دل میں عشق کا گہرا اثر ہو۔ چنانچہ اکثر شعرا کی نقلیں مشہور ہیں کہ جب کوئی اُن سے شاگرد ہونے کو گیا تو پہلے اُنھوں نے چھوٹتے ہی پوچھا کہ "میاں، تم نے کہیں دل بھی لگایا ہی؟" حقیقت یہ ہی کہ انسان غزلوں میں ایک سچے عاشق کا پارٹ[۱۵] پلے کرتا ہی۔ اگر معشوق سے جدا ہی تو اُس کو سراپا سوز و گداز ہونا چاہیے۔ اور اگر وصل سے کامیاب ہی تو اُس کو ہمہ تن شوق و نیاز ہونا چاہیے۔ جب تک جدائی اور وصل کے مزے خود نہ چکھ چکا ہو وہ ایک عاشق کے اصلی خیالات کیوں کر جان سکتا ہی اور اُن کی اچھی اور سچی تصویر کیوں کر کھینچ سکتا ہی؟ نظیر کے حالات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ واقع میں گویا عشق و عاشقی ہی کے لیے بنایا گیا تھا۔ جہاں کہیں اچھی صورت دیکھتا تھا پھسل پڑتا تھا۔ بیسیوں واقعات اپنے عشق کے اُس نے خود قلم بند کیے ہیں۔ اِن واقعات کی تفصیل اگر منظور ہو تو بزمِ عیش اور طرزِ تقریر اُس کی دیکھ لو۔ طرزِ تقریر میں یہ شعر اِس نے حسبِ حال کیا خوب لکھا ہی۔

چناں محوِ پری وش شمع رُویانم کہ ای یاراں	مرا دیوانہ و پروانہ باید پیش ازیں گفتن

جس کی ساری عمر حُسن پرستی اور عاشقی میں بسر ہوئی ہو اُس کے عاشقانہ خیالات کی تاثیر کا کیا پوچھنا ہی سب جتنے مضامین ہیں دل کو چھو کر نکلتے ہیں اور دل ہی میں جا کر بیٹھتے ہیں۔

اِس باب میں تو کچھ نظیر ہی مُنفرد نہیں۔ میر صاحب کا یہ رنگ اِن سے کہیں بڑھا ہوا ہی۔ لیکن اُن کے

[۱۵] عاشق کی پوری پوری نقل کرتا ہی جس طرح تھیٹر والے کرتے ہیں۔

خیالات زیادہ تر محرومی کے دھندلکے میں پڑے ہوے ہیں۔ اُن کے کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
اُن کا عشق اکثر ناکام رہا۔ وہ فراق کے جلتے بھُنتے مضمون بہت گرم نکالتے ہیں لیکن وصل میں آن کر
بالکل ہی پھیکے پڑ جاتے ہیں *نظیر ہجر میں ایک بیتاب عاشق ہے۔ رات اُس کو پہاڑ معلوم ہوتی ہے۔ دن
اُس کو کاٹے کھاتا ہے۔ تصورات اُس کو ستاتے ہیں۔ آنکھ کھولے ہوے ہے جب بھی معشوق سامنے ہے
آنکھیں بند ہیں جب بھی معشوق سامنے ہے۔ کبھی خواب کا طلسم کھڑا کرتا ہے۔ معشوق سے اُس میں ملاقات
ہوتی ہے۔ ذوق شوق کی باتیں ہونے لگتی ہیں۔ پھر آنکھ کھُل کر سارا طلسم ٹُوٹ پھُوٹ جاتا ہے۔ پھر وہی
انتظار کی زحمتیں ہیں۔ وہی وعدہ خلافیوں کے صدمے۔ وہی شوق کی فراوانی۔ وہی نام و ننگ سے
قطع نظر۔ وہی ناصحوں سے نفرت وہی رُقبا سے عداوت۔ وہی یاس کی دل آزاری۔ وہی مرگ کی تمنّا
وہی گریہ کی طُغیانی۔ وہی جنوں کی جیبدری وہی آبلہ پائی۔ وہی داغوں کی افراط۔ وہی ہوا سے باتیں وہی در و دیوار سے گفت گو

جب نظیر وصل کے شبستان میں شمع عیش روشن کرتا ہے وہ ہجر کی تاریکی بالکل رفع ہو جاتی ہے اُس کے
کُل زخم بھر جاتے ہیں۔ وہ جن آنکھوں سے رو رہا تھا اب اُن میں تبسّم کے اثر سے ایک خاص مسرت انگیز
شگفتگی پیدا ہو گئی ہے۔ لختِ دل جو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہ گئے تھے اب پھر سمٹ آئے ہیں اور سینے میں پھر
ایک بھلا چنگا دل بڑا خوشیوں کی اُمنگ پیدا کر رہا ہے۔ آبلوں میں جو کانٹے چبھے تھے اُنھی کانٹوں نے
سوئیاں بن کر اُن کے پھٹے ہوے جیب و دامن کو رفو کر دیا ہے۔ دل کے داغ اب داغ نہیں ہیں ہرے
بھرے باغ ہیں۔ مرگ کی تمنّا کے عوض زندگانی جاودانی کے تصور بندھ رہے ہیں معشوق جو نظر آتا ہے
اور کوٹھری قصور کا جلوہ دکھاتی ہے۔ اگر پاس میں کوئی خانہ باغ ہے تو بلا تشبیہ روضۂ رضواں ہے۔ رات پہاڑ

* چنانچہ یہ شعر میر کے شاہد حال ہیں ؎ یا روے یا گڑ لایا، اپنی تو یوں ہی گزری ÷ کیا ذکر ہم صفیرو، یارانِ شادمان کا ÷ قید قفس میں
ہیں تو خدمت ہے نالگی کی ۔ گلشن میں تھے تو ہم کو منصب تھا روضہ خوان کا ÷

تھی مگر وصل نے ایک چھونترے میں پربت سے رائی کر دیا۔ ادھر آئی اُدھر گئی۔ مرغ سحر کی آواز دل میں چٹکیاں لیتی ہی۔ اور مؤذن کی بانگ بے ہنگام بے چین کرتی ہی۔ بزمِ عیش کی تصویریں نظیر نے نہایت شوخ رنگ سے کھینچی ہیں۔ یہ رنگ اُس کی طبیعت میں اُس کی عام کامیابی نے بھر دیا تھا۔ میر صاحب کے ہاں یہ رنگ بہت ہی پھیکا ہی۔ وہ اپنی مایوسی اور افسردہ دلی سے بمشکل اُبھرتے ہیں۔ وہ ہنستے ہیں تو ٹھیک اُسی طرح جیسے کوئی ماتم زدہ صفِ ماتم پر ہنسے۔ اُن کی ہنسی میں آورد ہی اور نظیر کی ہنسی میں آمد۔ اُن کی ہنسی جاڑے کی صبح ہی۔ اور نظیر کی ہنسی صبح بہار۔ ایک طرف تمام کہرا چھایا ہوا ہی اور ایک طرف پڑا نور برس رہا ہی۔

مجھ کو ابتدا میں ایسا خیال تھا کہ نظیر نے شاید غزلیں کُل اُس عمر میں لکھی ہیں جب کہ اُس کا شباب تھا اور دل میں عشق و عاشقی کی اُمنگ بھر رہی تھی۔ مگر جب غور سے اُس کی غزلوں کو دیکھا تو یہ خیال بدل گیا اس لیے کہ بعض غزلوں میں اس قسم کی پختہ مشقی نظر آئی کہ اُن کو جوانی کی طرف منسوب کرنا چنداں قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہی کہ عاشقانہ غزلوں کے کہنے کی اُمنگ جوانی نے پیدا کی۔ اُس زمانے سے مشق برابر جاری رہی۔ پکّی عمر میں پہنچ کر جب اُس کے خیالات پر صوفیانہ مضامین کا ہجوم ہونے لگا اور نصائح کے خیالات اُبلنے لگے۔ اُس وقت غزلیں ایک مُہمل چیز معلوم دیں۔ لیکن مشق اتنے زمانے کی بے کار ہاتھ سے نہیں دی جا سکتی تھی اور اُن دنوں کے کُچھ خیالات بھی یہ تھے کہ تا وقتیکہ انسان متغزل نہ ہو شاعر ہی نہیں۔ پھر مُختلف مقامات میں طرحیں ہوتیں۔ لوگ اُن طرحوں کو لا کر سُناتے اور اُس طرح میں اَور لوگوں کی غزلوں کی تعریفیں کرتے تو خواہ مخواہ دل میں تحریک پیدا ہوتی۔ غرض اس طور پر کبھی کبھی غزل کی طرف بھی توجہ کرتا۔ مسدس اور مخمس اور غزلوں میں آسمان زمین کا فرق ہی۔ خصوصاً اس کے مخمس مُسدس۔ مگر جب غزل گوئی پر جُھکتا ہی تو شربت کے گھونٹ کانوں کے رستے اُتار دیتا ہی۔

جس غزل پر نظر کرو اُستادی کی پُڑیا اور تجربے کی گانٹھ ہے۔ بعض غزلیں مسجّع بھی ہیں۔ اور بعض میں بعض صنائع بھی خرچ کیے ہیں۔ بعض غزلوں کو جوشِ مضامین کی جہت سے قطعہ بند پائیے گا۔ کلیات میں غزلیں ردیف وار مرتّب نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جس جس طرح کہتا گیا ہے بیاض میں درج کرتا گیا ہے۔ اس ترتیب سے کسی قدر اُن غزلوں کی ترتیبِ تاریخی معلوم ہو سکتی ہے۔

غزل نمبر (۷) سے تقلیدِ میر کی جھلکتی ہے۔ یعنی طرزِ بیان میں کسی قدر فارسیت ہے جس کو غالب نے دوسری حد تک پہنچایا تھا۔

شور افگنِ جنوں ہے جس جا نگاہ کرنا	رکھتا ہے کام ہمدم واں ضبطِ آہ کرنا
جانا بھی آگے اُس کے اکثر پئے نظارہ	باعث بھی ہر اخفا پھر رو بہ راہ کرنا
ملتا بھی اُس وش سے جس میں گمانِ اُلفت	گر کچھ بھی ہو تو وہ نہیں دُور اشتباہ کرنا
پوچھا گر اُس صنم نے: "ہم حسن میں ہیں کیسے؟"	تو بے شعوری اپنی ہنس کر گواہ کرنا
کیا کیا نظیر تجھ میں مکر و فریب ہیں جو	اُس رمز آشنا سے اس ڈھب کی چاہ کرنا

اس غزل سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نظیر نہایت چوگوشیہ آدمی تھا۔ ہر موقع پر نہایت موقع سے بات بنا دینا جانتا تھا۔

بعض غزلیں مُردف نہیں ہیں۔ یہ طرز قدما کی ہے۔ فارسی میں اکثر بے ردیف غزلیں اُستادوں نے کہی ہیں۔ اور ردیف کی کمی کو قافیے کی چستی سے پورا کر دکھایا ہے۔ اُردو کے قدیم شُعَرا تو اکثر فارسی کے اُستادوں کی خوشہ چینی کرتے رہے ہیں۔ محاورے لیتے تھے۔ طرحیں لیتے تھے۔ طرزیں اختیار کرتے تھے۔

ھہ کلیات کی غزل نمبر (۲۷) واسع الشفتین ہے۔ غزل نمبر (۴) میں صنعتِ سوال و جواب ہے۔

خاص خاص بحریں اور زحافات جائز کرتے تھے۔ اکثر اوقات ریختہ پر وہ عالم ہوتا تھا کہ جیسے کسی ایرانی نے ہندوستانی لباس پہن لیا ہو۔ جوں جوں زبان ترقی کرتی گئی، اور شاعری قدم اصلاح بڑھاتی گئی قیدیں بڑھتی گئیں اور خصوصیتیں پیدا ہوتی گئیں۔ موجودہ خصوصیات کے رو سے خصوصاً لکھنؤ والوں کے خیالات شستگی کے مطابق غیر مردف غزل کہنا گویا ایک طرح کا جرم ہے۔ لیکن پھر بھی بعض شعرا کہتے ہیں۔ چنانچہ حالی کا یہ مطلع اس کی شہادت کافی ہے:-

حکم ہے پیر مغاں کا کہ جوانی نہ گنواو	خیر کفارۂ عصیاں ہے پیو اور پلاو

نظیر کی طرز کسی قدر انشا سے ملتی ہوئی ہے۔ وہی شوخی عبارت ہے۔ وہی لطف زبان۔ وہی چوچلے۔ وہی ڈھکوسلے۔ وہی روانی۔ اپنی روانی کی طرف نظیر ایک غزل کے مقطع میں خود یوں اشارہ کرتا ہے:

نظیر ایک غزل اس زمیں میں اور بھی لکھ	کہ اب تو کم ہے روانی ترے سخن کی سی

فرق انشا اور نظیر میں صرف اس قدر ہے کہ یہ کہیں کہیں عارفانہ غوطے لگاتا ہے اور وہ کسی قدر اس سے دور ہے۔ اکثر غزلیں جو نظیر کی پُر لطف ہیں قطعہ بند ہیں، اور بہت کم غزل کلیات میں ایسی ہے جس میں کوئی قطعہ نہ ہو۔

کلیات میں ان غزلوں سے اس کی طرز خاص آشکارا ہے۔

غزل نمبر ا۔ غزل نمبر ۱۲ غزل نمبر ۱۵ غزل نمبر ۱۷ غزل نمبر ۱۸۔ غزل نمبر ۲۳۔ غزل نمبر ۲۶۔ واقعی یہ غزلیں جوانی کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر اسی زمانے میں آہستہ آہستہ رنگ تصوف بھی چڑھ رہا تھا یہ تصوف عشق مجازی کے رستے سے آیا۔ اسی لیے اس کو عاشقوں کے ساتھ غالباً ہر کلام میں ہمدردی ہے اُن کے ساتھ کبھی تشدد نہیں کرتا۔

نظیر کے کلام میں شروع شروع عبرت کا رنگ ظاہر ہوتا ہی اور کبیر کے سے خیالات آہستہ آہستہ پیدا ہوتے ہیں:-

تنِ مُردہ کو کیا تکلف سے رکھنا
گیا وہ تو جس سے مزین یہ تن تھا

کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا
مُشکیں بدن تھا معطر کفن تھا

جو قبرِ کہن اُن کی اُکھڑی تو دیکھا
نہ عُضوِ بدن تھا نہ تارِ کفن تھا

نظیر آ گئے ہم کو ہوس تھی کفن کی
جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

نظیر کے خیالات پر بہت ہی ابتدا میں تصوف کا رنگ چڑھتا ہی، اور غالباً یہ رنگ عشقِ مجازی کے آئینے سے جھلکتا ہی:-

ہو کیوں نہ ترے کام میں حیران تماشا
یا رب تری قُدرت میں ہی ہر آن تماشا

ہے عرش سے تا فرش نئے رنگ نئے ڈھنگ
ہر شکل عجائب ہی، ہر اک شان تماشا

افلاک پہ تاروں کے جھمکتے ہیں طلسمات
اور روئے زمیں پہ گُل و ریحان تماشا

جنات، پری، دیو، ملک، حُور بھی نادر
انسان ہیں اُعجُوبہ تو حیوان تماشا

جب حسن کے جاتی ہی مرقّع پہ نظر، آہ!
کیا کیا نظر آتا ہی ہر اک آن تماشا!

چوٹی کی گُندھاوٹ کہیں دکھلاتی ہی لہریں
رکھتی ہی کہیں زُلفِ پریشان تماشا

مُنھ زرد، بدن خُشک، جگر چاک، الم ناک
غُل، شور، تپش، نالۂ و افغان تماشا

گر عشق کے کوچے میں گُزر کیجے تو واں بھی
ہر وقت نئی سیر ہی، ہر آن تماشا

ہم پست نگاہوں کی نظر میں تو نظیر آہ!
سب ارض و سما کے ہیں گلستان تماشا

نظیر نے ایک غزل میں معشوق کا سراپا لکھا ہے جس سے اُس کی مصورانہ قدرت کا کچھ حال معلوم ہو سکتا ہے۔

رُخ پری، چشم پری، زلف پری، آن پری
کیوں نہ اب نامِ خدا ہو ترے قربان پری

جھمکے جھمکے وہ ثریا کے۔ کرن پھول وہ پھول
بُندے بالے پری۔ موتی پری۔ اور کان پری

رشکِ خورشید جبیں، ابر سیہ سی تس پہ
لہر چوٹی کی غضب، زُلفِ پریشان پری

حُسن گلزار، تمنا شکل۔ صُراحی گردن
مہ جبیں۔ سیبِ ذقن۔ چاہِ زنخدان پری

باڑھ غمزے کی بلا۔ تیرِ نگہ۔ دشتِ[ل] سناں
تیغ ابرو کی ستم۔ ترکشِ مژگان پری

مسکرانے کی ادا جیسے چمک بجلی کی
آن ہنسنے کی قیامت، لب و دندان پری

آنکھ مستی کی بھری۔ شوخ نگاہیں چنچل
قہر کاجل کی کھچاوٹ۔ مسی و پان پری

بینی اور نتھ کا وہ عالم کہ چھدے دل جس سے
جو رچُٹنی کی جھلک۔ گوہرِ غلطان پری

دھکدھکی چاند سی۔ جگنون بھی ستاروں کی مثال
عطرداں طُرفہ، وہ توڑے بھی درخشان پری

چاک سینے کا غضب۔ صاف بدن موتی سا
انگیا تصویر سی۔ کُرتی کا گریبان پری

پُشتِ گُل برگ، شکم سیم۔ کمر تارِ نگاہ
ساق بلور۔ گلاوٹ میں ہر اک ران پری

گھیر اِشواز کا وہ جس کی کناری قرباں
چال آفت کی نشاں۔ جُنبشِ دامان پری

کیا کہوں اُس کے سراپا کی میں تعریف نظیر
قد پری۔ وضع پری۔ عالم پہ پری اور شانِ پری

ل دُشت کہتے تو ہیں نگاہ کو مگر چوں کہ نگاہ کا لفظ اوپر آچکا ہے قیاس چاہتا ہے کہ شاعر نے کوئی اَور معنی ذہن میں رکھے ہوں گے بعض خاص ترکیبیں جو لکھنے کی ہوتی ہیں جن کو نگاہ تو نہیں کہہ سکتے مگر وہ نگاہ سے الگ بھی نہیں جیسے مستی خمار خواب آلودگی حیرانی۔ غالباً اُنھیں حسن افزا اور دل فریب ترکیبوں کو دُشت سے تعبیر کیا ہے

ایک خاص طرز نظیر کی یہ ہی کہ وہ اکثر مشکل طرحیں کرتا ہی اور اُن میں بڑی سلاست سے مضامین کا تماشا طرحوں کی دقّت کہتی ہی کہ اُس کو تشبیہات اور استعارات پیچ در پیچ کے پیچ زمینِ شعر میں بند ہی کر کے رہیں گے لیکن وہ اس اکھاڑے سے بھی سلاست کے خم ٹھونکتا ہوا نکل آتا ہی۔ مرزا نوازش علی نے ایک خط میں جہاں ان کے دیوان کا ذکر کر کے مجھے مشتاق کیا - یہ بھی لکھا کہ دشواری قوافی وغیرہ کو ملاحظہ فرمائیں آپ محظوظ ہوں گے - ایک غزل کا اُن کے مطلع لکھتا ہوں جس کے ۲۳ شعر ہیں - ملاحظہ فرمائیے کیسے ثبوت کیسے سخت قوافی میں منظوم کیا ہی:-

جب کہ اُلٹی ہم نے تکرارِ نظیر پہ آستیں	کھینچ لی اس نے رُخِ رشکِ قمر پہ آستیں*

چند مشکل طرحیں تذکرۂ باطن اور کلیات سے منتخب کر کے ذیل میں درج کیجاتی ہیں - طرح کی اس مشکل پسندی کو شاہ نصیر دہلوی کی طرز سے کسی قدر تشبیہ دی جاسکتی ہی:-

ہوا جو اُس کا وہ کوچہ چمن سرشت نصیب	خُدا نے ہم کو اسی جا کیا بہشت نصیب
ساغر کے لب سے پوچھیے اس لب کی لذتیں	کس واسطے کہ خُوب سمجھتا ہی لب کی لب
ہی جو اُس محبوب کی انگشتری در دستِ چپ	رکھتی ہی کیا کیا نزاکت پروری در دستِ چپ
کل تو دہنے ہاتھ میں تسبیح رکھتا تھا، نظیر	اور مصلّے کی عنایت گستری در دستِ چپ
آج صہبا کی گلابی اُس کے ہی در دستِ راست	اور لبِ بت مے کی اک پیالی بھری در دستِ چپ
تری قُدرت کی قُدرت کون پاسکتا ہی کیا قدرت	ترے آگے کوئی قادر کہا سکتا ہی کیا قدرت

* - باطن نے تذکرے میں اسی غزل کا یہ شعر لکھا ہی:-

اُس پری رو کے دوانے کی یہ ہی شکل لباس + تارِ دامن خار پہ شاخِ شجر پہ آستیں

کبھی ہرگز نہ ترے رخ نے رخِ بدر کی قدر / کھوئی کاکل نے بھی آخر کو شبِ قدر کی قدر

عزت و قدر کی اس گل سے توقع ہے عبث / واں نہ عزت کی کچھ عزت ہے نہ کچھ قدر کی قدر

راستی خوار ہے اس چشم فسوں پرور سے / ہاں مگر منزلتِ مکر ہے اور غدر کی قدر

مے پرستوں میں ہے یوں ساغر و مینا کا وقار / جیسے اسلام میں ہو محتسب و صدر کی قدر

نقش برداری سے اس مہر کی چمکا ہے نظیر / ورنہ کیا ناک تھی اس ذرۂ بے قدر کی قدر

تیری بھی منھ کی روشنی رات گئی تھی ہے بہ ہل / تاب سے تاب، رخ سے رخ، نور سے نور، ظل سے ظل

یوسفِ مصر سے مگر ملتے ہیں سب ترے نشاں / زلف سے لف، لب سے لب، چشم سے چشم، تل سے تل

جتنے ہیں کشتگانِ عشق ان کے ازل سے ہیں ملے / اشک سے اشک، نم سے نم، خون سے خوں، گل سے گل

جب سے موا ہے کوہ کن، کرتے ہیں اس کا غم سدا / کوہ سے کوہ، جو سے جو، سنگ سے سنگ، سل سے سل

یار ملا جب اے نظیر، میرے گلے تو مل گئے / جسم سے جسم، جان سے جان، روح سے روح، دل سے دل

ہوں تیرے تصور میں مری جان، ہمہ تن چشم / دل ہے مرا جوں آئینہ حیراں ہمہ تن چشم

مت تختۂ نرگس سمجھ، اے گلبدن اس کو / ہے عشق میں تیرے یہ گلستاں ہمہ تن چشم

اس آئنہ رو کے ہے تصور میں نظیر اب / حیرت زدہ نظارہ، پریشاں ہمہ تن چشم

خط کی رخسار و رخ اس گل کے جو تحریریں ہیں وہ / ہے یہ وہ مصحف کہ جس کے ساتھ تفسیریں ہیں دو

تا ابد آزاد ہیں دام و قفس کے جور سے / بلبلِ تصویر و طاؤسِ خیالِ آئینہ

ہستیاں نیستیاں یاں بھی ہیں ایسی جیسے / وہ کمر اور دہاں کچھ نہیں، اور سب کچھ ہے

بے زری، فاقہ کشی، مفلسی، بے اسبابی / ہم فقیروں کے بھی ہاں کچھ نہیں، اور سب کچھ ہے

چھنکی نکلتی ہیں اشکوں کی شیشیاں یارب — ہمارے سینے میں کس شیشہ گر کی بھٹی ہے؟
بقا ہماری جو پوچھو تو جوں چراغِ مزار — ہوا کے بیچ کوئی دم رہے، رہے، نہ رہے
ملو شتابی ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوکِ گیاہ — مثال قطرۂ شبنم رہے، رہے، نہ رہے

ایک غزل اُس نے صوفیانہ ڈھنگ میں کہی ہے۔ عبرت کی گہری نظر اور عبارت کی روانی و سلاست قابل توجہ ہے:-

جو تو کہتا ہے، اے غافل! "یہ میرا ہے یہ تیرا ہے" — یہ جس کا ہے اُسی کا ہے، نہ تیرا ہے، نہ میرا ہے
تو اوّل سوچ تو دل میں کہ تو ہے کون اور کیا ہے؟ — نمازی ہے، شرابی ہے، اُچکا ہے، لٹیرا ہے؟
فرشتہ ہے، پری ہے، دیو ہے، یا آدمی جن ہے؟ — بلا ہے، بھوت ہے یا مُن ہے؟ - مزوّرا یا کمیرا ہے؟
تری کیا ذات ہے، کیا نام ہے، کیا کام کرتا ہے؟ — مسافر بے وطن ہے، یا ترا اس جا پہ ڈیرا ہے؟
جب ان چیزوں سے تو اپنے تئیں کچھ چیز ٹھہراوے — تو اس کے بعد پھر کہیو: "یہ میرا ہے، یہ تیرا ہے"
یہ چیزیں تو غرض کیا ہیں، تو اپنا ہی نہیں مالک — تجھے، اے بے خبر ناداں، یہ کس غفلت نے گھیرا ہے؟
تو کچے سوت کا دھاگا عبث بل پیچ کھاتا ہے — یہ سب وہم غلط ہے اور قصورِ فہم تیرا ہے
تو کیا جانے کہ تجھ کو کس نے کس چرخے میں کاتا ہے — تو کیا جانے کہ تجھ کو کس ایٹرن میں اٹیرا ہے
تماشا ہے، مزا ہے، سیر ہے کیا کیا، اہا ہا ہا! — مصوّر نے عجب کچھ رنگ قدرت کا بکھیرا ہے!
ترقی میں تنزل ہے، تنزل میں ترقی ہے — اندھیرے میں اُجالا ہے، اُجالے میں اندھیرا ہے
طلسماتِ حقیقی ہے، یہ کچھ سمجھا نہیں جاتا — یہی چاند اور یہی سورج، یہی شام اور سویرا ہے

۱؎ اس طرح میں آصف کی بھی غزل ہے۔

کہاں ہم اور کہاں پھر تم کوئی دم کا بسیرا ہے	نظیر اللہ اللہ! اس جہاں میں دم غنیمت ہے

یہ خیالات نظیر کے کبیر کے خیالات سے کس قدر مشابہ ہیں جہاں وہ کہتا ہے!

بھونرا رے ہم پر دیسی لوگ۔ آج کے بچھڑے کد جا ملیں گے رے ندیا ناؤ سنجوگ۔

اب کچھ اور اشعار اُس کے تفریحِ طبع ناظرین کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔

از تذکرۂ باطن:۔

دیکھ سبزوں کی طراوت کو زمیں پڑھتی ہے
دم بدم "انبت اللہ نباتاً حسنا"

چمن طرازِ حقیقی نے اپنی صنعت سے
کسی کو پھول بنایا، کسی کو گھاس کیا

آغوشِ تصور* میں جب ہم نے اُسے مسکا
کہا نزاکت سے اِک شور رہا بس بس کا

بدن گُل، چہرہ گُل، رخسار گُل، لب گُل، دہن ہے گُل
سراپا اب تو وہ رشکِ چمن ہے ڈھیر پھولوں کا

اُدھر اُس کی نگہ کا ناز سے آکر پلٹ جانا
اِدھر مرنا، تڑپنا، غش میں آنا، دم الٹ جانا

یہ کچھ بہروپ بن دیکھو کہ بن کر شکل دانے کی
بکھرنا، سبز ہونا، لہلہانا، پھر سمٹ جانا

یہ یکتائی، یہ یکرنگی تس اوپر یہ قیامت ہے
نہ کم ہونا نہ بڑھنا، اور ہزاروں گھٹ میں بٹ جانا

دل ہوا جس دن سے بسمل ابروے دل خواہ کا
تھا وہی پہلا دن اُس بسمل کی بسم اللہ کا

ماخوذ از بوستانِ معرفت مولفۂ بابو مادھو داس مطبوعۂ مطبع منشی نول کشور۔ یہ نظم حقیقت میں کبیر کے اس مشہور دوہرے کی شرح ہے:۔ کنکر چُن چُن محل بنایا لوگ کہیں گھر میرا+ نا گھر میرا نا گھر تیرا چڑیا رین بسیرا+ یہ دوہرا بھی ایک گیت کے ساتھ گایا جاتا ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔ اُڑ جا پکھیرو دن تو رہ گیو تھوڑا+

*امانت نے اپنے واسوخت کے اس شعر کا مضمون یہیں سے لیا ہے جو لطف ترتیب کے بندِ وصل میں یوں واقع ہوا ہے یاں گرہ کھل گئی دل کی اُدھر انگیا مسکی+ لبِ نازک سے صدا آنے لگی بس بس کی+

نہ گل اپنا نہ خار اپنا نہ ظالم باغباں اپنا* — بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا

نہ آئی بو جو ذرا تیرے مصحفِ رخ کی — نسیم پھاڑ گئی آکے ہر ورق گل کا

تو وہ ہی نور سراپا** کہ تیری صورت کو — بشر تو کیا ہی مری جاں ملک نہ دیکھ سکا

گلی کی خاک بھی ہو کر نہ ٹھہرنے پائے — ہمیں تو آہ فلک یاں تلک نہ دیکھ سکا

یہ ناتواں ہوں کہ آیا جو یار ملنے کو — تو صورت اس کی اٹھا کر پلک نہ دیکھ سکا

گھڑی تو دل کو پرو دیا، گھڑی جگہ چھیدا — کبھی خوشی نے مجھے وہ اک پلک نہ دیکھ سکا

آب تو ذرا سا گانو ہی بیٹھی نہ دے اسے — لگتا تھا ورنہ چین کا داماد آگرا

بتوں کی ناز برداری میں بھی تیری عبادت کی — مری اس بندگی کا اب تو ہی شاہد ہی معبودا

عزیزو، کیا پڑے سوتے ہو غفلت میں، ذرا جاگو — جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا

ایک نظر گر تجھے دیکھیں تو شادی سے پھیر — نہ کو لگیں چار چاند، مہر کو چار آفتاب

فرصتِ عمر قطرہ شبنم — وصل محبوب گوہر نایاب

بقول حضرتِ صائب ہزار حیف نظیر — کہ در بہار ندارم بکف بہائے شراب

قسمت میں گر ہماری یہ مے ہی تو ساقیا — بے اختیار آپ سے شیشہ کرے گا جست

کچھ ہم کو امتیاز نہیں صاف و دُرد کی — ای ساقیانِ بزم بیارید ہرچہ ہست

کیا کیا مگسِ عقل کے باندھے ہیں پر و بال — کرکے شکر خندہ ہم لب شکرِ چند

* اس طرح میں علی گوہر کی غزل بھی ہے مطلع یہ ہے۔ کہو بلبل سے لے جاوے چمن سے آشیاں اپنا ۔ پڑے گر صد ہزار افسوس، نہ ہوگا باغباں اپنا۔

** اس طرح میں سودا کی غزل بھی ہے۔

بندے کے قلم ہاتھ میں ہوتا تو غضب تھا
صد شکر کہ ہی کاتبِ تقدیر کوئی اور

پڑی ہی خاک گورستاں میں کیا کیا قدِ موزوں پر
اُگی ہی گھاس کس کس گُل بدن کے روئے گلگوں پر

وہ رکھے اینٹ چھاتی پہ زیرِ خاک سوتے ہیں
چمکتے تھے سنہرے قصر جن کے بامِ گردوں پہ

واماندگانِ راہ تو منزل پہ جا پڑے
اب تو بھی اے نظیر، یہاں سے قدم تراش

وہ عارض اور جبینِ تاباں کہ جو دیکھے اُس کو شرمندہ
قمر، خورشید، زہرہ، شمع، شعلہ، مشتری، مشعل

کفوں میں انگلیوں میں لعلِ لب میں چشمِ میگوں میں
حنا، آفت، ستم، فندق، مسی، جادو، فسوں، کاجل

دیکھے نہ مجھے کیوں کر از چشمِ حقارت او
وہ سرو جواں، یار و من فاختۂ پیرم

چپ بیٹھوں تو کہتا ہی "خاموش چرا ہستی"
کچھ بولوں تو ہوتا ہی آزردہ ز تقریرم

کس طرح سنبل ہوا اُن زلفوں سے آکر سر بسر؟
یہ لٹک، یہ بل، یہ پیچ و تاب، یہ خوش بو کہاں؟

چمن میں جب سے لب اُس غنچہ لب نے کھولے ہیں
گلوں کے پہلو میں غنچے نہیں پھپھولے ہیں

مہ ہی اگر جوے شیر تم بھی زری پوش بن
دودھ چھٹی کا اُسے یاد دلانے چلو

گو آتشِ گُل بھڑکی ہی، پر یہ نہیں توفیق
پھونکے جو اسیرانِ چمن کے قفسوں کو

تری وہ شان کی رفعت ہی، یا رسول اللہ
کہ لامکاں نے کہا: "لا الٰہ الا اللہ"

مُصحفِ رخ پہ ترے ابروے پیوستہ نہیں
مُو قلم سے یدِ قدرت نے لکھا بسم اللہ

پکارا قاصدِ شک: "آج فوجِ غم کے ہاتھوں سے
ہوا تاراج پہلے شہرِ جان، دل کا نگر پیچھے

سنو، میں خون کو تو ساتھ اپنے لے آیا ہوں اور باقی
چلے آتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے لختِ جگر پیچھے"

مرتا ہی جو محبوب کی ٹھوکر پہ، نظیر آہ!
پھر اُس کو کبھی اور کوئی لت نہیں لگتی

زلف ہو تو بہ سرِ احسان تو گرفتار کرے
چشم کی عین عنایت ہو تو بیمار کرے

منھ زرد آہِ سرد و لب خشک و چشمِ تر
سچّی جو دل لگی ہی، تو کیا کیا گواہ ہی

بیٹھے بٹھائے خلد میں ابلیس لے، نظیر
کیا دم دیا ہی حضرتِ آدم کو، دیکھیے!

تن دیکھیے جس گل کا جاں چھوڑ کے تن نکلے
وہ سیم تن اُس تن سے کس طور نہ تن نکلے

یہ نقش ہیں چیچک کے منھ پر عرق آلودہ
یا حسن کی صافی سے قطرے کئی چھن نکلے؟

موسیٰ کے تئیں گو شجرِ طور کی سوجھی
پر ختمِ رسالت کو بڑی دور کی سوجھی

ادہم اک دمڑی کی حقیا گو رہے عاجز سدا
ہم کو کیا کیا پیچواں اور گڑگڑی پہ ناز ہی

غور سے دیکھا تو اب یہ وہ مثل ہی، ای نظیر
باپ نے پدڑی نہ ماری بیٹا تیرانداز ہی

بالفرض اگر ہم ہوئے حوّا کے شکم سے
آدم کے تئیں پوچھیے: یہ کس کا جنا ہی؟

حکمت کا اُلٹ پھیر نہیں جن کی نظر میں
وہ کہتے ہیں غافل یہ بقا ہی یہ فنا ہی

اک اُس کی ذرا سمجھ نہیں جاتی، نظیر آہ!
کچھ روز ہی معجون کا نسخہ یہ بنا ہی؟

چھالا ہی درد ہی کوندن پڑی ہی ہوک اُٹھتی ہی
مرے پہلو میں کیوں، یارو یہ دل ہی یا کہ پھوڑا ہی؟

کبھو ری چوٹی ادا میں چھوٹی جفا میں لپٹی وفا میں
ہی اس سے کھوٹی کہ دل ہر اک کا ہر اک لٹک میں لٹک رہا ہی

وہ پیچی کا فسیاہ پٹی نہ دل کے زخموں پہ باندھے پٹی
پڑھی ہی جس نے کہ اُس کی پٹی وہ پٹی سے سر پٹک رہا ہی

تیرِ نگہ کو راہ ادھر دیکھ بھال دو
لکڑی سے پہلے تاڑنے والوں کو ٹال دو

۵۱ اس شعر میں بھی امانت کو توارد واقع ہوا ہی۔ دیکھو اُس کا بند آنکھ کی تعریف میں۔

۵۲ یہ طرح جرأت کی نکالی ہوئی ہی چنانچہ اُن کا مصرع انشا کے لطیفے کے ساتھ مشہور ہی۔ اُس لعت پہ پھبتی شبِ دیجور کی سوجھی + اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی +

از کلیات:-

پیش جاتی نہیں ہرگز کوئی تدبیر نظیر
کام جب آن کے پڑتا ہے زبردستوں سے

کر گئی ہے اس کی مژگاں کی جھپک بے کل ہمیں
کل اگر چاہے تو ہم دم اس گھڑی کچھ چھل ہمیں

دل خم ابرو کو دیتے ہیں تو کس کس پیچ سے
دام میں لیتا ہے اس کاکل کا اک اک بل ہمیں

یہ برق ابر میں[۵۱] دیکھے سے یاد آتی ہے
جھلک کسی کے دوپٹے میں نورتن کی سی

میں ہنس کے اس لیے منہ چومتا ہوں غنچے کا
کہ کچھ نشانی ہے اس میں ترے دہن کی سی

دیکھا جو نہانے میں وہ گورا بدن اس کا
بلور کی چوکی پہ جھلک نور کی سوجھی

سر پاؤں سے جب پھنس گئے اس زلف سیہ میں
تب ہم کو سیاہی شبِ دیجور کی سوجھی

وہ مجھ کو دیکھ کچھ اس ڈھب سے شرمسار ہوا
کہ میں حیا ہے پہ اس کی فقط نثار ہوا

سبھوں کو بوسے دیئے ہنس کے، اور ہمیں گالی
ہزار شکر! بھلا اس قدر تو پیار ہوا

قرار کر کے نہ آیا وہ سنگِ دل کافر
پڑیں قرار پہ پتھر یہ کچھ قرار ہوا

گلے کا ہار جو اس گلبدن کے ٹوٹ گیا
تو ڈر نظیر کا وہیں اس کو ایک بار ہوا

کسی سے اور تو کچھ بس چلا نہ اس کا نظیر
ندان[۵۲] میرے ہی آ کر گلے کا ہار ہوا

اب تو تری جفا سے یہ مانگوں ہوں میں دعا:
"ظالم، خدا کرے کہ کہیں تو لگائے دل

اور جس پہ تو فدا ہو، وہ ظالم ہو اس قدر
جو مطلقاً ترا نہ وہ خاطر میں لائے دل

۵۱ اس طرح میں جرأت کی بھی غزل ہے۔

۵۲ آخر کار، پرانا محاورہ۔

تجھ پر بھی چند روز توبہ کش رہے — دُر دُر اُدھر کرے اور اِدھر کو شتابے دل
ناچار جیسے تجھ سے چھڑاتا ہوں دل کو میں — ایسا ہی اُس سے تو بھی نکال کر چھڑائے دل
ہنسے روئے پھرے، رسوا ہوئے، جا گئے بند سے چھوٹے — غرض ہم نے بھی کیا کیا کچھ محبت کے مزے لوٹے
کلیجے میں پھپھولے، دل میں داغ، اور گل ہیں یا تھوٹے — کھلے ہیں دیکھیے ہم میں یہ اُلفت کے گُل بوٹے
ہزاروں گالیاں دیں، پھر ذرا ہنس کر ادھر دیکھا — بھلا اتنی تسلّی سے پھپھولے دل کے کب پھوٹے
کچلتے ہو مجھے تم میں یہ مانگوں ہوں دُعا دل میں — ”کوئی دل بر عرے آگے تمھیں بھی خوب سا کوٹے“
زباں کی کر کے مقراض، اور بنا دُشنام کا کاغذ — ہمارے حق میں کیا کیا آپ نے کترے ہیں گُل بوٹے
دُرجِ غم میں چشم نے گوہر اُگل کر بھر دیے — اشک نے جنگل کے جنگل دم میں ڈھل کر بھر دیے
کل جو ٹک رو یا کسی کو یاد کر وہ گُل بدن — اشک تھے آنکھوں میں یا موتی کُچل کر بھر دیے
ساقی کو جام دینے میں اُس خوش نگہ کو، آہ! — ہر دم اشارتیں ہیں کہ اس کے تئیں نہیں“

نظیر نے اپنی بعض مشہور اور مقبول غزلوں کی آپ ہی تخمیس بھی کی ہے۔ اُن غزلوں کے مطلع ذیل میں لکھے جاتے ہیں:-

ترے جمال کی سُورج جھلک نہ دیکھ سکا — کھلی نقاب رہی جب تلک نہ دیکھ سکا
بھرے ہیں اس پری میں اب تو یارو سر بسر موتی — گلے میں، کان میں، نتھ میں جدھر دیکھو اُدھر موتی
سحر جو نکلا میں اپنے گھر سے تو دیکھا اک شوخ حُسن والا — جھلک وہ مکھڑے میں اس صنم کے کہ جیسے سورج میں ہو اجالا
پھر آن کے منت سے ملا مجھ سے وہ لالا — المنۃ للّٰہ تقدس و تعالےٰ
دیر سے آج جو نکلے بُتِ ذیشان گئی — لے گئے صبر گئی، دل گئی، ایمان گئی

قاصد، صنم نے خط کو مرے دیکھ کیا کہا؟
پھر ہو کے خفا روٹھ گیا ہم سے وہ لالا
کبھی تو آو ہمارے بھی، جان، کوٹھے پر
لیا ہی ہم نے اکیلا مکان کوٹھے پر
زلفیں یہ دو نہیں رخ دل بر کے آس پاس
ابر سیہ ہی ماہ منور کے آس پاس
لگا یا دام زلفوں کی شکن نے پیچ نے، بل نے
بنایا پان نے رنگ، اور سنبھالا سحر کا جل نے
مانی نے جو دیکھا تری تنویر کا نقشا
سب بھول گیا اپنی وہ تصویر کا نقشا

یہ غزلیں جو مخمس ہوئی ہیں ان میں سے اکثر میں یہ لطف پیدا کیا ہی کہ باوجودے کہ غزل کے اشعار ایک دوسرے سے غیر متعلق ہوتے ہیں لیکن پھر بھی تخمیس کی کاریگری سے ایک دوسرے سے اُن کو اِس طرح ربط دیا ہی کہ بجاے خود ایک مسلسل رُوداد ہی جس کے پڑھنے میں آدمی کو لطفِ افسانہ حاصل ہوتا ہی۔

گر قتل مجھے تو نے ہمیشہ کو جلایا
ظالم، تجھے جیتا رکھے اللہ تعالےٰ!
دیکھ اب تو مجھے ہر کوئی کہتا ہی یہی آہ!
"پھر قبر سے اللہ نے مجنوں کو نکالا"
مر مر، مجھے کہتا تھا سو مرتا ہوں میں یارو
اب لاؤ کہاں ہی وہ مرا کوسنے والا
قاصد، تو مرا نام تو لیجو نہ، ولیکن
کہنا: "کوئی مرتا ہی ترا چاہنے والا"
لے لے کے بلائیں مجھے پھر کہتی ہیں آنکھیں:
"صدقے ترے، پھر ایک نظر مجھ کو دکھالا"
اوروں کو جو گرتے ہوے دیکھا تو لیا تھام
ہم گر بھی پڑے تو بھی نہ ظالم نے سنبھالا

جانؔ کر گورِ غریباں میں قیامت نہ مچا
اَب تو ٹک منہ کو دکھا، یار، کہ نرگس بن کر
اُس کے دامن سے لگوں، پانوں پڑوں، ساتھ چلوں
پان کھا کھا نہ ہنس اِس درجہ تو اے دشمن جاں
بوسے کی طلب کی تو کہا ناز سے: "چل دور!"
مجھ ضعف کے مارے کو نہ زنجیر نہ پاؤ
گر بس ہو مرا تو میں کسی چور سے کہہ دوں:
کیا جانیئے، کس حال میں ہووے گا عزیزو
کھڑے جو ہوتے ہو تم آن آن کوٹھے پر
یہ چونے کاری میں ہوتی ہی سُرخی کب ایسی
لڑاؤ غیر سے آنکھیں، کہو ہو ہم سے، "آہ!
خُدا کے واسطے اتنا تو جھوٹ مت بولو
تجھ میں تو یہ شمیم نہ تھی سچ کہہ اے نسیم
ہم تو کمر بندھا کے کے چھلے سے پھر لیے

ابھی سوئے ہیں ترے بے سروسامان کئی
نکلے ہیں خاک چمن سے ترے حیران کئی
خاک ہوں تو بھی مرے جی میں ہیں ارمان کئی
ابھی بھر جائیں گے خوں میں لبِ دندان کئی
اور دل کو کہا "لے" تو وہیں ہنس کے کہا: "لا"
کافی ہی مری قید کو اک مکڑی کا جالا
"جا، آج پلنگ اُس کے تو سونے کا اُٹھالا"
دل آج مرا، سلّمہ اللہ تعالےٰ
کرو گے حسن کی کیا تم دُکان کوٹھے پر
کسی کے خون کا ہی یہ نشان کوٹھے پر
کہ "تھا ہمیں تو تمھارا ہی دھیان کوٹھے پر"
کہیں نہ ٹوٹ پڑے آسمان کوٹھے پر
کس کی بھری تو زلفِ مُعنبر کے آس پاس
ٹپکے کے ساتھ ساتھ ستم گر کے آس پاس

۵۱ سرھانے میر کے آہستہ بولو ؛ ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہی ؛ اس پر سودا کا اعتراض مشہور ہی کہ "شعر تو میر صاحب کا ہی مگر در دخواہی اُن کی دوا کی معلوم ہوتی ہی"۔ نظیر نے اِس اعتراض سے بچ کر ایک راہ نکالی ہی اور سیدھے خیال میں عاشقانہ پہلو سے سودا سے بہتر نامیاب ہوا ہی۔ سودا کے شعر سے مُقابلہ کر کے دیکھ لو۔

لگایا دام زلفوں کی شکن نے پیچ نے بل نے
مرا دل دیکھتے ہی اس صنم کو ہو گیا شاداب
کبھی خوش ہو کے "ہو ہو" کی کبھی بولا "اہا ہا ہا!"
نہ بولا منھ سے ہرگز دیکھ کر وہ خوش دلی میری
مجھے کر جل سے غافل، بھولی صورت کا بنا نقشہ
اب اس ظالم کے ہاتھوں سے بچاؤں کیوں کر اپنا جی؟
چلا ڈرتا جو آگے کو تو وہ پھر ہنس کے یوں بولا:
ادب سے یوں کہا: "اب تو ہوئی تقصیر یہ مجھ سے
لگے غمزے لگانے تیر ادھر دکھلا کے سو پھرتی
ادھر آنکھوں کے جادو نے بنایا باولا کیا کیا
دکھا کر مجھ کو اپنی واں زبردستی کے یہ نقشے
وہ زلفیں اس کی سیاہ پر خم کہ ان کے بل او شکن گویا وہ
لگا لڑائی ہی اس نے جس دم، جھپک لیا جب تو دل کو کے
وہ ہنستے ہیں تو کھلتا ہے جواہر خانۂ قدرت
سراپا موتیوں کا پھر تو اک گچھا وہ ہوتی ہی
تبسم کی جھلک میں یوں جھمکتے جا ہیں دانت اس کے
میں تو صفِ محشر میں بھی لوں گا تجھے پہچان

نبایا پان نے رنگ اور سنبھالا سحر کا جن نے
نگاہیں دم بہ دم سو عیش و عشرت سے لگیں پلنے
عجب تو مجھے اس وقت نظاروں کی اٹکل نے
مگر کچھ کچھ تبسم کی شکر لب سے لگا ملنے
کیا اک بار منھ غصے میں سرخ اس یار اچپل نے
اٹھا کر جھٹ قدم واں سے لگا گھر کی طرف چلنے
"مم اڑا کر مفت نظارے بچا، اب تم لگے ٹلنے"
لگے قطرے پسینے کے مرے منھ سے وہیں ڈھلنے
ادھر سے تیغ ابرو کی بھی پھر کیا کیا لگی چلنے
ادھر کیں پھرتیاں کیا کیا نگاہوں کی بھی چھل بل نے
وہیں دل لے لیا جھٹ پٹ نظیر اس شوخ چنچل نے
نہ پہنچے سنبل، نہ پہنچے ریحاں نہ پہنچے ناگن نہ پہنچے کالا
ادا و آن نے ادھر دبوچا، پلک پلک نے ادھر اچھالا
ادھر لعل اور ادھر نیلم، ادھر مرجاں، ادھر موتی
کہ کچھ وہ خشک موتی، کچھ پسینے کے وہ تر موتی
کسی کے یک بیک جس طور جا ہیں بکھر موتی
رانجھا کو نہ بھولے گا کبھی ہیر کا نقشا

کبھی بوسہ کبھی انگیا پہ ہاتھ، اور گاہ سینے پہ
لگے لٹنے مزے کے سنگترے اور بیر آندھی میں

وہ چاندنی میں جو ٹک سیر کو نکلتے ہیں
تو مہ کے طشت میں گھی کے چراغ جلتے ہیں

چراغِ صبح یہ کہتا ہے آفتاب کو دیکھ:
"یہ بزم تم کو مبارک ہو، ہم تو چلتے ہیں"

دولت ہی کا ملنا ہے بڑی چیز نظیر آہ
بالفرض ہوئی اُس سے ملاقات، تو پھر کیا؟

جس قدر پینا ہو پی لے ان ہی ہاتھوں سے
آبِ جنّت تو بہت ہوگا، یہ پانی پھر کہاں؟

لذتیں جنت کے میوے کی بہت ہوں گی ہاں
پر یہ میٹھی گالیاں خوبوں کی کھانی پھر کہاں

واعظ و ناصح بکیں تو ان کے کہنے کو نہ مان
دم غنیمت ہے میاں، یہ نوجوانی پھر کہاں؟

ازتذکرۂ ابوالقاسم میر قدرۃ اللہ قادری:-

دوستی کی گرہ پہ عقل کا ناخن نہ توڑ، اے دل
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

یہ ظالم سنگ دل محبوب جادو گر ستم پیشہ
چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما را

جگنو یہ جان لوٹے ہے، چنبا کلی پہ دل
اور روح لوٹتی ہے مری عطر دان پہ

کہا "جو ایک لے بوسہ، میں دو لگا لینے"
تو ہنس کے کہنے لگے "چل بے، اب نہ ایک نہ دو"

سمندِ آسماں کب آپ سے دوڑے ہے اِس ہی تو
کسی کی ایڑ پہ ہے ایڑ، اور کوڑے پہ کوڑا ہے

ازفرہنگِ آصفیہ و ارمغانِ دہلی:-

کل بوسہ پا ہم نے لیا تھا سو نہ آیا
شاید کہ وہ بوسہ ہی ہو آبلہ پا

آپھنسا جو کوئی اس دامِ گرہستی میں
تھا جو دانا تو بہت زیست سے بیزار رہا

لگی تھی آگ جگر میں بجھائی اشکوں نے
اگر یہ اشک نہ ہوتے تو کیا ٹھکانا تھا

ہم لگے غیروں سے ملنے دل ہمارا پھٹ گیا
جو قدم اُلفت کا آگے تھا سو پیچھے ہٹ گیا

دن کو ہمارے پاس وہ چنچل کا ہے کو آوے گا اے دل
رات کو اک دم خواب میں آنا جس نے اِدھر کا چھوڑ دیا

جال میں زر کے اگر موتی کا دانا ہوگا
وہ نہ اس دام میں آئے گا جو دانا ہوگا

کہا جو ہم نے کہ آن لگیے ہمارے سینے سے اس دم اے جاں
تو سن کے اُس نے حیا کی ایسی کہ آیا منھ پر مرے پسینا

اس نے جب آنکھیں لڑا کر ہنس دیا
ہم نے بھی نظریں ملا کر ہنس دیا

ترے منھ کے جو ہر دم روبرو آنے کو کہتا ہے
ذرا آئینہ لے کر منھ تو دیکھے آفتاب اپنا

حسن کے ہے میرا عرضِ حالِ یار نے یوں کہا نظیر
"چل بے زیادہ اپنے بک بک نے تو سر پھرا دیا"

نظیر یار سے کیوں دردِ دل نہیں کہتا
سنا نہیں ہے وہ تو نے کہ سانچ کو کیا آنچ

آن اس کی فہم میں کیا جانے کیا آیا نظیر
جو ہمارے لگ گیا چنچل گلے

ہنس کر نظیر واں سے ٹھوکر لگا ہٹا دی
کی اُس نے یہ ہماری تصویر پر نوازش

پڑا جو ہاتھ نظیر اُس کے سینے پر میرا
تو بولی "واہ لگے آگ اِس قرینے میں"

صبح جب لعل اُٹھا مرغِ سحر گڑ ڈوں گڑ ڈوں
اُٹھ گئے پاس سے وہ رہ گیا میں ٹڑوں ٹوں

ڈر ہم کو بناوٹ کی ادا کا تو نہیں ہے
وہ آن غضب ہے جو خداداد کوئی ہو

پہلے ہی دیکھنے میں آنکھیں دکھائیں کیا کیا
چنچل نے ہم کو یارو دہلا دیا ابھی سے

باتیں ہمارے دل کی کہ دیں نظیر اُس نے
ہے سچ تو یوں کہ دل کو ہوتی ہے راہ دل سے

وہ جب گھر سے نکلے سچکتے سچکتے
قدم بھی اُٹھائے جھجکتے جھجکتے

صبح کا کرتا ہے وعدہ وہ تو پھر آتا ہے کب؟	دوسرے دن کا کہیں جب تیسرا پہر آئے ہے

محمد حسین آزاد نے ایک مقام پر آبِ حیات میں لکھا ہے کہ "نظیر کے بعض اشعار میر سے پہلو مارتے ہیں" ضرور ہے کہ بعض کلام نظیر کا واقعی انھوں نے میر کے کلام سے مقابلہ کیا ہوگا۔ اور کوئی مناسبت پائی ہوگی واقعی میں نے بھی دونوں شاعروں کے کلام کا موازنہ کیا تو آزاد کی رائے کو صحیح پایا۔ کہیں کہیں نظیر کے کلام میں میر کی جھلک پائی جاتی ہے۔ جیسے اس غزل میں:-

شور افگنِ جنوں ہے جس جا نگاہ کرنا	رکھتا ہے کام ہمدم [illegible] آہ کرنا
جانا بھی آگے اس کے اکثر پئے نظارہ	باعث بھی ہے اخفا پھر [illegible] کرنا
ملنا بھی اس روش سے جس میں گمانِ الفت	گر کچھ بھی [illegible] نہیں [illegible] کرنا
کیا کیا، نظیر، تجھ میں مکر و فریب ہیں جو	اس مرز آشنا سے اس [illegible] کی چاہ کرنا

ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ایک طرح ایسی بھی مل گئی جس میں میر اور نظیر دونوں کی غزلیں ہیں، بلکہ سودا اور انشا نے بھی اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ ہم پہلے میر کی غزل لکھتے ہیں۔

دل پہنچا ہلاکی کو نپٹ کھینچ کسالا	لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ
کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث	برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالا
معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر	مسجد میں ہے کیا شیخ؟ پیالا نہ نوالا
گذرے ہے لہو واں سرِ ہر خار سے اب تک	جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا

۱؎ اس طرح میں نکہت کی بھی غزل ہے مطلع ہے سو پیچ و خم میں ہو بہو ہر مو کے الجھا جا رہا ہے + مانگ کے رستے میں دل ٹھوکر پہ ٹھوکر کھا رہا ہے +

عارف - غالب - ذوق - وغیرہ کی غزلیں ان کے بعد کی ہیں۔

گر قصد اُدھر کا ہی تو ٹک دیکھ کے آنا
یہ دیر ہی زُہّاد، نہ ہو خانۂ خالا

جس گھر میں ترے جلوے سے ہو چاندنی کا فرش
واں چادرِ مہتاب ہی مکڑی کا سا جالا

ق

دُشمن نہ کدورت سے مرے سامنے ہو جو
تلوار کے لڑنے کو مرے کیجو حوالا

ناموس مجھے صافیِ طینت کی ہی، ورنہ
رُستم نے مری تیغ کا حملہ نہ سنبھالا

دیکھے ہی مجھے دیدۂ پُرخشم سے وہ میر
میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالا

اس زمین میں سودا کی جو غزل ہی وہ میری رائے میں میر سے بڑھی ہوئی ہی۔ سودا کے عمدہ اشعار اس غزل میں یہ ہیں:—

میں دُشمنِ جاں ڈھونڈ کر اپنا جو نکالا
سو حضرتِ دل سلّمہ اللہ تعالےٰ

جب مست چمن سے ہو چلا گھر کو وہ لالا
غنچے نے صُراحی لی اُٹھا، گُل نے پیالا

مانگا جو میں دل کو تو کہا: "بس یہی اک دل،
جلنے ہی تو چاہے مرے کوچے سے اُٹھا لا"

ای غنچہ سبب کیا ہی کہ آتے ہی چمن میں
گُل جھاڑے ہی دامن، تو نے تجھی کو سنبھالا

اتنا ہی تو یوسف سے مشابہ، کہ عدم کے
پردے میں چھپا اُس کے تئیں تجھ کو نکالا

فتنہ ہی اُٹھاتے ہو گئی پُشتِ فلک خم
ہرگز نہ کسی گرتے کو ظالم نے سنبھالا

انشا نے عشق کو عشقِ حقیقی کی طرف کھینچ کر عارفانہ رنگ میں اپنی غزل کو چمکایا ہی۔ دو شعر اس غزل کے اچھے ہیں۔ باقی تبرّک۔

اے عشق، مجھے شاہدِ اصلی کو دکھالا
قُم، خُذ بیدی، وفّقک اللہ تعالےٰ

اتنا تو پھرا وادیِ وحشت میں، کہ میرے
ہی پاے نظر میں بھی پڑا اشک کا چھالا

اب سب سے اخیر میں نظیر کی غزل لکھی جاتی ہی۔ میری رائے میں میر۔ سودا۔ انشا سب سے اِس کی غزل بڑھی ہوئی ہی۔ زبان میں سادگی ہی اور روانی۔ مضمون آفرینی کے لیے مبالغے کا دامن زبردستی نہیں کھینچا گیا نہایت عاشقانہ گہرا رنگ ہی۔ ہر شعر میں زبان اور خیالات کی گھلاوٹ پائی جاتی ہی۔ سلمہ اللہ تعالےٰ کو میر سے بہتر سودا چمکا چکا تھا۔ اُس میں گنجایش نہ تھی نظیر نے بہ تبدیلِ ضمیر ترجمہ کر کے کچھ لُطف پیدا کیا ہی انشا نے ایک نیا فقرہ لیا۔ نظیر نے بھی مطلع میں لیا ہی کیا۔ دونوں کے مطلع لطیف ہیں۔

پھر آن کے منت سے ملا ہم سے وہ لالا
کر قتل مجھے تو نے ہمیشہ کو جلایا
دیکھ اب تو مجھے ہر کوئی کہتا ہی یہی، آہ!
"مر مر" مجھے کہتا تھا سو مرتا ہوں میں یارو
بن تختۂ گل آخر ش اِس خاکِ چمن سے
قاصد، تو مرا نام تو لیجو نہ ولیکن
کیا خاک اُڑانے کو چلیں، آہ! چمن میں
جیسا کہ وہ ہو مجھ سے خفا روٹھ چلا تھا
شاید وہی بن ٹھن کے چلا ہی کہیں گھر سے
لے لے کے بلائیں مجھے یہ کہتی ہیں آنکھیں
صحرا میں مرے حال پہ کوئی بھی نہ رویا
اَوروں کو جو گرتے ہوے دیکھا تو لیا تھام

المنۃ للہ تقدس و تعالےٰ
ظالم نے تجھے جیتا رکھے اللہ تعالےٰ
"پھر قبر سے اللہ نے مجنوں کو نکالا"
اب لاؤ کہاں ہی وہ مرا کوسنے والا!
نکلا مرے قاتل کے شہیدوں کا رسالا
کہنا: "کوئی مرتا ہی ترا چاہنے والا
نہ یار، نہ ساقی، نہ صراحی، نہ پیالا
اللہ نے کیوں جب ہی مجھے مار نہ ڈالا؟
ہی یہ تو اسی چاند سی صورت کا اُجالا
صدقے ترے، پھر ایک نظر مجھ کو دکھالا
گر پھوٹ کے رویا تو مرے پانوں کا چھالا
ہم گر بھی پڑے تو بھی نہ ظالم نے سنبھالا

ہم تجھ سے اسی روز کو کہتے تھے، نظیر آہ !	کیوں تو نے پڑھا عشق و محبت کا رسالا؟

اِس غزل پر خود نظیر کو بھی ناز تھا اور سمجھتا تھا کہ یہ جواب اُس سے اچھا بنا۔ چنانچہ اِس کی مقبولیت کے صلے میں اس کو زیور ترجمہ سے بھی آراستہ کیا ہے۔

(رُباعیوں پر رائے)

مُجھے ہنسی آتی ہو کہ میں نظیر کی رُباعیوں پر رائے لکھنے بیٹھا ہوں حال آں کہ نظیر کے کلیات میں ایک رباعی بھی موجود نہیں - البتہ اُس کے فارسی کلام میں چند رُباعیاں ہیں وہ بھی کُل ایک وضع کی ایک ہی مضمون پر پھر میں رائے دوں تو کیا دوں -

رُباعی کا اُستاد شعرا کے نزدیک اب وہی شخص خیال کیا جاتا ہو جو عُمرِ خیام سے بڑھ جاے لیکن اُس نے اپنا خیمہ اِس قدر بلند قائم کیا ہو کہ کسی شاعر کے قلم و کاغذ کا اک چوبہ اُس تک نہیں پہنچ سکتا - اُردو میں اساتذۂ قدیم کی رُباعیاں تو محض تبرک ہیں - ذوق نے اِدھر کچھ توجہ کی تھی مگر اُس کے اکثر کلام کے ساتھ رُباعیاں بھی تلف ہوئیں - متاخرین میں انیس و دبیر اور اِن دونوں خاندان کے شعرا نے کثرت سے رباعیاں لکھی ہیں اور اکثر کام کی لکھی ہیں تشبیہات و استعارات اور خاص عقائد سے قطعِ نظر حکمت و اخلاق کی بہت سی رباعیاں نہایت قابلِ قدر ہیں -

میں نظیر کو چند رُباعیوں سے نہ عُمرِ خیام بنا سکتا نہ درد نہ ذوق نہ انیس و دبیر البتہ اِتنا ضرور معلوم ہوتا ہو کہ وہ اس گُر سے واقف تھا کہ رُباعی میں تان کی جان ہو چوتھا مصرعہ - اُسی ایسی لی ہونی چاہیئے اور اُسی کو تفتیش سامعہ متخیلہ عقل سب کو فریفتہ کرنا چاہیے - وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اِس فن میں اساتذہ نے اِس کثرت سے طبع آزمائی کی ہو کہ تازہ مضامین اور مقبول مضامین نکالنے اس میں مشکل ہیں - اِس لیے وہ اپنی قدرتِ ایجاد سے کوشش کر کے ایک نئی راہ نکالتا ہو اور گو مختصر ہی لکھتا ہو مگر ایسا لکھتا ہو کہ ذہن پر

اُس کا دیرپا اثر رہتا ہے۔ وہ اپنی مشہور طرزِ مسدس و مخمس کے مقابلہ میں یہاں بھی بندش کی لڑی میں رباعیوں کو
ایک دلچسپ واقعہ بنا لیتا ہے۔ اس پردے میں وہ اپنی ایک بڑی صنعت یہ بھی دکھاتا ہے کہ ایک مصرعے
پر مختلف طور پر کتنے مصرعے لگائے جا سکتے ہیں۔ سلاست و روانی اور تخیل اس کی یہاں بھی نمایاں ہے
چوں کہ رباعیاں اُس کی حکمِ عنقا رکھتی ہیں اگر یہاں نقل کی جائیں تو غالباً ناظرین پہ بار ہوگا۔ رباعیاں جو یہاں
نقل ہوتی ہیں وہ ہیں جو اُس نے ایک اپنی طرز کے پسند کرنے والے دوست کی خاطر سے لکھی تھیں اور ایک سخن فہم دوست
کے مُطالعے کو خط میں لکھ کر بھیجی تھیں۔ اُن میں کسی قدر اُس ایجاد کی جھلک ہے جس سے حضرت امیر خسرو نے اپنی رباعیوں کو پہیلی بنایا۔

(۱)
دل بُرد ز من چو نازنینے زیبا
پُرحیلہ و پُر فریب و پُر ناز و ادا
گفتم کہ دلم دہ بہ تبسم فرمود
البتہ مگر تو بعد یک لحظہ بیا

(۲)
چوں روز دگر بآں بُت عشوہ نما
گفتم کہ نشد وعدہ دیروز وفا
بشنید و بخندید و بفرمود امروز
البتہ مگر تو بعد یک لحظہ بیا

(۳)
چوں بعد دو پاس پیش آں مہر لقا
حاضر شدم و بگفتم اے حیلہ گرا
حالا چہ بخاطر است۔ گفتا بدہم

البتہ مگر تو بعدِ یک لحظہ بیا

(۴)
چوں بعد ز پاس زود مانندِ صبا
خوش رفتم و گفتمش کہ اے مہر فزا
اکنوں چہ قرار۔ گفت نہ خواہی آفت
البتہ مگر تو بعدِ یک لحظہ بیا

(۵)
چوں بعد ز ساعتی برفتم آنجا
گفتم کہ چنیں دیر مفرما۔ گفتا
اندیشہ مکن کہ دل بدست آید
البتہ مگر تو بعدِ یک لحظہ بیا

(۶)
ہم بعد ز لحظہ رفتم و با غوغا
گفتم کہ چنین لبیت و لعل تا بکجا
فرمود کہ بیش ازین تعلل نہ شود
البتہ مگر تو بعدِ یک لحظہ بیا

(۷)
ناچار ز روئے عجز گفتم او را
آن لحظہ بفرما کہ چہ باشد گفتا
چندان طلبی نظیر خواہم تو گفت
البتہ مگر تو بعدِ یک لحظہ بیا

(ف) [illegible] زیر نمبر (۱۲۴)

قصیدوں پر رائے

ہم نظیر کو نہ خاقانی و انوری سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو ولایت میں قصائد کے اُستاد تھے۔ نہ امیر خسرو اور فیضی سے جو ہندوستان میں اِس فن میں مُسلّم الثبوت تھے۔ نہ سودا سے جو اُردو میں اِس فن کا امام ہے نہ انشا سے جو بقولِ آزاد۔ اُردو کا امیر خسرو ہے نہ ذوق سے جو بقولِ ظفر خاقانیِ ہند ہے۔ اگر اِس فن میں اُس کی کسی سے تشبیہ ہو سکتی ہے تو وہ حضرت شیخ سعدی ہیں۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ وہ تعلقِ دربار کے سبب کبھی کبھی گو ناصحانہ پیرایہ ہی میں کیوں نہو مدحِ اُمرا و سلاطین پر مجبور ہوتے تھے اور اِس کو کبھی ایسی مجبوری واقع نہ ہوئی۔

قصائد جو اس کے مُیسّر ہیں وہ تعداد میں بہت قلیل ہیں لیکن ایسا سمجھنا کہ اُس نے اپنی عُمر بھر میں صرف اتنے ہی کہے ہوں گے غلطی ہے۔ جس طرح اُس کا اور بہت سا کلام ضائع ہوا قصائد بھی معرضِ تلف میں آئے پھر بھی جس قدر باقی ہیں وہ اُس کی اُستادی کے ثبوت کو کافی ہیں۔

قصائد میں بڑی اُستادی ہے گریز جس کو حسنِ مخلص بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن گُریز ہے لازمۂ مدح اور یہاں اس کے قصائد میں سرے سے مدح ہی نہیں پھر لُطفِ گریز کہاں سے پیدا ہو۔ البتہ حُسنِ خاتمہ کی لطافت ہر جگہ موجود ہے اور اِسی وجہ سے اُس کے قصائد پر زیادہ تر قطعے کی تعریف صادق آتی ہے۔

طولِ مبالغہ شدتِ تشبیہ دقتِ استعارہ مشکل صنائع کا التزام الفاظ کی دھوم دھام یہ باتیں بھی لازمۂ مدح ہیں۔ یہاں صرف تشبیب ہے اور بس۔ مخاطب عقل سلیم ہے نہ سلطانِ ہفت اقلیم۔ پیش کش برگِ سبز ہے نہ لعل زمرد۔ سر سے تاج ہی نہیں تو لعل و یاقوت کے لیے یمن و بدخشاں کی کیوں خاک چھانی جائے۔ اور دِہیم ہی نہیں تو گوہر و مرجاں کے لیے قلزم و عمّاں میں کیوں غوطے لگائے جائیں۔ نصیحت کی دُکان ہے۔ گو دُکان میں بہت زیادہ آرایش کی چمک دمک نہیں۔ مگر جتنے جواہرات ہیں سچے قدرتی نور سے پڑے چمک رہے ہیں۔ راستی کا جوہری بے پروا بیٹھا ہے نہ بہت لمبی چوڑی باتیں بناتا۔ نہ مال کے دکھانے میں کوئی کرتب کرتا۔ سچا مال ہے بے لاگ دکھاتا ہے اور بے کھٹکے دام مانگتا ہے۔ جی چاہے لیجیے۔ جی چاہے نہ لیجیے۔ نظیر کے قصائد میں منہس نامہ بھی داخل ہے مگر شہرت کی ہوا میں خدا جانے یہ کب سے اُڑ رہا ہے اِس کو تکلیف دینے کی حاجت نہیں۔ دو قصیدے البتہ نئے ہیں۔ غلام محمد رہا نے ذکر کیا۔ باطن نے سنائے ایک تو میر کے اِس قطعے کی شرح ہے۔

کل پانو ایک کاسۂ سر پر جو آگیا	یکسر وہ استخوان شکستوں سے چُور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر	میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا

دوسرا اوستاد کے اِس شعر کی۔

پردہ داری مے کند بر قصر قیصر عنکبوت	بُوم نوبت مے زند بر کنگرِ افراسیاب

خاقانی نے کسی زمانے میں مدین کے ویرانے کی سیر سے اثر لے کر وہ مشہور قصیدہ لکھا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

زریں ترہ و پرویز خسرو و ترنجِ زر	زریں ترہ کو بر خواں گو کم ترکُوا بر خواں

نظیر کو دور جانے کی حاجت نہ تھی مدین اس کے گھر ہی میں موجود تھا۔ رقّت جو آئی تو کسی دن عبرت کی آنکھوں سے یوں آنسو بہا دیے۔

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب ‌ ‌ ‌ اہلِ صورت کا ہے دریا اہلِ معنی کا سراب

وہ مطلّا قصرِ رنگیں وہ منقّش بام و در ‌ ‌ ‌ جن کی رنگینی سے تھا قصرِ ارم کو پیچ و تاب

وہ عظیم الشّاں مکاں دیتی تھیں جن کی رفعتیں ‌ ‌ ‌ ہنس کے طاق آسماں کو طاقِ ابرو سے جواب

صحن میں بستاں سرا ایسے پُر از غلمان و حور ‌ ‌ ‌ جن کی انہاروں میں جائے آب تھے گل خالص گلاب

اُن میں تھے وہ صاحبِ ثروت جنھیں کہتی تھی خلق ‌ ‌ ‌ کیقباد و قیصر و کیخسرو و افراسیاب

مہروش بہرام صولت بدر قدر و چرخ رخش ‌ ‌ ‌ مُشتری ہمت ثُریا بارگہ کیواں جناب

وہ تجمّل وہ تموّل وہ تفوق وہ غرور ‌ ‌ ‌ وہ تحشّم وہ تنعّم وہ تعیّش وہ شباب

ہر طرف فوجِ بُتاں ہر سو ہجومِ گُل رُخاں ‌ ‌ ‌ جن کے عارض رشکِ ماہ و رشکِ روئے آفتاب

چشمک و آن و اشارات و ادا و سرکشی ‌ ‌ ‌ طنز و تعریض و کنایت غمزۂ و ناز و عتاب

صبح سے لے شام تک اور شام سے لے تا بہ صبح ‌ ‌ ‌ متصل رقص و سرود و پے بہ پے جام و شراب

ساقی و مُطرب ندیم و مستی و میخوارگی ‌ ‌ ‌ ساغر و مینا و گُل عطر و مے و نقل و کباب

کثرتِ اہلِ نشاط و جوشِ نوشانوش مے ‌ ‌ ‌ از زمیں تا آسماں شورِ نے و چنگ و رباب

وہ بہاریں وہ فضائیں وہ ہوائیں وہ سرور ‌ ‌ ‌ وہ طرب وہ عیش کچھ جس کا نہیں حد و حساب

یا تو وہ ہنگامۂ تنشیط تھا یا دفعتہً ‌ ‌ ‌ کر دیا ایسا کچھ اس دورِ فلک نے انقلاب

جو وہ سب جاتے رہے دم میں حباب آسا مگر ‌ ‌ ‌ رہ گئے عبرت زدہ وہ قصر ویراں و خراب

تھا جہاں وہ مجمعِ عالی وہاں اب ہے تو کیا
نقش سُمِ گور یا کہنہ کوئی پَرِ عقاب

ہیں اگر دو خشت باہم تو لبِ افسوس ہیں
اور جو کوئی طاق ہے تو صورتِ چشم پُر آب

خواب کہیے اس تماشے کو نظیر اب یا خیال
کچھ کہا جاتا نہیں واللہ اعلم بالصواب

دوسرا قصیدہ مُسجّع۔

کیا کاسۂ می لیجیے اس بزم میں اے ہم نشیں
دورِ فلک سے کیا خبر پہنچے گا لب تک یا نہیں

یہ کاسۂ فیروزہ گوں ہے شیشہ بازِ پُر فنوں
جتنے حیل ہیں اور فسوں سب اس کے ہیں زیرِ نگیں

کل دامنِ صحرا میں ہم گزرے جو وقتِ صبح دم
اک کاسۂ سر پُر الم آیا نظر اپنے وہیں

بولا بفریاد و فغاں کیا دیکھتا ہے او میاں
تھے ہم بھی سر بر آسماں گو اب پڑے زیرِ زمیں

گل برگ سے نازک بدن سر پانو سے رشکِ چمن
زرّیں و سیمیں پیرہن دل کش مکانوں کے مکیں

دن رات ناز و نعمتیں مہ طلعتوں سے صحبتیں
عیش و نشاط و عشرتیں ساقی قراں مطرب قریں

باغ و چمن پیشِ نظر بزمِ طرب شام و سحر
ہر سو بکثرت جلوہ گر حُسنِ بُتانِ نازنیں

اک آسماں کے دور سے اک گردش فی الفور سے
اب سوچیے گا غور سے در لحظۂ آں در لمحۂ ایں

سُنتے ہی کیا تھرّا گیا رخسار پہ اشک آ گیا
دل عبرتوں سے چھا گیا خاطر ہوئی بس سہمگیں

اس میں سر اپنا ناگہاں ہر مو ہوا مثلِ زباں
بولا نظیر آگہ ہو ہاں من نیز روزے ہمچنیں

تصانیفِ نثر پر رائے

فہم قریں۔ دستور الصبیاں کی وضع کی ایک مختصر سی کتاب فن انشا میں ہے جس میں مبتدیوں کے لیے کچھ رُقعات معمولی آسان عام فہم عبارت میں ترتیب دیے گئے ہیں۔ گمان ہو سکتا تھا کہ شاید یہ اصلی رُقعات ہوں۔ لیکن اندرونی شہادت اس کے خلاف ہے۔ باپ کے نام جو رقعے ہیں اُن میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "بھائی دہلی میں ہیں۔ اُن کی لڑکی کی شادی ہے۔ کنایۃً مجھے بھی بلایا ہے۔ صراحۃً آپ کو بھی بلاتے ہیں۔" (دیکھو رقعہ ۹)۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ "چھوٹے بھائی کی نسبت کے لیے جو روپیہ لیا گیا ہے اُس کا سخت تقاضا ہے۔" (دیکھو رقعہ ۱۰)۔ دونوں جگہ بھائی کا مذکور ہے لیکن نظیر کے بھائی کہاں؟ ایک رُقعے میں کہ وہ بھی باپ ہی کے نام ہے لکھا ہے کہ "چار مہینے سے تنخواہ نہیں ملی۔ لالہ رام چند کے نام رُقعہ جاتا ہے۔ چالیس روپے اُس سے لے کر سرِدست کام چلائیے۔" (دیکھو رقعہ ۱۱) ممکن ہے کہ نظیر اپنے باپ کی زندگی میں نوکر ہو گئے ہوں لیکن نہ اُن کو ان کی مدد کی حاجت نہ اُن کو ضرورت خانہ داری سے اِس کی صلاحیت۔ رقعہ ۲۶ میں کہ وہ ماں کے نام ہے لکھا ہے کہ "ڈیڑھ سو روپے جاتے ہیں سو روپے بہن کی شادی میں صرف کیے جائیں۔ باقی اَور اُمور میں۔" اور یہ معلوم ہے کہ جس طرح نظیر کے بھائی نہ تھے بہنیں بھی نہ تھیں۔ غرض اِن قرائن سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رُقعے ترتیبی اور فرضی ہیں۔

عبارت معمولی اور عام فہم ہے کُل رُقعے قلم برداشتہ بے فکر و رویّت لکھے گئے ہیں۔ صرف ایک رقعے (رقعہ ۲۳) میں کسی قدر رنگینی ہے۔ یہ رُقعے مُرشد۔ باپ۔ چچا۔ خالو۔ ماموں۔ پھوپھا۔ بھائی۔

۱۱- کے نام ہیں۔

مقصود اِن سے یہ ہے کہ مُبتدی طالب العلموں کو معمولی خط و کتابت کا سلیقہ آجائے معمولی باتیں جو عموماً پیش آتی ہیں مثلاً تلاشِ نسبت۔ تلاشِ روزگار۔ تقاضائے خرچ۔ ارسالِ زر۔ طلبِ خیریت۔ معذرت ان کے اظہار سے عاجز نہ رہیں۔ مُختلف درجے کے رشتہ مندوں اور بزرگوں کے آداب و القاب معلوم رہیں۔ خط کیوں کر شروع کرتے ہیں کیوں کر ختم کرتے ہیں اور پھر بیچ میں تمہیدِ مطالب کس عنوان سے ہوتی ہے یہ باتیں مشق ہو جائیں۔

نظیر کے لطائف

پن گھٹ کا لطیفہ نمبرا

میاں نظیر کو پن گھٹ کا سین خاص طور پر مرغوب تھا چنانچہ عالمِ پیری کے بیان میں ایک جگہ تاسف کے ساتھ ارشاد کرتے ہیں :-

پن گھٹ کو ہماری اگر اسواری گئی ہے
تو واں بھی لگی ساتھ ہی خواری گئی ہے
سنتے ہیں کہ کہتی ہوئی پنہاری گئی ہے
لو دیکھو بڑھاپے میں یہ مت ماری گئی ہے
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہاے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلاے بڑھاپا

سیر تو روز فرماتے تھے مگر ایک دن کچھ زندہ دل پنہاریوں کے جھرمٹ میں گھر گئے۔ سب نے مل کر کہا میاں صاحب ہم تو تم کو جانے نہ دیں گے جب تک کوئی شعر نہ سنا دو۔ کوئی اور شرط کرتیں تو شاید انھیں دقت بھی ہوتی۔ شعر تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چھوٹتے ہی ذہن میں آگیا۔ پنہاریوں سے کہا کہ تم صف باندھ کر کھڑی ہو جاؤ تو میں سناؤں۔ پنہاریاں ہنستی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔ تب انھوں نے ایک مضحک شعر پڑھا۔ پہلے مصرع پر ایک خاص تیور سے اپنے خاص حصۂ جسم کی طرف اشارہ کیا اور دوسرے مصرع کے ہر ٹکڑے پر ہر ایک پنہاری کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے جاتے تھے۔ آدھی تو پہلے ہی

مصرع کو سُن کر چل دیں باقی جو ذرا ڈھیٹ تھیں اُن کو دوسرے مصرعے نے بھگایا۔ شعر ختم نہ ہوا تھا کہ سب جھینپ جھینپ کر گالی دیتی ہوئی بھاگیں وہ شعر یہ ہے۔

جس وقت کھڑا ہوتا ہے یہ آ... ... د کہتا ہے اسے ... اسے ... اسے ...

لطیفہ نمبر۲ ڈپٹی تراب علی صاحب کی روایت ہے کہ ایک دفعہ جناب حکیم سید افتخار علی مرحوم جو ڈپٹی صاحب موصوف کی برادری سے بہت نامی ذی علم اور راجہ صاحب بھرتپور کے طبیب اور موضع سید پورہ کے جاگیردار تھے آگرے میں تشریف لائے اور میاں نظیر مرحوم کی ملاقات کو گئے۔ باہم گر بہت اخلاق کی باتیں رہیں۔ آخر کو چلتے وقت حکیم صاحب ممدوح نے فرمایا کہ میاں صاحب آپ نظیر کیا بلکہ بے نظیر ہیں۔ جواب میں مسکرا کر فرمانے لگے کہ بے نظیر فرمایئے خواہ آبے نظیر۔ یہ لطیفہ ہو کر دونوں صاحب خوشی بخوشی جدا ہوئے۔

لطیفہ نمبر۳ یہ بھی ڈپٹی صاحب ہی کی روایت ہے کہ میاں صاحب بڑے پرہیزگار تھے مگر لوگوں کے خوش کرنے کو بعض مرتبہ مضحکے کو کوئی بات فرما دیتے تھے جیسے کسی نے پوچھا کہ میاں صاحب آپ ابلیس نہیں لیواتے فرمایا کہ کبھی صافہ بھنگ کا نہیں ہوتا تو بے چھنی ہوئی بھی ان کی آڑ میں پی لی جاتی ہے۔

نظیر کے صنائع

باطن جہاں نظیر کے کلام کی قسمیں گنواتے ہیں وہیں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ نظیر نے اپنے مختلف الاقسام کلام میں کُل صنعتیں شاعری کی ختم کی ہیں۔ یہ ایک مُجمل جملہ ہے جس کی تفصیل بہت تطویل چاہتی ہے۔ باطن کے زمانے میں شاید لال بُجھکڑ بکثرت تھے جو ایسے ہر نقشِ قدم میں آہوے مضمون کو پاؤں میں چکّی باندھ کر چوکڑیاں بھرتے دیکھتے تھے۔ اب کوزوں میں دریا بند کرنے کے دن گئے ع آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند۔

اب تو ضرورت ہے کہ ہر قطرے کو دریا بنائیں اور ردریا جو کوزوں میں بند ہیں اُن کو جگمگاتی لہروں کی زد ہیں اور اُچھلتے کودتے مینڈھوں کے خود نہا کر عقل کی چوٹی سے فہم کے دامن تک پہنچائیں۔ کُل صنعتیں شاعری کی ختم کیں اس کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ جتنی صنعتیں شاعری میں مُتداول ہیں اُن سب کا برتاؤ علی وجہ الکمال کیا۔ دوسرے معنی یہ کہ مثالیں ہر صنعت کی کلام میں موجود ہیں گو بعض کم ہیں بعض زیادہ۔ اگر کُل کو معنی میں اکثر کے لیں۔

وللاکثر حکم الکل

تو تیسرے معنی یہ کہ گو بعض صنائع متروک بھی ہوں مگر اکثر موجود ہیں۔

نظیر کو شاعری میں میں نے جو کیرکٹر دیا ہے اُس کے لحاظ سے یہ بالکل خلاف ہے کہ ان تین معنوں سے کسی ایک معنی میں بھی یہ جملہ اُس کے کلام پر صادق ہو۔ میں نے جہاں تک اُس کا کلام دیکھا ہے اور اُس کے

صنائع لفظی و معنوی پر غور کی ہے کہیں بھی اس کا اہتمام نہیں پایا جاتا کہ وہ کسی خاص صنعت کو مدِ نظر رکھتا ہے وہ از روے اپنے اصول کے اس کو ایک بیہودہ بات جانتا تھا کہ خواہ مخواہ صنائع کا برتاو کیا جاے ومعانی اور خیالات میں اس قدر منہمک ہے کہ بعض اوقات وہ غزل کے قواعدِ زبان کا پابند نہیں رہتا۔ صنائع تو امرِ آخر ہے۔ مگر شعرا کی انجمن میں جاتا تھا۔ گو خود انکسار سے نہ سمجھتا ہو مگر لوگ اکثر جلسوں میں اس کو صدرِ انجمن خیال کرتے تھے۔ شاگرد لوگوں کی چوٹیں سن کر فریاد کناں آتے تھے۔ آدمی ہی تو تھا خود بھی کبھی غیرت سے جوش میں آجاتی تھی۔ غرض ان اسباب سے کبھی کبھی اس کو اپنے کلام کو صنائع کے زیور سے آراستہ کرنا پڑتا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے خیال کا اتنا پکّا تھا کہ ضرورت سے زیادہ اس نمایش و نمود کا سامان نہ کرتا اور جس قدر سامان کرتا وہ اس قدر کم اور غیر قابل اعتبار ہوتا کہ کسی کو خبر ہوتی کسی کو نہ ہوتی اس کے کلام کے صنائع سے آراستہ ہونے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی نازنین فرنگ کانوں میں کوئی زمرد کا آویزہ لٹکا لے یا گلے میں ہیرے کا نکلیس پہن لے یا ہاتھوں میں سونے کے کڑے ڈال لے۔ حسنِ ذاتی کو ہجوم زینت سے ڈھانکا نہیں جاتا بلکہ موقع کی آرایش سے مختصر مفید مطلب طور پر چمکایا جاتا ہے۔

غزلوں کی بحث میں لکھ آیا ہوں کہ اس نے ایک غزل صنعتِ واسع الشفتین میں لکھی ہے۔ کہا نہ جاے تو شاید پڑھنے والے کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آئے کہ اس میں کوئی صنعت ہے۔ ذرا سا چھیوا مختصر سا حلقہ حسن کی بدولت نازنین نمایش سے مستغنی۔ آپ کو کیا خبر انگوٹھی کس انگلی میں پڑی ہے۔ اس غزل کے برعکس غزل نمبرہ ہے دیوالی کے بیان میں جس کا مطلع ہے۔

دوستو کیا کیا دیوالی میں نشاط و عیش ہے	سب مہیّا ہے جو اس ہنگام کے شایاں ہے شے

اس میں ہر شعر میں بلکہ ہر مصرع میں ایک نہ ایک حرف شفوی موجود ہے۔
ہنس نامے سے زیادہ نظیر کی کوئی نظم مشہور نہیں مگر شاید یہ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ اُس میں ترک حروف کے متعلق یہ ایک خاص صنعت ہے کہ شروع سے اخیر تک ث اور ظ کا کہیں پتا نہیں۔ اور پھر اس پر نظم اس قدر بے تکلف کہ کہیں آورد کی ہوا بھی تو نہیں لگی۔
غزلیں بھی بہت سی ایسی دکھا دی جا سکتی ہیں جن میں یہی صنعت موجود ہو مگر مثالیں بڑھانے سے کیا فائدہ خصوصاً جب کہ ترکِ حرف کوئی بہت بڑی صنعت نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو محض لفظی ہے۔ اختیارِ حرف کی مثال میں یوں تو ہر غزل پیش کی جا سکتی ہے کہ حرف آخر ردیف سے کوئی شعر خالی نہیں۔ اصل مثال وہ ہے کہ جس میں اس صنعت سے کوئی لطفِ خاص بھی پیدا ہو مثلاً بسنت والی نویں دسویں غزل جن میں سین اور دوسرے حروف صفیرین ہر شعر میں بکثرت اور بالالتزام موجود ہیں اور بسنت کا سُہانا سماں سلسلۂ صفیرین دکھا رہے ہیں۔ یا یہ مصرع پلکوں کی جھپک دکھلا دل چھل لیا اک پل میں۔ جس میں بجلی کے حروف بجلی چمکا رہے ہیں۔ صنائع معنوی میں ایہام حضرت امیر خسرو کو بہت پسند تھا اور زنہر میں وہ نسبت یعنی رعایت لفظی کی رعایت بدرجہ کمال ملحوظ رکھتے تھے۔ رعایت لفظی میں (جو دوسرا نام تلازمے کا ہے) ضمن اللفظ بھی داخل ہے ایہام اور رعایتِ لفظی کے ملنے سے ضلع جگت پیدا ہو جو آج تک جیتا جاگتا ہے۔ شُعراء طبقۂ اول و دوم میں اس کا بہت چلن تھا اور چوں کہ نظیر بھی داخلِ متقدمین ہے کہیں کہیں اس سکے کو وہ بھی رائج کرتا ہے۔ زبانی ضلع جگت کی مثالیں اس سے کہیں زیادہ ہوں گی جو کتابوں میں ہیں مگر ہمارے ڈاکٹر جانسن کے لیے باسول کہاں سے آئے۔ ہارے درجے ورق گردانی قائم مقامی کرتی ہے اور اوسوں پیاس بجھاتی ہے۔

کام جب آن کے پڑتا ہے زبردستوں سے	پیش جاتی نہیں ہرگز کوئی تدبیر نظیر

ایک عالم کو کہن کی طرح سر پھوڑے گا اب | گر اسی صورت رہی شیریں زبانی آپ کی

حُسن بازار نظیر کی ایک کتاب ہے اُس میں بزاز کی صفت میں کُچھ فقرے اُس نے لکھے ہیں۔ ضلع جگت کی بانگی دکھانے کو کچھ بُرے نہیں۔

نشستن بزاز در دُکاں بحُسن ممتاز در بر جامہ زیبی خود در ناز از اقسام اقمشہ چیدہ بلباس پسندیدہ از تن زیب فزا و بر شکِ گُل بدن زینت شبنم ناظر رمز فہمی چناں کہ مائل باریک بافتہ[۵۱] یافتہ وطور رنگین بیانی ہماں کہ خواہندۂ تافتہ[۵۲] رخ نہ از بہا تافتہ نوع شیریں ازیں بکثرت مطلوب کہ بخندد وار خاصہ[۵۳] ازاں بخوبی محبوب کہ نہ بجد گرہ بہر گرہ از پیمایش گزینہ در عار و از پیمودن پرنیاں منقش و دیبائے زرکش بے قرار تتبۂ تن اندام بلطف اندام نزاکت انتما و قدرِ مخمل بملایمت کف پا از نیرنگیِ نازو ادا خوبی جنس دورو و بہ نرمی تکلم دل رُبا گرمی خرید شال موبمو زیبا لی میاں این چنیں کہ ارکشا دستۂ کمرزریں میاں کاغذ زود نشیں و اظہارِ قیمت دارائی[۵۴] ہاں دل آرائی کہ بہر قسم فرصت قریں مدعائے اطلس[۵۵] گرفتہ از نگہداری زربشت و قفہ گزینی و مطلب بپیام خریدہ بتوصیفِ آں دیر نشینی بحُسنِ تقریر طلب حریر متجاوز التحریر و بمشاہدہ آں خواہشِ آلوان افزائش پزیرہ متاع بے پردہ بالمشافہہ بہتر و در پردہ تماشائے دیگر۔

تقریر کیا ہے خاصی بزاز کی دُکان ہے۔ تن زیب۔ گُل بدن۔ شبنم۔ بافتہ۔ تافتہ۔ شیریں

---

۵۱ بافتہ ایک قسم کا ریشمی کپڑا۔

۵۲ تافتہ ایک قسم کا ریشمی چمک دار کپڑا۔

۵۳ خاصہ ایک قسم کے کپڑے کا نام جو سفید سوت کا ہوتا ہے۔ متوسط کپڑا۔

۵۴ دارائی ایک قسم کا ریشمی کپڑا جسے اُردو میں دریائی کہتے ہیں۔ ساٹن فارس لکھتا ہے ایک سرخ ریشمی کپڑا۔

۵۵ اطلس ایک قسم کا ریشمی کپڑا جیسے ساٹن وغیرہ۔

خاصہ۔ گزی۔ گاڑھا۔ دیبا۔ ترا ندام۔ مخمل۔ دورو دورُخا۔ شال۔ پٹکا۔ دارائی۔ اطلس۔ پیلام۔ حریر۔ الوان سبھی موجود۔ پھر اس پردے میں مُشاہدہ بھی ہو رہا ہے۔ خریداروں کا کیوں اسی ایک دُکان پہ ہجوم ہے۔ جو خرید چکے ہیں وہ جلد ٹلتے کیوں نہیں۔ خواہ مخواہ قیمت دینے میں دیر کیوں لگا رہے ہیں۔ چیز جب خرید چکے تو اب بیٹھ کر اُس کی گھنٹوں خوبیاں جتانے سے حاصل۔

نظیر کے باغ طبع سے ایک جگہ کچھ پھل پھول بھی جمع کر دیے گئے ہیں۔ رعایت لفظی کی بہت مثالیں وہاں بھی ملیں گی۔ بیر کی تعریف میں نزاکتِ بے ربا۔ آموں کی رسید میں اشفاقِ عام طبع نیاز رس۔

پتنگ کی رسید میں بھی صنعت نے لفاظی دکھائی ہے عبارت کے کنکوے نے ضلع جگت سے دریائی پائی ہے خالی از تفریح نہیں اس لیے میں بھی ڈھیل دیتا ہوں۔

زحسن تپنگ ای رعایت پسند	پری خانہ شد خانۂ خاطرم

بلطف تپنگ دوبارا زپرواز ہوش دل بوفور سرور کلاہ بہوا انداخت و طائرِ شوق بانبساط موفور چوں کاغذِ باد در بال کشائی پرداخت شوخی روے ہوایش پری را برخصت کارپرداز و ارتباط قیام مائل گرداند و سرعت چپ و راست گردشِ چشم بُتاں را تماشا رساند طرز بالا رود ی دل رُبا ی بالا بالا بغمزۂ نازنیناں آموزد و از طور عکس ورزی آمد تیر پرتابی حسرت اندوزد اگر پیش کشی بساجت پرداز پچنگ تارشعاعی زیب خورشید آہنگ معانقہ سازد بقطع تکلّف حریفان چناں تیز روکہ شاہین شکار کبکان وار ہیبت و ہراس آں کنکوہ و چچکہ نحوی گریزاں کہ زاغ و زغن از تیر و کماں پروانہ نہمنامی از گرمی نشاط خنداں و پیچک رستہ بسبب لازمی رشتۂ خود بگوے ماہ رساں۔ (قدر متین رقعہ ۲۹)

یہی حال اُس نظم کا بھی ہے جس میں کنکوے اور پتنگ تعریف کی ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔

(دیکھو کُلیات)

لفظی صنائع میں تجنیس بھی ایک بڑی چیز ہے اور موقع سے بعض وقت اِس کا استعمال خالی از لُطف نہیں۔ مگر ازبس کہ کثیرالاستعمال ہے اِس کا وجود کوئی بڑے فخر و امتیاز کی بات نہیں جس طرح اور شعرا کے کلام میں اِس صنعت کا وجود ہے نظیر کے ہاں بھی۔ نظیر کو اس کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہے۔

مثالیں۔ پیتے تھے مے بسا بسا پھولوں میں ہم بسا بسا۔

شوخ بغل میں ناز سے کھولے تھا زلفیں کالیاں	خوش ہو گلے لپٹ لپٹ دیتا تھا میٹھی گالیاں
جو آج دیوے گا یہاں ویسا ہی وہ کل پاوے گا	کل دیوے گا کل پاوے گا کلپاوے گا کل پاوے گا
چپکے بھی وصف کرنے میں چپکا رہوں میں کیا	شرمندہ ہو کبوتر چیپ جس سے دائما

الٹیریشن ایک شعبہ تجنیس کا ہے تجنیس تام میں تمام حالتیں یکساں ہوتی ہیں۔ اِس میں فقط اول حرف یکساں ہوتا ہے لہذا اگر اس کو تجنیس الرؤس کہیں تو کچھ بے جا نہیں۔ جس طرح انگریزی مذاق ادب کو ترقی ہو رہی ہے عجب نہیں کہ تھوڑے دنوں میں یہ داخل صنائع مُروجہ ہو جائے۔

قافیہ جس میں حرف آخر کی رعایت ملحوظ رہتی تھی اب رفتہ رفتہ اُٹھتا جاتا ہے۔ عبارت میں انگریزی شان پیدا ہو رہی ہے۔ لامحالہ اُسی کی طرح رُؤس الفاظ کو تاج صنائع پنہائے جائیں گے۔ عربی کی تو نہیں کہہ سکتا مگر قافیہ فارسی میں بھی ایک امر تکلفی تھا۔ قافیے سے پیشتر اس زبان میں الٹیریشن کا فطری قانون کثرت سے متحد الرؤس دو لفظوں کا جوڑا ملا کر فصاحت کا ایک پائدار نتیجہ پیدا کیا کرتا تھا جیسے ہوش و ہنگ نام و ننگ مہر و ماہ خیمہ و خرگاہ شاخ و شانہ چک و چانہ ڈھونڈوگے تو اس قسم کے

لفظی جوڑے فارسی میں بہت ملیں گے۔ اُردو کی اچھی بھی اِن جوڑوں سے خالی نہیں۔ گالی گلوج۔ دھول دھپا جھک جھوری۔ چھیڑ چھاڑ۔ چھل چھبیلی۔ رنگ رنگیلی۔ گانٹھ گٹھیلی۔ یہ جوڑے آخر نظیر کی نظر سے گزرتے تھے اور گزرتے تھے تو آخر اپنی زیب و زینت بھی ثابت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ہم اُس کے کلام میں بھی اِس قسم کی مثالیں پاتے ہیں۔

خد و خال خوبی آگیں لبِ لعل پان سے رنگیں
مکتب کے بیچ گُل کی طرح سے کھلے رہے
کچھ بن سکا نہ جب تو ہوئی اُن کو بے بسی
لوگوں میں چرچے ہونے لگے اس کے ہر گھڑی
کثرت میں عشق تھا جو بُت گُل عذار کا
تازگی جی کی اور تری تن کی
رات دن شمس و قمر شام و شفق روشن ہوئے

نظر آفت دل و دیں مژہ صد مضرت افزا
ناز و نیاز کیا ہی بے کھُلے اور ملے رہے
چھُٹ پن کی تھی جو چاہ تو ہرگز نہ چھُٹ سکی
چاہت کی گُل کی بو نہ رہی آخر ش چھپی
ایک جوش تھا جنوں کے چمن کی بہار کا
واہ کیا بات کورے برتن کی
روکھی ہی روٹی حق میں ہمارے ہے شہد و شیر

میں نے موسیقی کی بحث میں دکھایا ہے کہ نظیر کا مذاقِ موسیقی کس قدر لطیف تھا اور اِس اعتبار سے اُس کا کان کیسا سچّا اور رس میں ڈوبا ہوا تھا۔ جہاں کہیں آواز سے اثر پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے وہ بہت کامیاب ہوتا ہے اُس کا اِس قسم کا کلام پڑھئے تو ختم کلام پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ابھی ستار بجا کر ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ گو گت بج کر موقوف ہو گئی ہے مگر زمزمے کانوں میں ہنوز گونج رہے ہیں موسم برسات کے بیان میں صفحہ ۳۲۲ پر جو نظم اُس کی ہے اِسی وضع کی ہے۔ بلکہ یہی کیوں اس کے قبل اور بعد چاندنی رات اور عالم بہار کے بیان میں جو دو نظمیں ہیں اُن میں بھی یہی لطف ہے۔ اِن تینوں نظموں میں

نظیر کے سلیقۂ موسیقی نے غیر محسوس طور پر کثرت سے الٹریشن کی رعایت کی ہے جن صاحبوں کو لطف اُٹھانا مقصود ہو کلیات اُٹھا کر دیکھ لیں۔ میں یہاں صرف ایک بند پر اکتفا کرتا ہوں۔

روز مزوں سے رات کو برسے تھا مینہ جھمک جھمک
جام ہے چھلک چھلک شیشہ رہے ببک ببک
ہم بھی نشوں میں خوب چہک لوٹتے تھے بہک بہک

بوندیں پڑیں ٹپک ٹپک پانی پڑے چھپک چھپک
یار بغل میں بانمک عیش و طرب تھے بے دھڑک
کیا ہی سماں تھا عیش کا اتنے میں آہ یک بیک

ابر کھلا ہوا گھٹی بوندیں تھمیں سحر ہوئی
پہلو سے یار اُٹھ گیا سب وہ بہار بہ گئی

یہ فقط الٹریشن کی مثالیں نہیں۔ الٹریشن کے علاوہ اس میں صنعت تسجیع بھی ہے صنعت تکرار بھی پھر سلیقۂ شاعرانہ نے بہت سے الفاظ یہاں ایسے بھی جمع کر دیے ہیں جو الفاظ نہیں ہیں بلکہ روزمرے ہیں فصاحت کے شرارے بلاغت کے چھکارے[۱]۔ الٹریشن کی مثال وہ بھی خاصی ہے جس میں چڑیاں پڑی چہک رہی ہیں۔

وقتِ سحر کی رو جیں کیا کیا ہُوں ہُوں ہُوں ہُوں کرتی ہیں
ہُوں ہُوں ہُوں ہُوں کر کر ذکرِ کُن اور فیکوں کرتی ہیں
مرغے بولیں ککڑوں کوں کوں مرغیاں کوں کوں کرتی ہیں
طوطیاں بھی سب یاد ہیں اُس کی بھتوں بھتوں کرتی ہیں

[۱] کہیں اگلی لفظوں کو میں نے الفاظ شاعرانہ قرار دیا ہے یعنے وہ الفاظ جن میں مشکل مفاہیم شاعرانہ بندمیں واضع نے اُن کو وضع نہیں کیا بلکہ فطرت نے شاعری کی ہے۔

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں چوں چوں کیا سب بے چوں بے چوں کرتی ہیں

اس عارفانہ مثال نے ایک مضحک مثال بھی یاد دلائی۔

صبح جب بول اٹھا مرغ سحر گڑوں کوں
اٹھ گئے پاس سے وہ رہ گیا میں ٹڑوں ٹوں

صنائع معنوی کا پھاٹک تشبیہ ہے اور قلعہ استعارہ۔ الیگری اسی قلعے کی ایک آرٹ گیلری ہے جس میں رمز اور تمثیل کے بہت سی خیال کو بلندی اور اخلاق کو پاکیزگی دینے والی تصویریں خوش نما اور مطلا معطی چوکھٹوں میں شیشۂ معنی سے جلوہ گر ہو رہی ہیں۔

لوگوں کو تعجب ہوگا کہ نظیر انگریزی تو جانتا نہ تھا پھر اس نے انگریزی صنائع کی رعایت کی تو کیوں کر کی یہ صحیح ہے لیکن آخر وہ اپنے ہاں کے قواعد بدیع سے تو واقف تھا۔ فن بدیع نے اس کو ایک پاس دے رکھا تھا جس کے ذریعے سے وہ کبھی کبھی اس خیالی قلعے میں آیا جایا کرتا تھا۔ کسی دن اس گیلری کی طرف بھی جا نکلا۔ الیگری کا لفظ گو ہماری زبان میں رائج نہیں نہ اس کا کوئی مرادف لفظ مگر پھر بھی عملاً اس کے معنی سے ہمارے ہاں کے اساتذۂ فارس و عرب واقف نظر آتے ہیں مولانائے روم کی مثنوی میں الیگری کی بہت مثالیں ہیں۔ جب تک استعارہ لفظوں میں محدود ہے استعارہ ہے جب لفظوں سے گذر کر پورے مضمون پر پھیل گیا تو وہی الیگری ہے جس کو تمثیل رمز مجاز جس لفظ سے چاہیے تعبیر کر لیجیے۔ نظیر کی نظموں میں یہ چند

۵۱ وہ قصہ یا مضمون جس میں صریح اور صرف لفظی معنے اصلی و مقصود بالذات نہ ہوں بلکہ معنئ اصلی و مقصود بالذات لطافت اور قوت کے لیے تشبیہ و تمثیل کے پیرایے میں بیان ہوئے ہوں

نظمیں کھلی کھلی الیگری ہیں۔

ہنس نامہ - آندھی - چوہوں کا آچار - آئینہ - کورا برتن - ریچھ کا بچہ - بھنگ - اژدہے کا بچہ -

ہنس اصل میں عبارت ہے روح سے - جس شہر سے آیا تھا اُسے عالم اطلاق سمجھیے - صحرا سے عالم تعین مُراد ہے - پیڑ قالب انسانی ہے - طیور جو اُس پیڑ پر رہتے تھے اُن سے یا تو تمام افراد مُشارک فی النوع مُراد ہیں یا جسمانی قوئے - قصد سفر سے ظہور آثار پیری اور پیام اجل مُراد ہے - سفر موت ہے پہلی منزل قبر -

آخر کے تیئں ہنس اکیلا ہی سدھارا حسن القطع کی ایک عُمدہ مثال پیش کرتا ہے اور سعدی کے اُس قصیدے کو بڑے زور سے یاد دلاتا ہے - جو یوں شروع ہوتا ہے -

	روزے کہ زیر خاک تن ما نہاں شود	

چوہوں کے آچار میں الیگری کا چٹخارا سمجھنا ذرا مشکل ہے - مگر خدا نے جن کو مذاقِ سلیم عطا کیا ہے وہ غالبًا بیان سے بیشتر مزہ لے رہے ہوں گے - اگر دُنیا کو شہر فرض کریں اور اس میں جو لوگ مصروف معاملات ہیں اُن کو خوانچے والا تو اکثر حالتوں میں یہ بات ثابت ہوگی کہ اُن کو بحث حلال و حرام مطلق نہیں بلکہ باوجودے کہ تمام قسم کے جعل و فریب دغابازیاں مکاریاں ہر معاملے میں شریک ہیں مگر ہر شخص اپنی ہی شے کی تعریف کر رہا ہے اور ہر ایک شخص کو اُسی کی چاٹ دلا رہا ہے - وکیل سے لے کر ذلیل مختار تک اور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سے لے کر ادنیٰ پنچ تک اور پارلیمنٹ کے اعلیٰ ممبر سے لے کر بے شعور ووٹر تک اور کمانڈر انچیف سے لے کر ادنیٰ اسوپر تک خلاصہ یہ کہ تمام اعلیٰ و ادنےٰ جو منہمک فی الدنیا ہیں دین و مذہب فقط اُن کی نوک زبان پر ہے ورنہ دل میں ہر قسم کی بے ایمانیاں

بھر رہی ہیں ۔ اسی قسم کے ایک بے نظیر پکّے دُنیا دار کی نظیر نے آپ اپنے تئیں ایک مُضحک خوانچے والا بنا کر دھجّیاں اُڑائی ہیں ۔

نظیر کے آچار کے مصالح قریب قریب وہی ہیں جو شیکسپیر کے تین مشہور جادوگروں کے میکبتھ میں ایک تُرک کی زبان تو نہیں ہے اور وہ ایک تُرک کی زبان سے ہو بھی نہیں سکتی تھی ورنہ سبھی کچھ ہے ۔

چوہے ۔ گھوس ۔ چھچھوندر ۔ چھپکلی ۔ مینڈھک ۔ کچھوے ۔ بچھو ۔ کالے ناگ ۔ مکڑیاں ۔ مکّھیاں ۔ جوں ۔ لیکھ ۔ مچھّر ۔ پِسّو ۔ کھٹمل ۔ دیمک ۔ چیونٹی ۔ چمگادڑ ۔ ابابیل کی بیٹ ۔ اُلو کے پر ۔ گدھ کی پشم ۔ کوّوں کے سر ۔ چیل کی آنتیں ۔ گوبر کی ڈلی ۔ مُہری کی کیچڑ ۔ غور کرکے دیکھیے تو یہ مصالح نہیں ہیں مگر حرام کی تمام چھوٹی بڑی قسمیں ۔

بند ذیل میں چالیس برس کی قید ایک گہرے مشاہدے کو دکھاتی ہے ۔ واقعی جب تک اِس عُمر کو نہیں پہنچتا آدمی پکّا دُنیا دار نہیں ہوتا ۔

اوّل تو چوہے چھانٹے ہوے قد کے بڑے ہیں	اور سیر سوا سیر کے مینڈھک بھی پڑے ہیں
چکھ دیکھ مرے یار یہ اب کیسے کڑے ہیں	چالیس برس گُزرے ہیں تب ایسے سڑے ہیں

کیا زور مزے دار ہے آچار چوہوں کا

بند ذیل اِس مضمون کی ایک مثال ہے کہ حرام میں بڑی رونق ہے اور لوگوں کو اِس طرف شدّت سے رغبت جعل سازوں دغابازوں کے گھر میں بڑا مَن برس رہا ہے اور دیانت دار کوڑیوں کو محتاج ۔

آگے تھے کئی اب تو ہمیں اک ہیں چوبے مارہ	مدّت سے ہمارا ہے اس آچار کا بیوپار
گلیوں میں ہمیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں خریدار	ہم سے ہے پڑی کوڑی روپے پیسوں کی بوچھار

کیا زور مزے دار ہے آچار چوہوں کا

جس طرزِ بیان پر یہ نظم مبنی ہے اس کو انگریزی میں آئرنی اور عربی میں تعریض کہتے ہیں۔ تعریض کی تلخی کو کچھ تو بات کو ہنسی میں ڈال کر اڑا دیا ہے کچھ اس طور پر کہ ساری ملامت اپنے سر لے لی ہے۔

روزی تو ہماری یہ اُتاری ہے خدا نے	دن رات پڑے ہم کو یہ آچار بنانے
اور پیٹ کے بھی واسطے دو پیسے کمانے	لذّت کو نظیر اس کی جو کھاوے سو ہی جانے

آندھی کی رمز بہت روشن ہے۔ آندھی سے مُراد ہے حرص و ہوا کا زور دُنیاوی لالچوں اور لذتوں کا شور۔ جن لوگوں کے نفس صالح ہیں گو اوّل وہلہ میں فطری کمزوری کے سبب اُن کا دل بھی کسی قدر ڈانوا ڈول ہوتا مگر آخر وہ حرص و ہوا پر غالب آتے ہیں اور قناعت کے بالاخانے پر شاہد صدق و صفا سے ہم کنار رہتے ہیں۔ رقیبوں سے شیاطین مُراد ہیں یا اخوان الشیاطین۔

نظیر آندھی میں کہتے ہیں کہ اکثر دیو ہوتے ہیں
میاں ہم کو تو لے جاتی ہیں پریاں گھیر آندھی میں

کورا برتن اصل میں وہ قلبِ صافی ہے جس کو گناہوں کی ہوا نہ لگی ہو اور صلاحیت ازلی کے آیا ہو۔ پانی کی بوند عبارت ہے بادۂ محبّتِ الٰہی سے۔ اور پنہاری مُرشدِ کامل سے۔

خاک سے جب کہ ان کو گڑھتے ہیں	بندگی سے یہ اپنی بڑھتے ہیں

کوروں پر پھول ہار چڑھتے ہیں		حور و غلماں درود پڑھتے ہیں	

تازگی جی کی اور تری تن کی ۔ الخ

بندِ ذیل کا چوتھا مصرعہ شاہد ہے کہ یہ محض کورے برتن کی تعریف نہیں ہے بلکہ پیرائہ رمز میں انسانِ خاکی سرشت کی ازلی آب و تاب دکھائی ہے۔

جس صُراحی میں سرد پانی ہے		موتی کی آب پانی پانی ہے	
زندگی کی یہی نشانی ہے		دوستو یہ بھی بات پانی ہے	

تازگی جی کی اور تری تن کی ۔ الخ

ریچھ کا بچّہ اصل میں نفس شریر انسانی ہے اور قلندر انسان۔ اُس کی تعلیم سے مُراد ہے ریاضتِ نفس بندر سے مُراد ہے عالمِ طفولت جس میں قوّتِ تقلید بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ ہاں چھوڑ دیا یا انھیں جنگل کے اندر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایّامِ طفولت گزر گئے۔ بے فکری کے دن گئے۔ جواب وہی کے دن آئے نفس شریر کو اب رام کرنا چاہیے۔ جب نفس شریر کی تعلیم پوری ہو جاتی ہے اور زیورِ صدق و صلاح سے آراستہ ہوتا ہے تو خلائق خواہ مخواہ جھکتی ہے اور اظہارِ عقیدت و گرویدگی کرتی ہے پھر نذر و فتوح کی کچھ کمی نہیں رہتی۔

یوں پڑتے روپے پیسے کہ آندھی میں گویا بیر		سب نقد ہوئے آکے سوا لاکھ روپے ڈھیر	

ذیل کے بند میں نہایت گہرا صوفیانہ نکتہ ہے کہ ہر چند کوئی کتنا ہی بڑا مرتاض زاہد کیوں نہ ہو مگر نفس کی مُخالفت اخیر عُمر تک جاری رہتی ہے پس پکّا اور سچا صوفی وہی ہے جو کسی وقت اُس کے حملوں سے غافل نہ رہے۔

جب کشتی کی ٹھہری تو وہیں سر کو جو جھاڑا	للکارتے ہی اُس نے ہمیں آن لتاڑا
گہ ہم نے پچھاڑا اُسے گہ اُس نے پچھاڑا	اک ڈیڑھ پہر ہو گیا کشتی کا اکھاڑا

پر ہم بھی نہ ہارے نہ تھکا ریچھ کا بچّا

اژدہے کے بچے سے نفس زاہدِ ریائی مُراد ہے اور اُس کے بیچنے سے تعلیم روحانی کی اشاعت کی آڑ میں کسبِ دُنیا۔ پُرانے اژدہے سے وہ نفس مُراد ہے جس نے خالصاً لوجہ اللہ ریاضت کی ہو اور درجۂ کمال کو پہنچا ہو۔ ایسے لوگوں کے پاس سچائی کی وجہ سے یقیناً لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اور چوں کہ روپے پیسوں کی اُنھیں پروا نہیں ہوتی روپے پیسے کیا دن رات جواہرات برستے ہیں۔ لیکن مقام مزلّۃ الاقدام ہے۔ اکثر نفوس رجوعِ خلائق سے فریب میں آجاتے ہیں شیطان تو ہر وقت تاک ہی میں بیٹھا ہوا ہے۔ موقع پاکر اس طرح ٹنگی دیتا ہے کہ عُمر بھر کو کنونڈے ہو جاتے ہیں۔ مرد وہی ہے جو ہر حال میں خُدا پر نظر رکھے کیوں کہ رجوعِ خلق سے گو دُنیا میں عروج ہو مگر وہ عروج چند روزہ ہے۔ اصل عروج وہی ہے جو اُس جہان میں سربلندی دے۔

اپنے تو کوئی ہرگز آیا نہ کام داتا	سچ ہے نظیر آخر اجگر کے رام داتا

آئینے کی جوانی کی بحث میں شرح ہو چکی ہے۔ رہ گئی بھنگ۔ میرے نزدیک اِس سبزی میں حافظ شیراز کے بادۂ ارغوانی کی سرخی جھلکتی ہے۔ بھنگ کی تعریف میں ایک نہیں تین تین نظمیں ہیں مگر جس نظم کو پڑھ جائیے باوجود بندش کی رندانہ آزادی اور عبارت کی قلندرانہ لفاظی کے اُس میں معرفت کی کیفیت چھائی ہوئی ہوگی۔

(پہلی نظم)	پی عاشقوں میں آکر دو بنگ کے پیالے

جو ایک دم میں تیرا گھر گھومے چھپر ہالے

یعنی صوفیوں کی بزم میں نشۂ معرفت سے سرشار ہو پھر دیکھ یہ دنیا جس کو تو اپنا گھر سمجھ رہا ہے اور جس میں تیری غفلت نے چھاؤنی چھا رکھی ہے کس طرح متزلزل نظر آتی ہے۔

گر دیکھنے ہیں تجھ کو کچھ عیش کے جھڑاکے | تو جھاڑ اپنے پنجے اور سر کو جھڑ جھڑا کے

پی عاشقوں میں آکر دو بنگ کے پیالے

یعنی دنیا سے آستین جھاڑ اور عاقبت کا ہوش کر

دوسری نظم کا پہلا ہی مصرعہ ہے۔

کیوں عبث بیٹھا ہے ڈالے کان میں غفلت کا تیل

گویا غفلت جو امورِ دین کی طرف سے لوگوں میں عام ہے اُس سے چونکاتا ہے اور کہتا ہے آنکھیں کھول اور عرفان کے اکھاڑے میں ذرا پھر دیکھ کیا کیا قدرت کے کھیل نظر آتے ہیں۔

کونڈی سُتکے کو بجا اور دیکھ ٹک قدرت کے کھیل
چھوڑ سب کاموں کو غافل بھنگ پی اور ڈنڈ پیل

خضر جن کی تصویر بندِ ذیل میں ہے اور جو بنگ پینے کی ہدایت کرتے ہیں یقیناً مرشدِ کامل ہیں۔

کل سبے مجھے دریا اُپر خواجہ خضر جو مل گئے | سبز پیراہن گلے میں ہاتھ میں اعصا لیے
کم خوراکی اور ناتوانی کے گلے جب میں کیے | تب تو وہ مُنھ دیکھ میرا ہنس کے یوں کہنے لگے

کونڈی سُتکے کو بجا۔ الخ

اس کے بعد جتنے بند ہیں سب فقر کے رنگ میں ڈوبے ہیں یہاں تک کہ خاتمہ اس مصرع پر ہے

یہ وہ سبزی ہے جسے پیتے ہیں یاں آکر فقیر[ا]

تیسری اور آخری نظم کا پہلا ہی مصرعہ یہ ہے۔

دُنیا کے امیروں میں یاں کس کا رہا ڈنکا

پہلی نظم کی طرح عاشق کا اس میں بھی شروع ہی سے ذکر ہے

کونڈی کے نقارے پہ خُتکے[لہ] کا لگا ڈنکا[ٹہ]
نت بھنگ پی اور عاشق دن رات بجا ڈنکا

بند تو اس نظم میں یہ لکھا ہے۔ واقعی زمُرد کا ٹکڑا ہے۔

اُلفت کے زمرد کے یہ کھیت کی بوٹی ہے	پتّوں کی چمک اِس کے کمخاب کی بوٹی ہے
منھ جس کے لگی اُس سے پھر کاہے کو چھوٹی ہے	یہ نان ٹکورے کی اِس بات پہ ٹوٹی ہے

کونڈی کے نقارے پہ خُتکے کا لگا ڈنکا۔ الخ

فقیر کی مستی کا سماں ذیل کے بند میں چھایا ہوا ہے۔

ہیں مست وہی پورے جو کُونڈی کے اندر ہیں	دل اُن کے بڑے دریا جی اُن کے سمندر ہیں
بیٹھے ہیں صنم بت ہو اور جھومتے مندر ہیں	کہتے ہیں یہی ہنس ہنس عاشق جو قلندر ہیں

کونڈی کے نقارے پہ خُتکے کا لگا ڈنکا۔ الخ

لہ چوب۔ نقارہ بجانے کی لکڑی۔ نقارہ۔ دھونسا۔

ٹہ ٹکورا۔ ڈنکا۔ نوبت کی آواز۔ (مغفور) وفائے وعدۂ دیدار جاتاں ہے جو محشر پہ + نوید نفخِ صور اسرافیل نوبت کا ٹکورا ہے (ظفر) ہر ٹکورے پہ ہے نوبت کی طرح دل ہلتا + اب تو نوبت سے لگا کرنے یہ نوبت پنکھا۔ (میر حسن) ٹکوروں میں نوبت کی شہنا کی و من گنگھڑ سننے والوں کو کھتی تھی شر...

پرسونیفیکیشن استعارۂ بالکنایہ کی ایک قسم ہے جسکو استعارۂ بالتشخص کہہ سکتے ہیں۔ اس میں بے زبان اشیا اور غیر ذوی العقول چیزوں کو بلکہ بعض اوقات محض خیالی اُمور کو بھی ایک تشخّص ذاتی دیتے ہیں اور اُن کو تمام لوازمِ عقل و نطق و حیات سے آراستہ کرکے تھوڑی دیر کے لیے حیوانِ ناطق بنا لیتے ہیں۔ یہ تو کہنا محض غلط ہوگا کہ قدیم شاعری میں اس کا رواج نہ تھا مگر اتنی بات البتہ ہے کہ انگریزی کے رواج نے اس کو صنائع میں اب کسی قدر زیادہ نُمایاں اور مقبول کر دیا ہے۔ اب کوئی عبارت ایسی نظر سے نہیں گزرتی جس میں یہ صنعت موجود نہ ہو۔ یہ صنعت چوں کہ اب انگریزی سے اُردو میں لی گئی ہے اس لیے اگر اس کو استعارۂ فرنگ بھی کہیں تو بجا ہے۔ اس استعارۂ فرنگ نے اب ایسی مسیحائی کی ہے کہ اکثر بے جان خیالی جمادات میں جان آ گئی ہے اور وہ عبارت کی انجمن میں عقل کے لب و لہجے سے گفت گو کرتے پھر رہے ہیں۔

نظیر اولاً تو اس زمانے کا آدمی نہیں دوسرے اُس کو صنائع سے زیادہ رغبت نہیں پھر کیوں کر امید کی جاسکتی ہے کہ یہ صنعت جو گویا مخصوص بفرنگ ہے اس کے ہاں زیادہ پائی جائے گی لیکن چوں کہ سچّا شاعر ہے سلیقۂ فطری اُس کو جہاں اور سبھی صنائع شاعرانہ میں ماہر دکھاتا ہے وہاں ایک خاص اعتدال کے ساتھ اس صنعت میں بھی مشغول رکھتا ہے۔ گو اُس کو اس صنعت کا چنداں اہتمام نہیں مگر جہاں بے تکلفی کے ساتھ بعض برجستہ فقرے نکل آئے ہیں تو اس لطف سے آئے ہیں کہ جو لوگ خاص اسی صنعت پر مٹے ہوئے ہیں اُن سے بھی عمر بھر ایسا ایک فقرہ نہ نکلے۔

نگہ لڑائی ہے اُس نے جس دم جھٹک لیا جب تو دل کو میرے ادا ادا نے اِدھر دبوچا پلک پلک نے اُدھر اُچھالا	لڑاتے ہی

چلا جب گھر سے اک دل بر دلوں کو حُسن سے چھلنے	عرق کو رُخ کے پلکوں کی جھپک پنکھا لگی جھلنے

لکھے تسخیر کے سو نقش اور تعویذ ہیکل نے
لگایا دام زلفوں کی شکن نے پیچ نے بل نے
بنایا پان نے رنگ اور سنبھالا سحر کاجل نے

نہ آیا رحم کچھ اُس کو بہت میں نے ساجت کی
نگہ نے سامنے آتے ہی سینے میں سناں جڑ دی
کمند زلف پر خم نے بھی گردن دل کی پھر جکڑی
لگے غمزے لگانے تیر ادھر دکھلا کے سو پھرتی
ادھر سے تیغ ابرو کی بھی پھر کیا کیا لگی چلنے

ادھر آن و ادا لپٹی کرشموں نے اُدھر گھیرا
اُدھر پلکوں کی نوکوں نے چبھویا دل میں نشتر سا
اِدھر انداز نے دھج کے کیا دیوانہ و شیدا
اُدھر آنکھوں کے جادو نے بنایا باولا کیا کیا
ادھر کین پھرتیاں کیا کیا نگاہوں کی بھی چھل بل نے

سُدھ لے گئی بالے کی جھمک صبر کرن پھول — اور عقل کو بُندے
بالی کی گئی جھوک لگا سینے میں اک ہُول — دل لے گئے جھُمکے
اور جی کے تئیں لے گئی زنجیرِ طلائی — زنجیر پنہا کر
کاجل کی کھنچاوٹ نے کیا دل پہ یہ طوفاں — جو ہوش اُڑایا
مستی کی دھڑی سے وہ کیا ظلم نمایاں — جو غش پہ غش آیا
ہاتھوں نے بھی اک آگ سی سینے میں لگائی — مہندی کو دکھا کر

چوٹی کی گندھاوٹ کہیں دکھلاتی ہے لہریں
رکھتی ہے کہیں زُلفِ پریشان تماشا
خوشی یہ بولی تمھاری میں گرد خاطر ہوں
ادھر سے عیش پکارا کہ میں بھی حاضر ہوں
[illegible] کی نظر سے واں
ایسی لڑی کہ خوب لڑی خوب ہی لڑی

پھانک بیجوں کی بھری لے ہے وہ جب منھ سے لگا	تب لپٹ جاتا ہے کیا پیار سے ہنس کر تربوز

اندھیری رات میں اسی صنعت کے ستارے جگمگا رہے ہیں۔

ٹالے ہے سب آئی ہوئی آفات اندھیری	کام آتی ہے عاشق کے بہت رات اندھیری

جاڑے کے اکھاڑے میں اسی صنعت کا پہلوان خم ٹھونک رہا ہے۔

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی	اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی	پالا بھی برف پگلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

چلا خم ٹھونک اچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

برسات کے صحن میں بھی اسی کی پھسلن ہے۔

لاٹھی کو ٹیک کر جو سنبھلوں ہے کھڑا تو کیا	چھجا گرا منڈیر بہے کا تھر پھسل پڑا

سب سے زیادہ ہولی نے اس صنعت کو رنگا ہے۔ یوں تو ہولی کی ہر نظم میں یہ رنگ اُچھلا ہے مگر اُس نظم میں جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

جُدا نہ ہم سے ہوئے خوش جمال ہولی میں

رنگ دھواں دھار ہے گو پچکاریاں چل رہی ہیں مگر معلوم ہوتا ہے ہنری مارٹینی کی باڑھیں ہیں۔ نظیر نے سفید اور زرد کو دو صاحبِ ملک و مال قرار دیا ہے۔ انھی دونوں کے آپس میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ دو پادشاہ در اقلیمے نہ گنجند۔ ایک کہتا ہے ملک چھوڑ دے۔ دوسرا کہتا ہے میں تو نہیں چھوڑنے کا۔ تو لڑ دیکھ۔ دونوں طرف سے فوجی طیاریاں ہوتی ہیں۔ پھر لڑائی کا بازار گرم ہوتا ہے۔ عین جس وقت میں لڑائی کا بازار گرم ہے ایک شوخ نازنین سیر کو آتا ہے۔ مستفسرِ احوال ہوتا ہے اور بیچ میں پڑ کر صلح کروا دیتا ہے

ازبس کہ اس نظم کا مفہوم خیالاتِ فرنگ کے مطابق ہے لہٰذا اگر اُس کے اشعار یہاں نقل کیے جائیں تو غالباً ناگوارِ طبعِ ابنائے زماں نہ ہوگا۔

سبھوں کے عیش کو پھاگن کا یہ مہینا ہے — سفید و زرد میں لیکن کمال کینا ہے
طلا کا زرد کنی سر بسر خزینا ہے — سُفید پاس فقط سیم کا دفینا ہے
ہر ایک دل میں ہے رستم و زال ہولی میں

کہا سُفید سے آخر کو زرد نے یہ پیام — کہ اے سفید تو اب چھوڑ دے جہاں کا مقام
میں آیا اب تو مرا بند و بست ہوگا تمام — تو مجھ سے آن کے مل چھوڑ اپنی ضد کا کلام
دگرنہ کھینچے گا تو انفعال ہولی میں

ملے گا مجھ سے تو میں تُجھ کو پھر بڑھاؤں گا — بنا کے آپ سا پاس اپنے لے بٹھاؤں گا
کہا سُفید نے میں مطلقاً نہ آؤں گا — تُجھی کو بعد کئی دن کے میں بھگاؤں گا
تو اپنا دیکھیو کیا ہوگا حال ہولی میں

یہ سن کے طیش میں آ زرد کا سپہ سالار — چڑھ آیا فوج کو لے کر سُفید پر اک بار
ادھر سُفید بھی لڑنے کو ہو کے آیا سوار — صفیں مقابلہ دونوں کی جب ہوئیں طیار
ہوا کرخت جواب و سُوال ہولی میں

چلا اُدھر سے سُفید اور ادھر سے زرد بہار — گھٹائیں رنگ برنگ فوجوں کی جُھکیں سرشار
پکھالیں مشکیں چُھٹیں رنگ کی پڑی بوچھار — تھی چار طرف سے پچکاریوں کی مارا مار
اُڑا زمیں سے زماں تک گلال ہولی میں

یہاں تو دونوں میں آپس میں ہو رہی یہ جنگ
ہزاروں نازنیں معشوق اور اُس کے سنگ

اُدھر سے آیا جو اک شوخ بارُخِ گُل رنگ
نشے میں مست کھُلی زلف جوڑے رنگ برنگ

کہا کہ پوچھو تو کیا ہے یہ حال ہولی میں

کہا کسی نے کہ ای بادشاہِ مہ رویاں
یہ سُن کے آپ وہ دونوں کے آگیا درمیاں

سفید و زرد یہ آپس میں لڑ رہے ہیں یہاں
اُدھر سے تھا نبا اسے اور اُدھر سے اُس کو کہاں

تم اس قدر نہ کرو اختلال ہولی میں

کہو تمھاری خصومت کا ماجرا ہے کیا
یہ سُن کے اُس نے وہیں اپنا اک منگا جوڑا

کہا سفید نے ناحق یہ زرد سے ہے لڑتا
پھر اپنے ہاتھ سے جوڑے کو چھڑکوا ان رنگوا

کہا کہ دونوں رہو شامل حال ہولی میں

پھر اپنے تن میں جو پہنا وہ خلعتِ رنگیں
ہزاروں لڑکوں نے پہنے وہ جوڑے پھر وہیں

سبھوں کو حکم کیا پہنو تم بھی اب یونہیں
پکاری خلق کہ انصاف چاہیے یونہیں

ہوا پھر اور ہی حسن و جمال ہولی میں*

ٹرنسفر آف اپیتھٹ بھی ایک قسم کا استعارہ بالکنایہ ہے جس کو استعارہ بالاوصاف کہہ سکتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اوصاف جو کسی شے کے ساتھ مخصوص ہیں اُن کو اُس شے سے منتقل کر کے دوسری کسی ایسی چیز کی طرف منسوب کرتے ہیں جس سے اُن کو کسی طرح کی مناسبت نہیں ہوتی اور یُوں بالکنایہ اُس چیز کا اُس شے سے استعارہ کرتے ہیں جو واقع میں اُن اوصاف کی مستحق ہے۔ انگریزی میں اس صنعت کا

* جس طرح اس ہولی میں زرد و سپید کی لڑائی ہے ایک جگہ جوانی اور بڑھاپے کو بھی لڑایا ہے اور ادھیڑ پن کو بیچ میں ڈال کر صلح کرادی ہے۔

بہت رواج ہے۔ لیکن اُردو میں مجھ کو اس کی مثالیں بہت کم ملی ہیں۔ اُنھی معدودے چند میں نظیر کے ہاں کی یہ مثالیں بھی ہیں۔ جہاں نظیر نے کورے برتن کی تعریف کی ہے وہاں ایک مصرعہ یہ لکھّا ہے۔

سوندھی سوندھی ٹھٹھولیاں باندھیں

ٹھٹھولیاں سوندھی نہیں ہوا کرتیں۔ سوندھی مٹّی ہوتی ہے۔ سوندھے برتن ہوتے ہیں۔ یہاں شاعر نے نہایت لطافت سے اپنے لطیفوں کا کورے برتن سے استعارہ کیا ہے۔ مدّعا یہ ہے کہ میرے لطائف لطائف نہیں ہیں بلکہ نُدرت کی وجہ سے کورے برتن جس میں آب داری کی بوند پڑ کر لطافت کی سوندی سوندی خوش بو پیدا کر رہی ہے۔

چوہے کے آچار میں مصرعہ ذیل بھی اسی مذاق میں ہے۔

اور چرپری[1] مُہری کی بھی کیچھڑے ہے ملائی

چرپری اصل میں مرچ یا رائی یا اسی قسم کے اور تیز مصالح کی صفت ہے۔ کیچھڑ کو اس صفت سے موصوف کرنا گویا بالکنایہ اُس کو گرم مصالح قرار دینا ہے۔

ایہام کی صنعت بھی ایک لطیف صنعت ہے اور اس کا قُدما میں بکثرت استعمال ہے۔ امیر خسرو کے نزدیک اس صنعت کی بڑی وقعت ہے اور اُنھوں نے اپنی قوت ایجاد سے اس کی خوبی کے نئے نئے رستے نکال دیے ہیں۔ متأخرین میں صاحب واسوخت امانت نے اس کو اچھی طرح برتا ہے۔ مشہور ہاجی مرثیہ گو مُشیر کے ہاں بھی اس کا برتاؤ کسی قدر پایا جاتا ہے۔ اور جس قدر ہے شوخی کے ساتھ ہے۔ میر انیس کے خاندان نے اس میں کسی قدر لطافت پیدا کی ہے۔ مگر اب موجودہ زمانہ اس پر زیرلب

[1] چرپرا۔ تند۔ چٹ پٹا۔ چٹخارے کا۔ گرم۔ سوزاں۔

ہنسنے لگا ہے۔ ایسی صورت میں نظیر کے ہاں اس کا برتاؤ جس قدر کم ہو اُس کے ہوا خواہوں کے لیے ایک خوشی کی بات ہے۔

باطن نے اپنے تذکرے میں ایہام کی مثال میں یہ اشعار لکھے ہیں۔

کھوری چوٹی ادا میں موٹی جفا میں لنبی وفا میں چھوٹی	ہے اس سے کھوٹی کہ دل ہر اک کا ہر اک لٹک میں لٹک رہا ہے
وہ نیچی کافر سیاہ پٹی نہ دل کے زخموں پہ باندھے پٹی	پڑھی ہے جس نے کہ اُس کی پٹی وہ پٹی سے سرپٹک رہا ہے

اس مثال میں صنعتِ تسجیع کی مثال بھی آگئی اور پہلے شعر میں استعارۂ فرنگ بھی کسی قدر ہے۔

اُور مثالیں۔

تیرِ نگہ کو راہ ادھر دیکھ بھال دو	لکڑی سے پہلے تاڑنے والوں کو ٹال دو
ڈالی سمیت گل کو اُٹھایا تو ہے وہ لے	پہنچے میں نازکی ہے بس اب اسکو ڈال دو
تلوار اُس کے ابرو نے کھینچی میاں نظیر	دل تُم بھی دو بدو ہی کے سانچے میں ڈھال دو

کُچھ مثالیں مجھ سے لیجیے۔

پیسا ہی رنگ رُوپ ہے پیسا ہی مال ہے	پیسا نہیں تو آدمی چرخے کی مال ہے
وہ جو پانی کی کوری گولی ہے	وہی آٹے کے مول کولی ہے
کیا ہی ٹھنڈی دوا کی گولی ہے	کیا کہوں گولی گولی گولی ہے

تازگی۔ الخ

یہ جو گولی کی بولیاں باندھیں	ہم نے پانی کی گُولیاں باندھیں
سوندھی سوندھی ٹھٹھولیاں باندھیں	دل نے پھولوں کی جھولیاں باندھیں

تازگی۔ الخ

کورا پنہاری کا جو ہے مٹکا		اُس کا جوبن کچھ اور ہی مٹکا	

پھبتی۔ تشبیہ اور پھبتی دونوں گویا ایک چیز ہیں۔ لیکن اب استعمال میں پھبتی زیادہ تر اُس تشبیہ کو کہتے ہیں جس میں پہلوِ ظرافت ہو۔ پھبتی ایک زمانے میں ہماری سوسائٹی میں بہت رائج تھی۔ کوئی شخص اُس وقت تک کہ اس فن کا اُس کو کمال حاصل نہ ہو علمِ مجلس میں کامل سمجھا ہی نہیں جاتا تھا۔ نظیر جس سوسائٹی میں اُٹھتا بیٹھتا تھا اُس میں دن رات اسی کا چرچا تھا۔ اُس کی جبلی شوخیِ طبیعت نے یقیناً نئے گُل پھول تراشے ہوں گے۔ مگر افسوس وہ کُل میرے پیشِ نظر نہیں ہیں۔ تلاش کی گُل چینی سے جو ملے ہیں وہ حاضر ہیں۔

(پہلی پھبتی) جوانی کو ہرے رُوکھ سے تشبیہ دی ہے اور بڑھاپے پر اس پیڑ کی پھبتی کہی ہے جس کو نہ فقط پت جھڑ کا صدمہ پہنچا ہو بلکہ سلبِ رطوبت سے جڑ بھی سوکھ گئی ہو۔

بیٹھے تھے پرند آن کے جب تک تھا ہرا رُوکھ		اب کیا ہے جو پت جھڑ ہوا اور جڑ بھی گئی سوکھ	

(دوسری پھبتی) بوڑھے آدمی پر لنڈورے مرغے کی۔

اب آکے بڑھاپے نے کئے ایسے ادھورے		پر جھڑ گئے دم اُڑ گئی پھرتے ہیں لنڈورے	

(تیسری پھبتی)۔ ڈاڑھی پر مکڑی کے جالے کی۔

ڈاڑھی کو پکڑ کھینچ کوئی جھاڑے ہے مکڑی

(چوتھی پھبتی) بڑھاپے کی سیرِ دریا پر خضر کی ملاقات کی۔

دریا کے تماشے کو اگر جائیں تو یار و		کہتا ہے ہر اک دیکھ کے جاتے ہو کہاں کو	
اور ہنس کے شرارت سے کوئی پوچھے ہے بڑھ		کیوں خیر ہے کیا خضر سے ملنے کو چلے ہو	

(پانچویں پھبتی) - جسم پہ جھونپڑے کی -

اپنا نہ مول کا نہ اجارے کا جھونپڑا	بابا یہ تن ہے دم کے گزارے کا جھونپڑا

(چھٹی پھبتی) - جسم پہ ڈربے کی -

اِس میں ہی سب پرند اسی میں چرند ہیں	شا جھونپڑا بھی اب اِسی ڈربے میں بند ہیں

(ساتویں پھبتی) دُنیا پر ٹھگوں کی بستی کی -

ہُشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا	یاں ٹک نگاہ چُوکی اور مال دوستوں کا

(آٹھویں پھبتی) شُہَدا کے سروں پہ تربوز کے ڈھیر کی -

اِس طرح سر کا شہیدوں کے پڑا تھا انبار	جیسے بازار میں تربوز کے اُوپر تربوز

کچھ پھبتیاں ککڑی پہ بھی کہی ہیں - مزے کی ہیں -

کیا پیاری پیاری میٹھی اور پتلی پتلیاں ہیں	گنے کی پوریاں ہیں ریشم کی تکلیاں ہیں
فرہاد کی نگاہیں شیریں کی ہنسلیاں ہیں	مجنوں کی سرد آہیں لیلےٰ کی اُنگلیاں ہیں

کیا خوب - الخ

ٹیڑھی ہے سو تو چوڑی وہ ہیر کی ہری ہے	سیدھی ہے سو وہ یار و رانجھا کی بانسری ہے

تشبیہ تشبیہ کے بغیر تو شاعری ہو ہی نہیں سکتی - مگر مجھے اِس ذیل میں صرف یہ دکھانا ہے کہ نظیر نے نہ تو ملٹن کی طرح لمبی لمبی تشبیہیں اختیار کی ہیں جو تشبیہیں نہیں ہیں بلکہ خیالی پنیورامانہ متاخرین شعرائے ہند کی طرح تشبیہ میں خیالی موشگافیوں سے کام لیا ہے کہ مفہوم موئے کمر کی طرح نقطۂ موہوم بن گیا ہو -

ہوش کی طرح اُڑا — نشے کی طرح چڑھا — نبض کی طرح ... — رنگ کی طرح جما — یہ بھی کوئی تشبیہ ہے۔

تعریف المجہول بالمجہول۔

نظیر کے ہاں تشبیہیں ہیں مگر اعتدال کے ساتھ۔ وہ کبھی کبھی تشبیہوں میں اپنا خاص رنگ بھی بھرتا ہے جو اکثر چٹکیلا ہوتا ہے۔ مثلاً جان کی پودنے سے۔ جب تن سے ہوا ہوگئی وہ پودے سی جان پرانے مرغِ تن درحبیں ایں پودنے سے نئی جان آگئی ہے۔۔

جاتا تھا سُرخ جوڑے میں تن یوں جھمک دکھا — گویا شفق میں آن کے بجلی چمک پڑی

استعارہ۔ اس کی اور قسمیں تو اوپر بیان ہو چکیں۔ اس میں اور تشبیہ میں کچھ زیادہ فرق نہیں صرف حرف تشبیہ کی دوری حدِ فاصل ہے۔ حقیقت میں استعارہ بھی تشبیہ ہے مگر بالکنایہ۔ استعارے کی یوں تو نظیر کے کلام میں بہتیری مثالیں ہیں۔ مگر مجھے صرف اُن استعاروں سے غرض ہے جو کسی اور سے مستعار نہیں۔

بنجارہ نامے میں یہ چند استعارے نظیر کے خاص ہیں۔

اجل کا قزاق۔

قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا — قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گرا دے گا

مرگ کا ہانکنے والا بدن کا بیل۔

جب مرگ پھرا کر چابک کو یہ بیل بدن کا ہانکے گا

روح کا نایک۔

جب نایک تن سے نکل گیا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے

	پھر ہانڈا ہے نہ بھانڈا ہے نہ حلوا ہے نہ مانڈا ہے	

اجل کے چند استعارے اُس نظم میں بھی خاصے ہیں جس میں عارفانہ رنگ میں بے ثباتی دنیا کی تصویر کھینچی ہے۔

اجل کی توپ۔

جب توپ نے اجل کی آمورچہ لگایا	سب اُڑ گئے ہوا پر کوئی کام نہ آیا

مرگ کا شیر خاں اور قضا کا پنجہ۔

پنجہ اُٹھا قضا کا جب اے شیر خاں جی	پھر کس کے شیر خاں جی کس کے وزیر خاں جی

اجل کا تیس مار خاں۔

آیا قدم اجل کے جب تیس مار خاں کا	خبر بھی کہیں نہ دیکھا پھر شہسوار خاں کا

قضا کا راج۔

جب راج نے قضا کے کرنی بسولی ٹانکی ڈھلاتے تھے واں مزدور تو تن کی محل سرا اس میں قضا کا راج جو کوٹھے پہ آچڑھا	اک اینٹ بھی نہ پائی ہر گز کسی مکاں کی پر گھر بنا رہے تھے دوالیں اُٹھا اُٹھا شہتیر سا وہ قد تھا سو خم ہو کے جھک گیا

	گرنے لگی کڑی پہ کڑی تب خبر پڑی	

اجل کا فوج دار۔

لے کر سند اجل کا جب فوج دار آیا	اک دن میں حکم و حاصل سب ہو گیا پرایا

اجل کا یکہ تاز اور اُس کا کتک۔

آیا کٹنگ اجل کے جب یکہ تاز خاں کا	سر بھی کہیں نہ پایا پھر سرفراز خاں کا

قضا کا مردھا۔

آیا قضا کا مردھا جس دم چھڑی اٹھا کر	کتوالی اور صدارت سب اڑ گئی ہوا پر

قضا کا بانکا۔

جب گھور کر قضا کے بانکے نے آکے جھانکا	ٹیڑھا رہا نہ ترچھا گنڈا رہا نہ بانکا

اجل کا دیو۔

جب دیو کا اجل کے سایہ ہوا مقابل	ملّا رہا نہ سیانا عالم رہا نہ فاضل

قضا کا ترسول اور وقت کا مہا دیو۔

ترسول لے قضا کا جب وقت سر پر آیا	نے بالکے کو نہ تھا ماننے آپ کو بچایا

کچھ استعارے ضمناً اوپر بھی بیان ہوئے مثلاً پلکوں کا استعارہ پنکھے سے یا کونڈی خشکے کا نقارے اور ڈنکے سے۔

بڑھاپے کی شراب۔

آئی شراب اس میں بڑھاپے کی خواہ مخواہ	پہلے کے جام میں نہ ہوا کچھ نشہ تو آہ
دل برنے دی جب اُس سے کڑی تب خبر پڑی	

تبسم کی شکر۔

نہ بولا منھ سے ہرگز دیکھ کر وہ خوش دلی میری	مگر کچھ کچھ تبسم کی شکر لب سے لگا ملنے

عشق کا بازیجرا

چاہے اگر اُڑانا عشرت کا باز جُرا		تو پہن ہار بدّھی اور سر پہ رکھ کے طُرّا

پی عاشقوں میں۔ الخ

اشک کی شیشی۔

پھنکی نکلتی ہیں اشکوں کی شیشیاں یارب		ہمارے سینے میں کس شیشہ گر کی بھٹّی ہے

کنایہ۔ یوں تو کنایہ ہر جگہ ہے۔ تشبیہ میں کنایہ۔ استعارے میں کنایہ۔ ضلع میں کنایہ۔ جُگت میں کنایہ پھبتی میں کنایہ۔ ایلگری میں کنایہ۔ ٹرنسفر آف ایتھٹ میں کنایہ غرض وہیں کنایہ ہے جہاں کوئی بات ذرا بھی پردے میں بیان کی گئی ہے۔ لیکن یہاں میری غرض صرف اُس کنایے سے ہے جو نہ لفظی گُل اندام بلکہ کسی خاص شاہد مطلب یا واقعہ کو خوش نما چلمن کی آڑ میں بٹھاتا ہو۔ مثالوں سے یہ مطلب زیادہ روشن ہوگا۔

مثالیں۔

صبح ہونے کا کنایہ۔

	جب آنکھ سے سورج کی ڈھلا رات کا کجرا

لُطف وصل کا کنایہ۔

گُل سا ملا وہ مجھ کو نیا گدگدا بدن		رگ رگ میں میری چھٹ گئی عشرت کی پھلجھڑی

مبالغہ۔ بالغ نظر جانتے ہیں کہ مبالغہ نظیر کی طرز سے کس قدر دور ہے مگر پھر بھی شاعری کا ایک زیور ہے اور قیمتی زیور ہے۔ ہاتھ سے کیوں کر دے سکتا تھا۔ زیادہ تر تو بے پروائی کے بکس میں بند پڑا رہتا ہے مگر نمائش کے بیسیوں موقع ہیں۔ کبھی نکل بھی آتا ہے۔ شاہد معنی کا ماتھا چومیے جس کے صدقے میں جگمگاہٹ

ہماری نظر میں بھی ہے۔

پڑھ علم ریاضی جو منجّم ہوے دھومی	پیشانی مہ و زہرہ و برجیس کی چومی
آواز سے واقف ہیں اشاروں سے خبر ہیں	پروانہیں ہم شہپرِ عنقا سے نظر ہیں
اور ہے دو دھارے کی بھی کچھ اور آن بان	حیراں ہو جس سے تیغ نگاہ پری رُخاں
اُڑتا پہاڑیے کا بھی ہے اس قدر بلند	اُکھڑے تو پھر فلک پہ ہو پانا پتنگ کا
سو بار حریرِ اُس کا مسکا نگہ گُل سے	شبنم سے کب اے بلبل پیراہن گُل مسکا
نام سے اُس گُل کے ہیں لب ریزِ شہد	خُلد کے حُورانِ شکرخا کے لب

سچا مبالغہ۔

عشق میں اُس گوہرِ نایاب کے	آج تلک خشک ہیں دریا کے لب

قافیہ۔ قافیے کے متعلق نظیرؔ کے ہاں کئی صنائع ہیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ مردف طرحوں میں ردیف قافیے کو ملا کر ایک کر لینا۔ جیسے کاجل نے اور آنچل نے کی طرح میں چلنے اور ٹلنے کا استعمال۔

(۲) دوسرے اس بات کا لحاظ رکھنا کہ قافیے چُست ہوں۔ اکثر اُن شگفتہ زمینوں میں جن میں قافیے بہت ہیں مشکل قافیوں کو اختیار کرنا۔

(۳) اکثر اُن قافیوں کو اختیار کرنا جو فقط مشکل ہی نہیں بلکہ گنتی میں بھی کم ہیں۔ جن کو ایک بند میں باندھنا گویا امیر خسروؔ سے بہتر امیلیاں بنانا ہے۔

(۴) اکثر قافیوں میں اس پہلو کو اختیار کرنا کہ سامعے پر ایک اچھا اثر پڑے۔ یعنی قافیوں میں جھول

موسیقی کی رعایت۔

(۵) اکثر مُتبذل قافیوں کو اپنی بندش کی تہذیب سے مُہذب اور مُعزّز بنانا۔ پہلی صنعت کوئی بہت بڑی صنعت نہیں۔ کم و بیش ہر شاعر نے اُس کا استعمال کیا ہے۔ دوسری صنعت کا بھی علیٰ ہذا یہی حال ہے۔ مگر باقی تین صنعتیں نظیر ہی کا حصہ ہیں۔ اِس سے بہتر ان صنعتوں کا کسی نے آج تک استعمال نہیں کیا۔ بعض جگہ یہ اِس قدر کا وزوری کر جاتا ہے کہ قافیے گنتی میں پُورے چار بھی نہیں کہ بند کو کافی ہوں مگر خواہ مخواہ اُنھی پر طبیعت آزماتا ہے بعض جگہ زبردستی کے قافیے بنا لیتا ہے اور بعض جگہ ہارے درجے معمولی قافیوں سے کمی پُوری کرتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض بندوں میں پہلے شعر کے قافیے اَور ہیں اور دوسرے کے اَور مثلاً۔

چمگادڑ ابابیل کی ڈانٹیں بھی پڑی ہیں		اُلّو کے پر اور گدھ کی انٹیں بھی پڑی ہیں	بلبلیں
سر کوّوں کے اور چیل کی آنتیں بھی پڑی ہیں		گوبر کی ڈلی بیٹ کی کھاتیں بھی پڑی ہیں	

کیا زور ۔ الخ

موسیقی اثر قافیوں کی مثالیں نظیر کے مذاقِ موسیقی کی بحث میں بھی کچھ دی گئی ہیں اور کچھ اس بحث میں بھی ضمناً اوپر بیان ہوئی ہیں۔

جنگ نامۂ خیبر پُورے کا پورا دقتِ قافیہ کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ ہم یہاں صرف اُس کے ایک بند پر اکتفا کرتے ہیں۔

تھیں شاہ کی جرأت کی یہاں تک تو ترنگیں		سب کانپ گئیں قلعۂ خیبر کی النگیں
کتنے تو وہاں بھاگ گئے مار شلنگیں		اور کتنے گئے بھول وہاں آن کے جنگیں

ہر گبر کو پھر تپ سے چڑھا آن کے جاڑا

خوفِ طوالت مانع ہے ورنہ ہم ہر ایک کی مثال جدا جدا لکھ دیتے۔ جن صاحبوں کو تصدیق منظور ہو کلیات کی طرف رجوع کریں۔ اکثر نظمیں میرے بیان کی کافی شہادت دیں گی۔ ایک لطف قافیے کا یہ بھی ہے کہ شعر تمام کرنے سے پہلے قافیہ ذہن میں آجائے۔ ایسے قافیے کو بوادر القافیہ کہتے ہیں اگر یہی صنعت ردیف میں ہو تو اس کو پکارتی ہوئی ردیف کہیں گے۔ علی بن ہارون اس صنعت کا موجد ہے اور اس نے اس کو تسہیم کا خطاب دیا ہے۔ اردو کے شعرا میں ذوق کے ہاں یہ صنعت بہت زیادہ خوبی کے ساتھ برتی گئی ہے کچھ مثالیں نظیر کے ہاں بھی موجود ہیں۔

جب سے موا ہے کوہکن کرتے ہیں اس کا غم سدا	کوہ سے کوہ جو سے جو سنگ سے سنگ ہل سے سِل

صنعت لف و نشر و تقسیم و توالیِ صفات۔ یہ تینوں صنعتیں نظیر کی اس غزل میں موجود ہیں جس میں ایک ہی ساتھ سعدی عبدالواسع جبلی اور امیر خسرو سب کا جواب ہے۔ سعدی کی وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

بربود دلم در چمنے سرو روانے	زرّیں کمرے سیم برے موے میانے

اس میں صفتوں کی لڑی اس تسلسل کے ساتھ پروئی گئی ہے کہ ہر جوہری کی اس پر نظر پڑتی ہے۔ نظیر نے اس کو خمسے کے زیبِ گلو کر کے ایک لڑی خود بھی پروئی۔ اچھی ہے یا بری اس کا فیصلہ جوہر شناس کریں۔ میں یہاں صرف نقل کیے دیتا ہوں۔

کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشکِ چمن	گل رخ و گل گوں قبا و گل عذار و گل بدن[1]
مہر طلعت زہرہ پیکر مشتری رو مہ جبیں	سیم بر سیماب طبع و سیم ساق و سیم تن

[1] یہ مصرعے الٹریشن کی مثال بھی پیش کرتے ہیں۔

نازنیں نازآفریں نازک بدن نازک مزاج	غنچہ لب رنگیں ادا شکر دہاں شیریں سخن
تیر قد نشتر نگہ مژگاں سناں ابرو کماں	برق تاز و رزم ساز و نیزہ باز و تیغ زن
بے مروّت بے وفا بے درد بے پروا اخرام	جنگ جو قتّال وضع ہمسر فراز و سر فگن
زلف و کاکل خال و خط چاروں کے یہ چاروں غلام	مشکِ تبت مشکِ چیں مشکِ خطا مشکِ ختن
دوش و بر دندان و لب چاروں سے یہ چاروں خجل	نسترن برگِ سمن دُرِّ عدن لعلِ یمن
سختی و بے رحمی و جور و جفا سرکار کی	معتمد موحی الیہ و مستشار و موتمن
مبتلا ایسے ہی خوش وضعوں کے ہوتے ہیں نظیر	بے قرار و دل فگار و خستہ حال و بے وطن

لف و نشر کی یہ مثال بھی اچھی ہے۔

تمہارے ہاتھ نے مہندی نے انگشتوں نے ناخن نے	گلستاں کی چمن کی باغ کی گلزار کی راکھی

ایک اور

کفوں میں انگلیوں میں لعل لب میں چشم مرگوں میں	حنا آفت ستم فندق مسی جادو فسوں کاجل

صنعتِ مکالمہ۔ نظیر کی ایک غزل صنعت سوال و جواب میں بھی ہے جس کو میں صنعتِ مکالمہ سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ ایک عمدہ صنعت ہے اور اگر وسعت کے ساتھ اس کا برتاؤ کیا جائے تو اردو کی نظم میں ایک خاص سحرشل لب و لہجہ پیدا ہو سکتا ہے

کہا جو ہم نے ہمیں در سے کیوں اٹھاتے ہو	کہا کہ اس لیے تم یاں جو غل مچاتے ہو
کہا اٹھاتے ہو کیوں ہم سے غیر کو ہمدم	کہا کہ تم بھی تو ہم جیسے نگ لڑاتے ہو
کہا جو حال دل اپنا تو اس نے ہنس ہنس کر	کہا غلط ہیں یہ باتیں جو تم سناتے ہو

کہا جتاتے ہو کیوں ہم کو زورِ ناز و ادا	کہا کہ تم بھی تو چاہت ہمیں جتاتے ہو
کہا کہ عرض کریں ہم پہ جو گزرتا ہے	کہا خبر ہے ہمیں کیوں زباں پہ لاتے ہو
کہا کہ روٹھے ہو کیوں ہم سے کیا سبب اس کا	کہا سبب ہے یہی تم جو دل چھپاتے ہو
کہا کہ ہم نہیں آنے کے یاں تو اُس نے **نظیر**	کہا کہ سوچو تو کیا آپ سے تُم آتے ہو

گو لوگوں نے نہیں گنا مگر میرے خیال میں ایراد الامثال بھی ایک طرح کی صنعت ہے۔ یہ گویا شعبہ ہے اقتباس اور تلمیع کا۔ اقتباس میں کوئی فقرہ قرآن یا حدیث کا لیا جاتا ہے اور تضمین کیا جاتا ہے تلمیع میں غالباً فقرہ اپنا ہوتا ہے مگر زبان اَور مثلاً اُردو میں عربی فارسی کا فقرہ یا فارسی میں عربی اُردو کا فقرہ ایراد الامثال تضمین ہے ضرب المثل کی۔ اقتباس اور تلمیع کی مثالیں کُچھ غزلوں میں موجود ہیں۔ کچھ انشا کی بحث میں درج ہوئیں۔ ایراد الامثال کی مثال نظیر کی کتاب الامثال سے جتنی چاہیے لے لیجیے۔ تضمین میں گو ایراد الامثال تلمیع اقتباس سب داخل ہیں مگر اب زیادہ تر اس کا اطلاق اُس صنعت پر ہوتا ہے جو اور اساتذہ کے اشعار کو قطعہ مخمس مسدس وغیرہ کے چوکھٹے میں جڑ کر دکھاتی ہے۔ اِس سے نظیر کا سارا کُلیات بھرا پڑا ہے۔ سب سے عمدہ مثال اِس کی جوگی نامہ ہے جس میں اُستاد کے اِس شعر کی نہایت رنگین تضمین ہے۔

اشتیاقے کہ بدیدارِ تو دارد دل من	دل من داند و من دانم و داند دل من

اب ہم اِس بحثِ صنائع کو ختم کرتے ہیں مگر قبلِ ختم یہ کہ دینا بہت ضروری ہے کہ ایسا گمان نہ ہو کہ سوا اُن صنائع کے جن کا ذکر اُوپر ہوا نظیر کسی اور صنعت کا برتاؤ جانتا ہی نہ تھا۔ جتنی مثالیں اُوپر دی گئی ہیں وہ اِس بات کے دکھانے کو کافی ہیں کہ وہ علمِ معانی و بدیع میں بھی کامل دستگاہ رکھتا تھا۔ گو وہ اکثر اِس کا برتاؤ نہیں کرتا مگر جب کرتا ہے اُستادِ کامل و ہنرورِ ماہر نظر آتا ہے۔

صنائع جو نظیر کے کلام نہیں ہیں یہ ہیں۔

(۱) ترصیع (۲) مقلوبِ مستوی (۳) صنعت مہملہ (۴) صنعت منشاری (۵) صنعت رقطا (۶) صنعت رقشا (۷) صنعت مقطّعات (۸) صنعت دورو (۹) ایہام ذوالوجوہ (۱۰) ایہام لسانین (۱۱) صنعت توشیح (۱۲) صنعت منقوط۔

بہتر ہو کہ اس بحث کو حسنِ خاتمہ پر جس کو حسن القطع بھی کہتے ہیں تمام کیا جائے۔ میرے خیال میں اس قدر عُمدہ مثال حُسنِ خاتمہ کی مُشکل سے ملے گی۔

واں کوئی آیا لیے ایک مرصّع پنجرا	لال دستار دوپٹّا بھی ہرا جوں طوطا
اُس میں اک بیٹھی وہ مینا کہ ہو بُلبُل بھی فدا	میں نے پُوچھا یہ تمھارا ہے رہا وہ چپکا

"نکلی منقار سے مینا کی صدا آپ ہیکا"

کلامِ نظیر کے عیوب

نظیر کے زمانے سے آج تک زبانے نے بہت ترقّی کی ہے۔ اور یہ بات کوئی ہماری ہی زبان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہر زبان میں ترقّی کی رفتار یوں ہی واقع ہوئی ہے۔ بہت سی ترکیبیں جو اُس وقت عام تھیں۔ اب بالکل معیوب ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ آتا ہے اور جاتا ہے کی جگہ اُس وقت آوے ہے اور جاوے ہے ہر شاعر کی زبان پہ تھا۔ تتبّع سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوق اور غالب کے ہاں بھی اوائل میں یہ روزمرہ موجود ہے۔

(ذوق)	رخصت اے زندانِ جنوں زنجیرِ در کھڑکاوے ہے		مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلاوے ہے
(غالب)	سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسد		پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جاوے ہے

کچھ اور مثالیں :۔

(مومن)	یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکاوے تھا		تھے غلط پیغام سارے کون یاں تک آوے تھا
(شوق)	سانپ کی سی لہر اک دل پہ مرے پھر جاوے ہے		یاد آوے ہے جب اُس کی زلفِ بل کھائی ہوئی
(ظفر)	ٹھہرتے ہی نہیں ہیں آنچ پہ سوزِ محبت کی		رکھے ہیں اس زمانے میں خواص اُحبابِ پارے کا
	تلکے ہے زاہد شرابِ گُلگوں جو اہی دل بھی خراب آدھا		کھلادے ساقی بلا سے اُس کو ڈبو کے تو بھی کباب آدھا
			(منشی سید احمد دہلوی صاحب فرہنگِ آصفیہ)

اصلاحِ زبان میں اہلِ لکھنؤ کسی قدر اہلِ دہلی سے گوئے سبقت لے گئے۔ جو اصلاح کہ لکھنؤ میں ناسخ ہی کے

زمانے میں شروع ہوگئی تھی اُس پر اہلِ دہلی کو کہیں اب جاکے خیال ہوا ہے۔ اسی واسطے دہلی والوں کے کلام میں ابھی تک بعض الفاظ ہیں جن کو اہلِ لکھنؤ ساقط الاعتبار جانتے ہیں۔ کبھو کا لفظ میں نے شعراء لکھنؤ میں سے کسی کے کلام میں ناسخ سے لے کر شعراء موجودہ تک نہیں دیکھا۔ حال آنکہ غالب اور ذوق دونوں کے ہاں موجود ہے۔

(ذوق)	مرے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے		مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

طُرفہ یہ کہ ہمارے زمانے کے فخر شاران مولٰنا نذیر احمد نے بھی بیگانہ خو نہو، تو نہ ہو کی طرح میں کبھو نہ ہو کسی موقع پر باندھ دیا ہے۔

دولت مدارِ رونقِ باغِ جہان ہے	زر ہو، بلا سے رنگ نہ ہو گُل میں بو نہ ہو
دُنیا میں مُفلسی مرضِ لاعلاج ہے	اِس طرح کے مریض کو صحّت کبھو نہ ہو
	(مولوی نذیر احمد کے لکچروں کا مجموعہ)
وہ نشاں جن کی چمک تھی بے بقا مثلِ شہاب	گہ نظر آے اٹک پر اور ستلج پر کبھو
	(مجموعۂ نظم حالی صفحہ ۱۱۵)

غالب علیہ الرّحمۃ نے تو کبھو سے گزر کر ایک جگہ کسو بھی باندھ دیا ہے۔ مطلع ہے۔

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی	لِکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

اِس غزل کا تیسرا شعر ہے۔

کیوں ڈرتے ہو عُشّاق کی بے حوصلگی سے	یاں تو کوئی سُنتا نہیں فریاد کسو کی

کیوں کہ کیوں کر کے معنوں میں سودا امیر کے ہاں تو عام ہی۔ ذوق و غالب بھی اِس کو کوئی معیوب

روزمرہ نہیں جانتے۔ حالی نے بھی اِس کو جائز رکھا ہے۔ تک کے لفظ پر بعض بہت زیادہ صفائی ڈھونڈھنے والے معترض ہیں۔ لیکن اہل دہلی اور اہلِ لکھنؤ دونوں کے ہاں آج تک موجود ہے۔ سو پر بھی اعتراض ہے لیکن اِس نے بھی ابھی تک روزمرے کا دامن نہیں چھوڑا۔

اِصلاح ہر چند عمدہ چیز ہے لیکن بعض وقت بہت زیادہ نفاست بھی اچھّی نہیں۔ گو اب دہلی اور لکھنؤ دونوں شہر کے فُصحا کے نزدیک یہ ترکیب معیوب ہی کہ جمع موصوف کے لیے صفت بھی بصیغۂ جمع ہی لائی جائے لیکن اساتذہ کے کلام میں یہ ترکیب ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ بعض مقام پہ واقع ہوئی ہے کہ اِس کا بہ سبیل جواز قائم رکھنا مناسب ہی۔ (سودا)

باتیں کدھر گئیں وہ تری بھولی بھولیاں		دل لے کے بولتا ہے جواب تو یہ بولیاں

ایک صیغہ جمع مؤنّث کا ہے کھولیں۔ پڑیں۔ ملیں۔ گڑیں۔ اور دوسرا صیغہ ہے گڑیاں۔ ملیاں۔ پڑیاں۔ کھولیاں۔ میری رائے میں جوازاً اِس صیغے کو بھی قائم رکھنا تھا۔

(سودا)

ہنوز آئینہ گرد اُس غم سے اپنے منھ کو ملتا ہے	خُدا جانے کہ کیا کیا صُورتیں اس خاک میں گڑیاں
چھُری تلوار رہیں یکدگر گُل و بلبل ہیں گلشن میں	تمھاری سچ کہو دونوں میں کس سے انکھڑیاں الڑیاں
گتھی نکلی ہیں لختِ دل سے تارِ اشک کی لڑیاں	یہ انکھیاں کبھو یں مرے جی کے گلے کی ہار ہو پڑیاں
حیرت نے اِس کو بند نہ کرنے دی پھر کبھو	آنکھیں جب آرسی نے ترے منھ پہ کھولیاں

(میر)

بارہا عدووں کی راتیں آئیاں	طالعوں نے صُبح کر دکھلائیاں

عشق میں بلائیں سب سے پائیاں
رہ گئے آنسو تو آنکھیں آئیاں

اُس ستمگر نے ستم ڈھائے بارہا
عاشقوں میں برچھیاں چلوائیاں

ایک [illegible] آتش سحر کی سی کی
آنکھیں تاروں نے بہت چمکائیاں

فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا
مری آہ نے برچھیاں ماریاں

درویشوں تو ان نے ضدیں نکالیاں ہیں
ادھر سے ہیں دعائیں اودھر سے گالیاں ہیں

جب سے سینے تک ہیں کیا کیا خراشِ ناخن
گویا کہ ہم نے منہ پر تلواریں کھالیاں ہیں

جب لگ گئے جھمکنے رخسارِ یار دونوں
تب مہروسہ نے اپنی آنکھیں چھپالیاں ہیں

وہ دردِ دل نہیں تو کیوں دیکھتے ہی مجھ کو
پلکیں جھکالیاں ہیں آنکھیں چرالیاں ہیں

انشا۔

کچھ نگاہیں تری ایسے ہی ہنر سے لڑیاں
کہ جھڑیں نور ہی کی قرص قمر سے لڑیاں

وہ جو چلون سے کوئی شخص ادھر جھانکے ہے
پھرنیاں اُس کی مرے دیدۂ تر سے لڑیاں

کیوں کر نہ گدگداہٹ ہاتھوں میں اُس کے اُٹھے
وہ گوری گوری رانیں جس نے دبائیاں ہوں

ممکن ہے کوئی ہم سے افشائے راز ہووے
سو بار ٹھنڈی سانسیں گو لب تک آئیاں ہوں

کیوں کر جنوں مجسّم ہو کر نہ دے دکھائی
جب شوشوں نے دل کی دھومیں مچائیاں ہوں

مر جائیے نہ کیوں کر ایسے پہ، ہوئے ظالم!
جسمیں اکٹھی اتنی باتیں سمائیاں ہوں

جب ہوئیں پریاں ہوا کھانے کو کھڑیاں باغ میں
خود بخود بجنے لگیں غنچوں کی گھڑیاں باغ میں

کبھی نہ اس رخِ روشن پہ چھائیاں دیکھیں
نصیر — گھٹائیں چاند پہ سو بار چھائیاں دیکھیں

خون سے پھر اُن کے رنگیں ہم نے گلیاں دیکھیاں	رنگ محلوں میں جنھوں نے رنگ رلیاں دیکھیاں

(ظفر)

جمع صفت کی خوش اسلوبیوں کی مثال میر کے کلام سے بھی لیجیے۔

اُس آفتاب بن یاں اندھیر ہو رہا ہی	دن بھی سیاہ اپنے جون راتیں کالیاں ہیں
چلتے ہیں یہ، تو ٹھوکر لگتی ہی میرے دل کو	چالیں ہی دل بروں کی سب سے نرالیاں ہیں

مولوی نذیر احمد نے بنات النعش میں ایک جگہ یہ فقرہ لکھا ہی۔

بعضیاں خالی پیلی بھی اتراتیاں تھیں - دہلی کی عورتوں کی یہ ہر وقت کی بول چال ہی۔ پھر اس کو یک قلم زبان سے خارج کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

قاآنی جو زبان فارسی کے شعراء متاخرین میں مجدد ہو گزرا ہی اُس نے قدیم شعراء فارس کے تمام محاورے قائم رکھے ہیں - اور اُن کو نہایت آزادی کے ساتھ اپنے کلام میں استعمال کرتا ہے - حقیقت یہ ہی کہ جن لوگوں کے خیالات وسیع ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر طرح کے خیالات نظم میں ظاہر کریں وہ کبھی اس کو پسند نہیں کر سکتے کہ خواہ مخواہ زبردستی کے قیود بڑھا کر زبان کو تنگ کیا جائے - غزل گوئی کے لیے شاید تھوڑی وسعت کافی ہی اور اُس میں اعلیٰ سے اعلیٰ نفاست کسی قدر نبھ سکتی ہی لیکن قصائد اور مخمس اور مسدس و دیگر اصناف کلام میں جن میں شاعری صرف دو مصرعوں میں محدود نہیں وسعت زبان کو نفاست کے سخت قاعدوں سے تنگ کرنے سے خیالات کی وہ روانی باقی نہیں رہتی اور لطف زبان ہاتھ سے جاتا رہتا ہی - لکھنؤ میں گو ترکیبیں بہت چست اور صاف ہیں لیکن لطف زبان نہیں - روانی خیالات نہیں - جیسے اُن کے اخلاق اُن کی اوضاع اُن کی بات چیت میں تکلف بھرا ہوا ہی ویسے ہی اُن کی شاعری میں بھی - لکھنؤ کے مسلم الثبوت شعرا کے کلام کو

دیکھیے تو زیادہ تر فارسی کے شعرا کے خیالات کا عمدہ شستہ بے عیب ترجمہ معلوم ہوگا لیکن اس میں لطفِ زبان بہت کم ہوگا۔ تکلف کے سبب زبان کے قدرتی چوچلوں کا کہیں اس میں پتا بھی نہ ہوگا۔ دہلی میں چوں کہ تکلفات اس حد تک نہیں پہنچائی گئی ابھی تک لطفِ زبان باقی ہے۔ اور خیالات میں وہی قدرتی روانی پائی جاتی ہے۔ مجھ کو لکھنؤ کے شعرا میں مصحفی اور انشا تک پسند ہیں۔ بعد اس کے شاعری نہیں ہے ترجمہ ہے۔

نظیر کے کلام پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ عام لوگوں کے محاورات لکھتا ہے۔ یہ اکثر صورتوں میں سچ ہے لیکن یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ ان محاورات کا وہ کن موقعوں میں استعمال کرتا ہے۔ وضع الشئ فی محلہ ہے یا نہیں۔ جب کبھی وہ عام لوگوں سے مخاطب ہے انھی لوگوں کا روزمرہ لکھتا ہے۔ جب خواص کی طرف رخ کرتا ہے انھی کے محاورات میں کلام کرتا ہے۔ غزلوں میں اس کی وہ روزمرہ نہیں ہے جو مخمس مسدس وغیرہ میں ہے۔ اس سے زیادہ کوئی مہمل بات نہ ہوتی کہ وہ جوگی نامہ یا جوگن نامہ مشائخ کی اصطلاح میں لکھتا۔ یا بنجارہ نامہ میں ایران کے ملک التجار کے محاورات سے کام لیتا۔ جس کو لوگ عیب بتاتے ہیں واقع میں اس کا ایک بہت ہی بڑا ہنر ہے۔ وہ جس طبقے سے مخاطب ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُن کی زبان کا پورا ماہر ہے اور اُن کے خیالات میں اس طرح رنگا ہوا ہے کہ اُس وقت خاص کے لیے اُسی طبقے کا ایک شاعر ممبر معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے تو اس کا کوئی کلام اثر سے خالی نہیں جاتا۔ کنھیا جی کا جنم۔ یا اور چیزیں جو ہندوؤں اور مہاجنوں اور نانک شاہیوں کے مذاق کے مطابق لکھی ہیں اُن کو پڑھ کر کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ کسی مسلمان شاعر نے لکھا ہے۔ ایک مسلمان شاعر کے لیے ہندوؤں کے خیالات اور زبان سے اس قدر واقف ہونا شاعری نہیں کرامات ہے۔

غزل میں نظیر بہت ہی سلجھے ہوئے ہیں۔ ترکیبوں میں متانت۔ بندش میں صفائی۔ تعقید سے دور۔ زیادہ تر شستہ اور پاکیزہ الفاظ اور سامعہ نواز دلچسپ محاورے۔ عاشقانہ مضامین کے لیے سراپا موزوں۔ کہیں جو اس میں آزادوں کا لہجہ شامل کر دیتے ہیں تو وہ شوخی طبع کا تفنن ہے اور خالی از لطف نہیں۔

لیلیٰ مجنوں جو ان کی نظموں میں نہایت مقبول نظم ہے اُس کی شیرینیٔ زبان سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ چوں کہ دل میں درد پیدا کرنے والا حسرت زدہ اور اُداس افسانہ ایک عاشقِ صادق کی غم زدگی کا ہے کس طرح اُس کو اُسی درد پیدا کرنے والے اُداس اور غم زدہ لہجے میں بیان کیا ہے اور کس طرح شروع سے اخیر تک، باوجودے کہ ظرافت اُس کی طبیعت کا جبلی جوہر ہے، متانت کو قائم رکھا ہے۔ اسی طرح جو نظم لکھی ہے اُس کے مضمون کی رعایت سے اُس کی زبان اور لہجے کا فیصلہ کیا ہے۔ پس جو شخص اس نظر سے نظیرؔ کے کلام کو دیکھے گا اُس کی آنکھ میں وہ اعتراض (کہ عام محاورے اُس کے کلام میں بہت ہیں) آپ سے آپ اُٹھ جائے گا۔

اب شاعرانہ حیثیت سے جو اعتراضات ہوتے ہیں اُن کا جواب ملاحظہ کیجیے۔ ایک بڑا اعتراض تو یہ ہے کہ بعض حرف جن کا تقطیع میں گرنا اُستادوں نے ناجائز رکھا ہے مثلاً ہے۔ ے۔ عین۔ ن۔ اس قسم کے حروف اُس کے کلام میں تقطیع سے گر جاتے ہیں۔

(الف) اسقاطِ ع -

(۱)	ایسی نہ شب برات نہ بقر عید کی خوشی	جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی
(۲)	کسی وقت مکتبِ عقل میں بہت علم ہم نے بھی تھا پڑھا	کہ ہر اک سے حجّت و بحث تھی سو اُس علم کا یہ کمال تھا
(۳)	اُس خواب میں مجھے اک عمارت نظر پڑی	
(۴)	ہم تو پھرتے ہیں نظیرؔ عشق میں اب خانہ بدوش		[illegible]
(۵)	کیا کیا میں کہوں اُس کی اب عیاری کا مذکور	بوسے کی طلب کی تو کہا ناز سے چل دور
(۶)	اسی سے یاں نظیرؔ عزت اسی سے واں شفاعت ہے	
(۷)	کپڑے پھٹے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی	تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی

نمبر	مصرع	مصرع	
(۸)	گڈہ توپ پہکلا توپ قلعہ کیا سیسہ دارو کیا گولا		
(۹)	دیکھ عقدِ ثریا ہمیں انگور کی سوجھی	کیوں بادہ کشو ہم کو بھی کیا دور کی سوجھی	
(۱۰)	بنی اور نتھ کا وہ عالم کہ چھدے دل جس سے	حورِ جنّی کی جھلک گوہرِ غلطان پہ پری	
(۱۱)	خوشی کی دھوم سے ہر گھر میں رنگ بنوائے	گلال عبیر کے بھر بھر کے تھال رکھوائے	
(۱۲)	بہار چھڑکواں کپڑوں کی جب نظر آئی	ہر عشق باز نے دل کی مراد بھر پائی	
(۱۳)	کیا غُصّے میں منہ اک بار سرخ عیّارہ چپل نے		
(۱۴)	جب منہ اجل کا دیکھا پھر کچھ بھی بن نہ آیا	یکتا شجاع بہادر صفدر رہا تو پھر کیا	یہ؟ نا
(۱۵)	ہم بھی ہوا کی لہر میں پیتے تھے مے بڑھا بڑھا	دیکھ ہمیں اس عیش سے سینہ فلک کا پھٹ گیا	
(۱۶)	[illegible] تاش مشروعِ تن زیب خاصہ ململ		
(۱۷)	ملتا نہیں کنار کچھ عشرت کے بحر کا		
(۱۸)	جوڑے چمن بہار ہیں پیسے کے واسطے	گہنے مرصع کار ہیں پیسے کے واسطے	
(۱۹)	فلک پہ تاروں کی کیا کیا مرصع کاری کی	پھر اُن میں زیب فزا کہکشاں نگاری کی	
(۲۰)	ہی یہ نظیر یہاں قریں جانے ہی باصدق و یقیں	ہو گی تیرے ہی فضل سے ہر جا مری کھوٹی کھری	
(۲۱)	کھانے کو ملا کم تو اُسی کم میں رہے خوش	جس طور کہا اُس نے اُس عالم میں رہے خوش	
(۲۲)	اُن کے تو جہاں میں عجب عالم ہیں نظیر آہ	اب ایسے تو دُنیا میں ولی کم ہیں نظیر آہ	
(۲۳)	پہنا کسی نے خوب لباس عطر کا بھرا	یا چیتھڑوں کی گدڑی کوئی اوڑھ کر پھرا	

(ب) اسقاط طرح۔

(۱)	فرمایش اگر ہو کوئی تو ہم سے وہ فرماؤ	ہم سب طرح حاضر ہیں ذرا ہم سے نہ شرماؤ
(۲)	یا بالکوں میں اس طرح بیٹا ہمیاں کروں	
(۳)	اُس نے جب گُل کی طرح ہنس دیا اور مجھ سے کہا	مہرباں مجھ سے یہ تم ناخوش ہو کیا، پیسے کا
(۴)	پھر اپنے ہاتھ سے جوڑے کو چھپڑ کواں رنگوا	کہا کہ دونوں رہو شامل حال ہولی ہیں

(ج) اسقاط ہ۔

(۱)	پی عاشقوں میں آکر دو بنگ کے پیالے	جو ایک دم میں تیرا گھر گھومے چھپر ہالے
(۲)	اُس گلبدن کے دل میں چھپا ہجر کا جو خاؔ	مکتب میں جاتی وہ جو کچھ ہوتا تھا اختیار
(۳)	کہتا ہے کوئی کسی سے ای دل رُبا ہٹیلے	ایک ہی گُلابی مُد کی ہاتھوں سے میرے پی لے
(۴)	میاں پھر تو جھوں کی بندھ گئیں واں اس قدر جاہیں	کہ ٹھٹھ کے ٹھٹھ ہوے خلقت کے اور بند ہو گئیں راہیں

(د) اسقاط ر۔

جو پاسا پھینکے بنا بنا کر اور داؤں کتنے ہی دل میں ٹھانے	جو چاہتا ہے اٹھارہ آدیں تو اُس کو پڑتے ہیں تین کانے

(الف) عین کے اسقاط کی تیئیس مثالیں تو اوپر موجود ہیں۔ عبیر کے عین کے اسقاط کی دو ایک مثالیں اور تھیں جو میں نے قصداً چھوڑ دیں۔ شاید دو چار اور رہوں۔ اس کثرت سے ان مثالوں کا پایا جانا سہوِ کاتب پر ٹالا جا نہیں سکتا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ نظیر جیسا استاد اس عیب سے واقف نہ ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نظیر جس زمانے میں تھا اُس میں عین کا اسقاط شعرا میں معیوب نہ تھا۔ شاید عیب نہ سمجھنے کی وجہ یہ ہو کہ تقطیع میں زیادہ تر تلفظ کا خیال کیا جاتا ہے۔ اُردو میں عین کا تلفظ الف سے جداگانہ نہیں ہے۔

عہد - علم - عمارت - عبیر وغیرہ الفاظ گو عین سے لکھے جاتے ہیں لیکن تلفظ اُن کا ایسا ہی - ہم - امارت - ابیر کا سا ہی پس تلفظ کو اصل قرار دے کر قدیم شعراء نے اس کو جائز رکھا ہی -

بقرعید کو نظیر نے شاید اسی لحاظ سے بقرید لکھا ہی - بعض لوگ بکرید بھی کہتے ہیں -

قلعہ بول چال میں قلا ہی - عین کی حرکت لام کو دے کر اس کو تلفظ سے ساقط کر دیا ہی - مثال نمبر ۱ - میں وہ عالم کا دو طرح جواب دیا جا سکتا ہی - ایک تو یہ کہ عین تلفظ میں الف ہی - دوسرے وہ تلفظ میں وہی - چنانچہ شعراء نے وہ بھی باندھا ہی - خود نظیر کہتا ہی -

خفا ہوا ان دنوں کچھ روٹھ بیٹھی ہی جو ہم سے وہ	تو اس کے غم میں جو ہم پہ گزرتا ہی سو مت پوچھو
جو دیکھی ہیں نے وہ اس کی شوخی مری زبان ہو کب ادا وہ	وہ زلفیں اس کی سیاہ پر خم کہ ان کے بل اور شکن کو یاد وہ

نہ پہنچے سنبل نہ پہنچے ریحاں نہ پہنچے ناگن نہ پہنچے کالا

تھا ایک دن وہ دم کا نکلے تھا جو اسوار ہو	ہر دم پکارے تھا نقیب آگے بڑھو، پیچھے رہو

یا ایک دن دیکھا اُسے تنہا پڑا پھرتا ہی وہ

غالب فرماتے ہیں -

	ہمیں پھر ان سے امید اور انھیں ہماری قدر	ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو
(سودا)	اسباب جہاں کے کچھ اب پاس گو نہیں	یہ فکر تو نہیں کہ یہ ہی اور وہ نہیں

پس وہ کی ہے کو تلفظاً واو سمجھنا چاہیے -

سودا کے کلام میں ہم کو اسقاطِ عین کی مثالیں مل گئی ہیں - وہ درج ذیل ہیں :-

اس عقدے کو سمجھے گا ہم پر بھی صاف	کہ وضعِ جہاں سے ہی یہ برخلاف

گر عید کا مسجد میں پڑھے جا کے دوگانہ	نیت قطعۂ تہنیتِ خان زماں ہے
نجیب زادیوں کا اِن دنوں ہے یہ معمول	وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
گریباں چاک گرد اُس کے اک عالم	کرے تھا نوحہ و فریاد و ماتم
سودا تجھے کہتا ہوں نہ خوباں سے مِل اتنا	تو اپنا غریب عاجز و دل بیچنے والا
خرید عشق نے جس روز کی متاعِ چمن	جو نقد جاں پڑی قیمت تو دل بیعانا تھا
سوا ہوئے جب عاشق کیا پاس آب رو کا	سنتا ہے ای دِوانے جب دل دیا تو پھر کیا
کون سا مجھ سے حسنِ ترد و عمل میں آیا تیرے حضور	دل کو غارت کر کے میری جاں کو کیوں بیغام کیا
شیخ ہے دل پہ ترے بس کہ تعین کی نشست	اِس سبب سے ہے تری یہ ریش دراز عقل ہے پست
کہیں رکھ ناک پہ عینک مطالعہ کر کے وہ اُس کو	بدقت مینتواں - الخ
پکھ سیم سٹلو ہی نہ گاویں گی بجا ڈھول	ڈنکا ہے دمامے کا کہ یہ مصرع ہے انمول

روئی تو — الخ

سودا کا ایک شاگرد کہتا ہے۔

گزرا ہے وہ عالم میں اک اُستاد زبردست	کیا کیا کروں اوصافِ سخن اُس کے میں تحریر

پھر یہی شاگرد مصحفی کا یہ شعر نقل کرتا ہے اور مزہ یہ ہے کہ عین کے گرنے پر اعتراض بھی کرتا ہے۔

مصرع سے بصد خونِ جگر مصرع کو چپاں	کرتے ہیں، تو پھر وہ بھی دو پلکے کی ہے تعمیر

اُردو میں اسقاطِ عین کی کچھ اور مثالیں :۔

ناسمن

[1] سٹلو بیہودہ عورت - بے سلیقہ عورت - پھوہڑ عورت - احمق عورت -

غافل جہاں کی دید کو تو مغتنم سمجھ	پھر دیکھنا نہیں ہے اس عالم کو خواب میں
	(درد)
کیا جانیے کہ آج کس عاشق کی ہے اجل	کیفی ہوا ہے اب تو مرا یار بے طرح
	(تاباں)
ہوا داغوں سے ہی صفر مرا کیا چٹ سب عشق نے گھر مرا	کہا کھا کے لخت جگر مرا یہ کباب کیا مزے دار ہے
	(منتظر)

یوں پکار اٹھا ترے در پہ شب مجھے چور کہہ کے وہ بدلقب

ترا آج عس ترا آج عس ترا آج عس ترا آج عس (محکم)

مرا معاف کرنا کہا اور سنا	(میر حسن)
اس عزت کا باعث ہو تم چار بھائی	لڑو یوں نہ آپس میں زنہار بھائی
	(ارشد دافع الوساوس)
گئے سوئے حرم کسی دن نہ کام دیر مغاں سے رکھا	سلامتی بس اس عشق کی ہو بہیں سے دونوں کو بندگی
	(تسلیم)
خادم اب ان کو اک نئے کمرے میں لاتے ہیں	تعظیم اور تواضع سے لاکر بٹھاتے ہیں
اب اس کے دل سے بخل کی جڑ تک اکھڑ گئی	نیکی کی اور تواضع کی خو اس میں پڑ گئی

(ارشد۔ مرقع حکمت)

سودا کے دو اور شعروں سے ثابت ہوتا ہے کہ عین کو تلفظ کے اعتبار سے الف مانا گیا ہے۔

لے مرے دل کو دے کے اپنا دل	سنگ کے مول یہ سب بکے ہیں لعل

جس غزل کا یہ شعر ہے اُس کا مطلع ہے:-

کھینچ شمشیر جا وہ دل کے نکال	آج در پر ترے پڑا ہوں نڈھال

دوسرا شعر یہ ہے:-

جب سُنیے لولیوں سے یہ طعنے	تب تو دل بیچ ہو کے کھسیانے

باوجودے کہ اسقاطِ عین کی اس قدر مثالیں سودا کے کلام میں خود موجود ہیں پھر بھی جہاں اُس نے میر کے ایک مرثیے پر مخاصمانہ نظر کی ہے وہ اس خطا سے چشم پوشی نہ کرنا عینِ صواب جانتا ہے۔ اِس مخدوش مرثیے کے سوا مجھے میر کے کلام میں اسقاطِ عین کی مثالیں نہیں ملیں۔

انتخابِ نقص میں مولوی عبد الغفور خانِ نسّاخ نے بہت سے شعر انیس اور دبیر کے بھی نکال دیے ہیں جن میں عین تقطیع سے گر جاتا ہے۔

غلام علی آزاد نے اس اسقاطِ عین کو اپنی کتاب تذکرۂ خزانۂ عامرہ میں عاقل خاں شاہجہاں آبادی کے حالات میں بہت شد و مد کے ساتھ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نہ فقط شعراء ہند دریں عین غوطہ کردہ اند بلکہ مردمِ ولایت ہم درگلابۂ ایں عین لغزیدہ است۔ اِس کے ثبوت میں خواجہ باقر عشرت شیرازی کا یہ شعر نقل کیا ہے ؎ مرا پندِ خردمنداں بحال خود نمی آرد ✣ بہ ایں افسانہا مجنونِ عشق عاقل نمی گردد۔

مثنوی ناخدا ایک شیرازی کی میری نظر سے گزری اُس میں اکثر اشعار میں عین گر جاتا ہے۔

✣ شاید انیس العارفین اُس مثنوی کا نام ہے۔ میں نے یہ مثنوی مخدومی مولوی سید محمود آزاد کے کتب خانے میں دیکھی تھی۔ ابتدائے کتاب میں ایک تقریظی قطعہ بھی خود مصنف کے قلم سے لکھا ہوا تھا۔ دیکھا تو اس مختصر قطعے میں بھی بعض جگہ عین گرتا تھا۔

شعراءِ فارسی کے کلام سے اسقاطِ عین کی کچھ اور مثالیں:-

(۱) عاقل خان شاہجہاں آبادی:-

ناتوانی تختہ بند یک مقام عاقل مباش		خاک بر سر می کند در خانۂ آئینہ آب	
ای بہ نقاب عارضت شعلۂ بالِ نگاہ		عکس تو در آئینہ یوسفِ مصری بہ چاہ	

(۲) ناصر علی سرہندی:-

ای رگِ جان بہاراین ہمہ بے رحمی چیست		خاک از مقدمِ تو خوں شدن عادت دارد	

(۳) غنیِ کشمیری:-

پیرہن گُل تن گل عارض گل لبِ دلدار گل		باغبانِ صنع بستہ دستۂ زین جایہ گُل	

(۴) ظہوریِ ترشیزی:-

بدستم دہ آن رشکِ یاقوت را		کہ سازم علاجِ عقل فرتوت را	ساقی نامہ

(۵) قاآنیِ شیرازی:-

یک روز چو بگذشت برہ دختر کے دید		مانندِ سگ عوعوزدو آہنگِ قمر کرد	

(۶) صاحب:-

تراہجدہ ہزار عالم بود در کشورِ حیواں-

پس جب کہ اس کثرت سے اسقاطِ عین کی مثالیں شعراءِ فارس وہند دونوں کے ہاں موجود ہیں تو پھر اس کو عیب قرار دینے کی وجہ۔ اولویت اور چیز ہے اور عیب شئ آخر۔ اولیٰ ہے کہ الفاظ جو جس زبان کے ہیں اسی طرح اُردو میں ادا کیے جائیں لیکن اگر اور طرح بندش میں آئیں تو خواہ مخواہ معیوب نہیں کہہ سکتے۔ طرفہ یہ ہے

کہ خود عربی میں بہت سے اشعار میری نظر سے گزرے جن میں عین کو تقطیع میں جگہ نہیں۔ سوا اس کے کہ اُس کو ہمزہ قرار دیں اور ساقط کر دیں۔

(ب) ے کے ساقط ہونے کی مثال بھی سودا کے کلام میں موجود ہے۔

دُنیا نہیں ای یار تلاش اپنی سے منظور	کرتا ہوں اس حُجّت کو میں اتمام جہاں پر
اور اُن کے حسنِ طلب کا ہر ایک سے یہ اُصول	کہ خاکِ پاک کی تسبیح ہی لیجیے جو مول

سودا کے ایک شاگرد لکھتے ہیں :۔

بہتر تھا کہ دیتا کرار دے کی تو اپنے	اِس شعر کے ساتھ حاشیے میں شرح بھی تحریر

(ج) اسقاطہ۔

"ایک ہی" کا جواب یہ ہے کہ یا تو ہے مخلوط ہو کر کاف کے ساتھ پڑھی جاتی ہے جیسے کبھی۔ سبھی۔ ابھی وغیرہ میں یا ہی کی ہے کہیں ہے ہی کہیں ہمزہ۔

سودا کے ہاں ہے کے اسقاط کی مثال بھی موجود ہے۔

تب وہ ناچار ہو کے جب ہارا	کہ یہ بات ہاتھ ہاتھ پہ مارا
غرض عجب کچھ ہیں در ہائے سفتۂ حافظ	بر آسماں چہ عجب گر بگفتۂ حافظ
سماعِ زہرہ برقص آورد مسیحا را	

لیجیے یہ بھی دل اپنے میں نہ رکھیے ارمان	لیکن ہوتا نہیں کچھ تم سے لیا میں نے جان
پس ہمت کے نزدیک ہی کیا بھلا	کہیں اَور پہ ٹالوں اپنی بلا
بے کفن بے گور ہی خیمے کے اندر وہ پڑا	جس کی صورت تھی بلا تشبیہ پیمبر سائیاں

(انشا)	رہ نصیحت نہ ہو چلون تو بے مجھے چھیڑنے دی	دیکھ یہ جا گہ ہی بے پردہ مری ہونٹ نہ چوس	

سودا اور انشا کی سند سے اگر تسکین نہ ہوئی ہو تو حضرت نظامی کا شعر لیجیے۔

یا نبد ہیچ کس از بادہ پرستاں بیدار	یا چو من مست بُدند ہیچ کس ہشیار نہ بود

ہیچ کی تاویل تو ہو سکتی ہی کہ اپچ ہی مگر ہشیار کا کوئی جواب نہیں۔

عرفی اور قاآنی بھی تایید کو موجود ہیں:۔

پیشِ عرفی مدہ از دست عناں کایں اُستاد	خویش را ابلہ نمودہ است ولے ابلہ نیست

(عرفی شیرازی)

پندِ مرا بجاں شنو دل بنہ بر نہالِ نو	تن ببلا شود گرفت در سرِ عشق یار دوں

(قاآنی)

سلامٌ علیکم سلامٌ علیکم	بحمد اللہ بھائی مسلماں ہیں ہم تم

(مولوی نذیر احمد لکچرِ منظوم)

ذکاء اللہ صاحب کے دیکھو رسائل	ہی کیا اُن کی تحقیق و تدقیق کامل

(اشتہری۔ شہر لندن کا فوٹو)

ہر اک شان میں خوش نما دل رُبائی	تعالے اللہ خود زور تیری خدائی

(ارشد۔ دافع الوساوس)

وہ عرض تو پھر ہو گی مگر یہ تو بتاؤ	بسم اللہ جو اس بزم میں آئے ہو تو آؤ

(ارشد چندہ نامہ)

جب تک ہوویں نہ یار ہولی میں — اپنی آنکھوں میں خار ہولی ہے

(منشی سید احمد دہلوی)

وحدت کے سوا ہیچ سمجھتے تھے ہر اک شَو — معنی الکحول دیتے شکل میں لو کی

(ارشد تضمین ارشد)

چھپر ہاے میں ایک تو اسقاطِ ہا ہے۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ چھپر کو اَبر کے وزن پہ پڑھیں۔

(د) اسقاط ر۔

اَور کی رے کے گرنے کا جواب یہ ہے کہ اَور کئی طرح سے تلفظ میں آتا ہے کہیں تو اَور بر وزن قول کہیں اَر بروزن زر باشمام ضمہ۔ کہیں باسقاطِ رابروزن ضو۔ کہیں باسقاط رابروزن لو۔ کہیں فقط واو مضموم۔ یہ جتنی صورتیں ہیں سب اَور کی ہیں لیکن یہ لکھا صرف دو ہی طور سے جاتا ہے۔ اور یا و۔ اس مقام میں و[1] لکھنا تھا اگرچہ کہ تلفظ کے مطابق لکھنا اس قدر رائج اُس زمانے میں نہ تھا اس لیے تلفظ کچھ مقصود ہو گر لکھا ہی

[1] واو عاطفہ ہندی:۔

مجھ سے گالی و جھڑکیاں کھائیں	الغرض سے لے گیا لیرا دقات (مسافر)
ہم چور و چتر سنتے تھے سو آپ کو دیکھا	ہیں گالیاں او مجبرے ہو سے آپ ہی بہ ہم (نجمی)
لیے جاتے ہیں وہ جس راہ سے ہی خارستاں	نہیں تالاب و کنوئیں کا کسی منزل میں نشاں (سودا)
گر چرخ و پوتی جو میں پیدا کروں چوتی بھڑوا و مسخرہ و چھپندر رہی اُن کا نام	کہا جاتے ہی یہ بھوک رکھے بیل سے دونی نتھ ناک میں ڈال اور نیچا ساڑی و لہنگا
بکواؤں گی اس بھڑوے سے کوتے ہی پلڑوا	
چمن دل میں عشق ہو یا تھا	داغ و شعلہ ہوا گل و بوٹا (سودا)
گانا بڑی تعلیم بجاتا ہے بڑا اگن	بس اُڑتا ہے کا لنگڑا و سارنگ شب و روز

(ارشد تضمین ارشد)

ر کی مختلف تبیین تلفظ کے اعتبار سے

ایک طور سے جاتا تھا ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہی کہ "کر" سہوِ کاتب ہی

اب یہاں پر کسی قدر غلط العام فصیح کے قاعدۂ کُلیہ کی بحث بھی بہت ضروری ہی۔ اوائلِ عہدِ شاعری میں تصحیحِ الفاظ کا نصاب جُداگانہ تھا۔ اُس وقت زیادہ تر اس بات پر نظر رہتی تھی کہ بول چال میں وہ الفاظ کس طرح رائج ہیں۔ مثلاً طَرح کہ گو لُغتہً بسکونِ اوسط ہی لیکن بحرکتین زبان زد۔ کبھی تخفیفاً تلفظ میں ح بھی ساقط ہو جاتی ہی۔ گو تسبیح بروزن تصحیح ہی لیکن تلفظ میں تسبی۔ اسی لیے اس کی جمع عموماً زبانوں پر تسبیاں۔ ایسے الفاظ کی نسبت شُعرا کی رائے یہ تھی کہ اگر روزمرّے کے مُطابق بندھ جاے تو وہی افصح ہی لیکن اگر کوئی تصحیحِ لغت کے ساتھ باندھے تو اس میں بھی مضایقہ نہیں۔ رفتہ رفتہ کُل جدید لذید کے لحاظ اور کسی قدر اظہار علمیت و امتیاز کے خیال نے اُن روزمرّہ کے مستعمل فصیح لفظوں کو شعرا کی لفظی انجمن سے خارج کر دیا۔ اس قسم کے غلط العام نظیر کے ہاں بہت آزادی کے ساتھ مستعمل ہیں۔ سودا کے کلام کو میں بطورِ سپر پیش کرتا ہوں تاکہ جتنے ناروا حملے نظیر کے کلام پر اس خصوص میں ہوتے ہیں رد ہو جائیں۔

سودا فرماتے ہیں۔

(جواہر بفتحِ ہا) - اس نصائح کی سند پھر نہ کلامِ عرفی لگے فرمانے کہ اُستاد اُنھوں کا سُن کر کئی دین و مذہب کے ہیں یہ جواہر	لاکے وہ میرے لیے یہ زر جواہر اشعار ویسے شعروں کو کہے تھا نہ کہا کر اشعار کہو آپ کی جا اُنھیں تُو تو جا کر

(ارشد بوافع الوساوس)

مسلا مسائل کہا حضرت نے سُن کر تم ہو گُم راہ انتظاری۔ لیکن اب دل کی بے قراری ہی	نہیں مسلہ مسائل سے کچھ آگاہ وصل کے دن کی انتظاری ہی

ذوی الاحترام۔ بدہر آصف الدولہ جس کا ہی نام	سلیماں شکوہ و ذوی الاحتشام
رخش تو نبی عمم براق است، از یراک	میداں ہمی از چرخ کند گاہ تنگ و دو

(قاآنی)

یگانہ۔ دیکھو یارو عجب زمانہ ہی	بیٹے سے باپ کیا بگانہ ہی
کمیں۔ کمی۔ کھانے پینے کی کچھ نہیں ہی کمیں	پاس سے میرے تم نہ جاؤ کہیں
مورد۔ پوچ زباں اُن کی سے شعر تو سرزد ہوا	کاتبِ بیچارہ مفت لعن کا مورد ہوا
قرض۔ بنیے کا دیوال بندہ ایک قرض دار تھا	اس کے ادا کرنے میں سخت وہ ناچار تھا
بیانہ۔ خرید عشق نے جس روز کی متاعِ چمن	جو نقد جان پڑی قیمت تو دل بیعانہ تھا
دوانا۔ جو ذکر بعد مرے ہوگا جاں نثاروں کا	کروگے یاد مجھی کو وہ اک دوانا تھا
بگانا، دوانا۔ اپنے کا ہی گناہ بگانے نے کیا کیا	اس دل کو کیا کہوں کہ دوانے نے کیا کیا
اعلان نون نہ کروہ کام دلِ دین دار و کافر سے	کہ پہنچے تا بدرِ کعبہ و کنشت شکست
دین دار فی الحقیقة میں۔ کہتے ہیں نیلم جسے تھا فی الحقیقة میں وہ لعل	ہوگیا ہی رشک سے تجھ لب کے رنگ اُس کا کبود
ہم جم = ہی مسلّم حسنِ مہ ہر چند پیشِ کائنات	گر ترے ہم جم ہو بیٹھے تو ہی پہلو کا عذود
ہم جنب خوا مخواہ = اسی سے واعظِ احمق کو پست فطرت جان خواہ مخواہ	ہوا ہی چڑھ کے یہ منبر پہ خوا مخواہ بلند
اصل السوس۔ چوبِ اصل السوس و بہ سیاوشاں مل کر	جوں تیر نہ چلنے میں کرے دیر ہوا پہ
جُدی۔ دامِ اُلفت کے اسیروں کی جُدی ہی پرواز	کہیں اُڑتے ہیں ترے بال کہیں میرے پہ

ناسخ

۵۱ سالِ مزرین فلفل ہلا ہو دنع کس ڈھب سے + سپستاں ہی نہ دو تا ہی نہ اصل السوس شیشے میں۔

غلط العام	لب ولہجہ ترا سا ہی یہ کن خوبانِ عالم مین	یہ غلط العام ہی جگ میں کہ سب مصری کی ہیں ڈلیاں	
ہم شہری	شوق زبان تک اپنے ہم شہریوں کو بھولا	نامہ جو اُس کو پہنچا اُن بے مروتون سے	
	کھولا اُسے تو ہر گز اک لفظ بھی نہ سمجھا	قاصد سے پوچھے معنی رو رو اشارتون سے	
آمان	امن و آمان سے گزرے بجہان عالم کو	دلون کو چاہیے آرام ہو جانون کو چین	
مطالا = مطالعہ	اگر اک ورق اسکا ہاتھ مین جا مولوی کے دو	کہیں رکھ ناک پہ عینک مطالعہ کر کے وہ اُس کو	
مرَض - مرِض	یہی مرَض الموت تھا قسمت میں میری یا ب	حاصل اس تدبیر سے کیا کرنے مین ملتا حبیب	

ترکیبِ فارسی وہندی:-

غرض جب بات چلنے ہی پہ ٹھہری	نماز ظہر پڑھ وقت سپہری
بناوین سبحہ جو اُتنے ہی لے کے مروارید	کبھو تمام نہووے وہ ڈورۂ تسبیح
عالم تمھارے پیچ میں آوے گا آج جاں	تم نے سجا ہی چہرۂ بل دار بے طرح

(تاباں)

تحریک ساکن کی مثالیں:-

قبر بفتحتین

ترِی در پہ ہم آکے پڑے ہیں صنم نہ سفر کے رہے نہ وطن کے ہوے
ترے ہجر میں بانی ظلم و ستم نہ قبر کے رہے نہ کفن کے ہوے

(محکم)

۵۱ (معروف) غلط العام فصیح ہی جہان میں معروف + غلطی کیا ہی ان اشعار کے ناخونوں مین -

عمرو متحرک الاوسط

ایک کوڑی کو نہ لیجے جو فروشندہ کہے	ہے بکاؤ کوئی زنبیلِ عمر لیتا ہے
زنبیل ہے عمر کی دلِ فکر خیز یہ	اس کو کسی طرح سے نہ زنہار توڑیے

(انشا)

درِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی	غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

(غالب)

عمرو ساکن الاوسط۔

آدھ سیر آٹے کا خدا ہے کفیل	پیٹ اس کا ہے عمرو کی زنبیل

(سودا)

خضر بفتح ثانی

صد مرتبہ گردد بترا از زہر ہلاہل	اگر ز آنکہ فتد عکس تو در آبِ خضر

(قاآنی)

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار	اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

(حالی)

شمر بفتح ثانی۔

دل ایسے شخص کو مومن نے دیدیا کہ وہ ہے	محبِ حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا

(مومن)

نذر = نذر - میراں وہ خاصے گھی کے تر گلگلے تلوں میں	بھینسا تو ایک کیا ہی دیوی نذر کروں میں
قالبوت = میراں سے اس کی جورو تب کہنے لگی رو رو کالبد	جو قالبوت تم سے پیروں کا بن رہا ہو
کھو دے تمہاری آگے یوں اس کی آب ڈکھو	جو تم میں کچھ کرشمہ ہووے تو یہ سزا دو

آنکھوں سے ہووے اندھا کوڑھی ہو اس کی کایا

ضاحک کے پیچھے پلچا اس طرح ہو کے مبہوت	سوجھا نہ آنکھوں آگے یہ ... ہر کہ ہی ..

سابوت = ثابت - ایسی بنا کے ماری ذرّہ رہی نہ سابوت

طُفانی = طوفانی - کہنے لگی کہ میراں بھڑوا ہی یہ طوفانی

حلوا - خاتون یوں بھی نہ ہو اس سے تو میں بات اور بتا دوں	دو چھیتھڑے رنگ کر حلوا آخا توں بنا دوں
رر - رنگ چھاپ اسی دو حلوا آخا توں میں دوں گی	کہتا پھرے بھڑوا جنیا لال ملوں گی
حلوا - خاتون ان باتوں سے ہوئے گی نہیں پیٹ کو سیری	لے کر حلوا آخا توں کرے شہر میں پھیری
طَبع خاموش کر اے سودا تیری طَبع ہی عالی	موقوف کر زباں سے یہ گفت گو رذالی
مباف = موباف اُن نے تب اپنی چوٹی سے یہ کھول کر مباف	مشکیں اُنھوں کی جڑ کے کہا کیجیے معاف
اصطبل = جو اصطبل میں کئی گھوڑے ہیں سو کیا امکان	کہ ہووے گھاس کے پٹھے کا اُن کے آگے نشان

اصطبل - بد میں یہ کہ اصطبل اوجڑ کرے ہزار

دسخطی = دستخطی اب آگے دفتر تن کی میں کیا کہوں خواری	سوال دسخطی کو پھاڑ کرکے پساری

کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کٹول

لاحول - یہ آگے اور چلیں کہہ کے زیر لب لاحول	(بضم حائیوں کہ تول بول رول کا قافیہ ہی)

جہان آباد۔	جہان باد تو کب اس ستم کے قابل تھا	
علما۔	اور ان کشمیریوں مین جو کہ اب علمائی دیں ہین گے	سمجھتے ہین وہ اپنے تئیں جو کچھ ہیں گے ہمیں ہین گے
خدع۔ مکر	خدع سے پھر مکر سے کرتے ہین گے گریہ و زاری	
کسب۔	اب یہ کہ تو کہ ہم کہاں جاوین نہین ہرگز سمجھتے حق کو یہ مرغوب ناحق ہین	جو بتا دے کسب سو کر کھاوین ہر اک پیشے کسب میں خوب باہر اور فائق ہین
مسلے۔	گدھی کا.. نا مسلے مین تلاتے ہین جلت ہے	
بچارا۔	بہت سید بچاری یہ انھین تلقین کرتے ہین	
قرم ساق	تب یہ کہتا ہی کیا وہ قرم ساق	دو دن اے خندی تجھے اگر میں طلاق
خصم۔	یون ہزارون سے جو رو کیون نہ ...	لیکن اُس سے خصم نہ ہاتھ اٹھائے

غیور تبشدید یا

یعنی نواب سلیمان فر و نام آصف جاہ	عہد مین جس کے یہ غیور بزرگ و کوچک

منہیات بروزن خطرناک

دور میں اُس کے ہی یان تک تو منہیات ذلیل	کش مکش ہی یہ نت اٹھ ہنگ سدا زیر کتک
حکم صلاح سے تری اے صلاح جہان	عرصہ اب اس قدر وہ منہیات پہ ہی تنگ
ہی کش مکش شراب کو جب کیجیے نظر	جس وقت دیکھیے تو ہی خنکون کے نیچے ننگ

مباحت بمعنے اباحت۔

بعیش گاہ جہان خوش ہو خرمی نے آج	کیئے بدل بمباحت منہاہی کے احکام (سودا)

اغلاط میں:-

قُران بروزن گمان۔

مت مانیو کہ ہوگا یہ بے درد ابل دیں	اگر آوے شیخ پہن کے جامہ قران کا

ساہلہ بکسر ہا۔

ہوا ہوں خاک پہ دل کی وہی ہے ناصافی	ابھی اس آئینے کی کرنی ہی جلا مجھ کو
مگر کہ مردن دشوار میں سہل ہے شوخ	ہلاک کرتا ہے تیرا ساہلا مجھ کو

مسیت بمعنی مسجد۔

عجب نہیں ہے نجانے جو میر چاہ کی ریت	سُنا نہیں ہے مگر یہ کہ جوگی کس کے میت
مت ان نمازیوں کو خانہ ساز دیں جانو	کہ ایک اینٹ کی خاطر یہ ڈھاتے ہیں گے مسیت

عیب اکفا۔

اُسی بن میں رہنا اُسی بن میں راہ	وہیں شام کا حسن لطف پگاہ
اُسی بن میں وہ جھیل گہری بہت	ہوئے صید بڑی وبحری بہت

(حاشیہ: [illegible])

اتنی مضبوط سپر کے بعد اب ہمیں نظیر کے غلط العام سے کچھ ڈر نہیں۔ عام نہیں بطور خاص ملاحظہ ہو

دِوار۔	وہ گرد دیوار کو دیں ہم کو ٹھا پھاند جاویں	
دوال۔	اُچھلیں دوال پاکھے اور پھاندیں چارپائی	
اَعصا۔	کل مجھے دریا اُپر خواجہ خضر جو مل گئے	سبز پیراہن گلے میں ہاتھ میں اَعصا لیے[۵۱]

۵۱ میر حسن۔ لیے سونے روپے کے عاصے تمام۔

محلات۔	یا جھونپڑے دو کوڑی کے یا لاکھ کے محلات
اَشرفی۔	پیسے روپے اشرفی یا سیم و زر کا پترا
مُسوّدا۔	مت چھوڑ قلم جان، لکھے جا تو مُسوّدا
افیم افیمی۔	کھا کر افیم ظالم مست ہو جیو افیمی
داستانہ۔	داستانہ ہاتھ میں اور پشت کے اوپر سپر
نصیبا۔	ایسے طالع ایسی قسمت یہ نصیبا کوئی پائے
خُلدِ عدن	اُنھی کے واسطے خلدِ عدن ہے

سند:۔

از یک سخن رواں دو لبش دادہ صد شکست،	تسنیم و کوثر و عدن و سلسبیل را

(قاآنی۔ پریشاں صفحہ ۳۳)

حضرت زہرا تری اماں نے کیا یہ ماجرا	پیاس سے مرنے کا فرزندوں کے مطلق نہیں سنا
کیا عدن میں جا کسی حور و ملک نے نہیں کہا	اب تلک آئی نہیں زہرائے اطہر سائیاں

(سودا)

شبکی۔	جو لے شبکی سے نام مرتضےٰ کو
گُمزی۔	گرد اس کے گمزیاں بھی چمکتی ہوئی ہیں چند
جنگل۔	کیا ابر و ہوا کوہ جنگل ارض و سموٰات

سند اسقاط نون۔

کہیں بن زنجیر آئے گھر نہیں	ذری چین شام و سحر نہیں

خنجر سے اس کو گلے شہ کے لگا لو دیا

کٹے گوشوارے کمینے سے کے	خنجر جفا سے کمینے کے
رنگ کھیلنے کا شادی کے دکھایا عجب طور	جز خون کی چھینٹوں کے نہ تھا کپڑوں پہ کچھ اور

(سودا)

دوانہ۔ پھرے دوانہ سا ہر طرف وہ اسی کی چاہت میں ہوش کھو دے۔

ہیولے۔	آباد ہیں جن پہ کھٹ پاٹ پلنگ کھٹولے	دلبر کہیں بغل میں اور کہیں ہیولے
چغد۔	گدا اور چغد وہاں رہے اور پھر پھرائے الّو	
قرض۔	کہتے ہیں ہنس کے قرض خواہ سے ہر اک بار	جو خالی آتے ہیں وہ قرض لیتے جاتے ہیں
فند۔	موت آن لتاڑے گی آخر کچھ مکر کرو یا فند کرو	بس خوب تماشا دیکھ چکے اب آنکھیں اپنی بند کرو
بگانہ۔	اس میں ہی دشمن اس میں ہی اپنے بگانے ہیں	
متصدی	اس میں وکیل بخشی و متصدی اور امیر	
نفع۔	ہر آن نفع اور ٹوٹے میں کیوں مرتا پھرتا ہے بن بن	
زہر۔	ترکاری ساگ پات زہر امرت اور دوا	
بوقلموں۔	گھڑی بھر بیٹھ کے ہم پاس کر لو عیش بوقلموں	
شہر پناہ۔	ٹوٹی حویلیاں ہیں تو ٹوٹی شہر پناہ	

تسبیح -	ہاں حبّہ تسبیح دور ہووے واں ساغر شیشہ چور ہوئے	
حسنین -	تو پھر حسنین کے صدقے سے اُن کو ہم بھی واں دیکھیں	
اشتر -	جو مانگا اک شتر اس کو دلا دے سیکڑوں اشتر	
صلوات -	صلوات پڑھ کے یہ بھی سناتا ہی تب نظیر	
قران -	پڑھتے ہیں آدمی ہی قران اور نمازیاں	

سند:-

	مت مانیو کہ ہوگا یہ بے درد اہل دیں	گر آوے شیخ پہن کے جامہ قران کا

اسی طور پہ حضرت امیر خسرو نے بھی باندھا ہی مگر شعر اسوقت یاد نہیں ہی-

چرپائی -	چرپائی بیچ کھائی اور بان کو جلا کر	روٹی پکائی رو رو اور کھائی آہ بھر بھر
قسم -	لیلی کی شکل پھرتی تھی آنکھوں میں ہر قسم	
عجوبہ -	انسان عجوبہ ہیں تو حیوان تماشا	
صحن -	باغ میں گھر میں صحن میں پیڑ سبزی کے لگا	
صرف -	صرف حرام کی کوڑی کا جن کا ہی بیوپار	اُنھوں نے کھایا ہی اس دن کے واسطے ادھار
ذبح -	بے جرم و خطا جس ظالم نے مظلوم ذبح کر ڈالا ہی	اس ظالم کے بھی لوہو کا پھر بہتا ندی نالا ہی
قطرجات -	اس کے عرق سے جسم کے یہ قطر جات ہی	اور اس کی اس کے فضل سے یارو نجات ہی

سند:-

	زصوبجات بگردوں شود زفیر نفیر	ز دیرجات بگردوں رود غریو و غرن (قاآنی)

چدر- ماں پیچھے ایک میلی چدر اوڑھے جاتی ہے

مزدر-	ڈھاتے تھے واں مزدر توتن کی محل سرا		پر گھر بنا رہے تھے دو ایس اٹھا اٹھا

غربا- اور سب یہ غربا دل شاد اپنے گھر میں

یہی چند اعتراضات سخت تھے جن کا جواب کافی طور پر دیا گیا-

زبان کے تبدل کے سبب اس وقت کے اور بہت سے محاورے ہیں- جو ہم لوگوں کو معیوب معلوم ہوتے ہیں- جیسے علامت اضافت[اہ] اور علامت فاعل کا حذف کرنا- بہت سے الفاظ ہیں جو اب متروک ہو گئے ہیں- مثلاً اب تئیں معنے میں اب تک کے- کب تئیں معنی میں کب تک کے- ماٹی معنی میں مٹی کے- لاگا- معنے میں لگا کے- ایدھر[اھ]- ادھر- جاگہ یعنی جگہ- نین= آنکھ- سجن= معشوق- برہن= جدائی کی ماری- برہ= فراق- ہیگا= ہے ندان= آخر کار- کرکر= کرکے- انھوں کے تئیں= ان کے تئیں- نت= ہمیشہ- اوپر= اوپر- گر (ماضی جانا) قافیہ شروع- رُیا= رویا- سین= نین- بٹ مار= راہ زن- ہستی= ہاتھی- سیتی= سے- کوئی ہموزن گئی- گئی ہموزن گئی-

اھ- اس برابر-

۵۲ (انشا)- دنیا ایدھر کی گو اودھر ہو جائے + بڈھے کھچے کی کس طرح خو جائے

کھوے[۵۱] = کہے - رہوے = رہے - ٹک معنی میں ذرا کے - تنک = ذرا - کنے = کے ہاں - پھیر = پھر -

یہ الفاظ سودا اور میر کے ہاں بھی موجود ہیں - نظیر چوں کہ میر کے معاصر ہیں اس لیے اُن کے کلام میں اِس قسم کے الفاظ کا ہونا کوئی امر اُن کے مرتبۂ شاعری کا گھٹانے والا نہیں ہو سکتا -

---

۵۱ کھوے - اُس شاہ کے اگر لب و دندان کی صفا ÷ کھوے کوئی کہ لعل و گہر ہیں یہ بے بہا - الخ

رہوے - تا ابد رہوے یہاں بھی اور وہاں ÷ حرفِ رسم خط کتابت درمیاں ÷

یہ محاورہ ذوق اور ناسخ کے ہاں بھی موجود ہے -

آج اُن سے مُدعی کچھ مُدعا کہنے کو ہیں ÷ پر نہیں معلوم کیا کھویں گے کیا کہنے کو ہیں -

(ذوق)

بوسے کا سائل ہوں کیوں مجھ کو نہ کھوے دُور دور ÷ قدر کیا محتاج کی حاجت روا کے سامنے -

(ناسخ)

نظیر کا باغ

باغ سے میری مُراد یہ نہیں کہ نظیر کوئی بڑے آدمی تھے۔ واقعی اُنھوں نے نوابوں اور امیروں کی طرح کوئی بڑا سا باغ لگایا تھا۔ اور اُس میں اہتمام کرکے ہر جگہ سے درخت منگائے تھے۔

بہار کے دنوں میں ہر روش جھک جاتی ہی۔ اور پھل کے زمانے میں ہر شاخ پھلوں سے لد جاتی ہی۔ شعرا گو بڑے آدمی نہ ہوں لیکن خدا کی طرف سے اُن کو لطف انگیزی کی وہ آنکھیں ملی ہوئی ہوتی ہیں کہ باغ لگائے کوئی مگر واقع میں اُس کے مالک یہی ہیں۔ لگانے والوں کو ایک مالی یا باغبان سے زیادہ رتبہ نہیں۔ شعرا کا باغ اُن کے صحن خیال میں ہوتا ہی۔ جس کی وسعت ہر باغ سے زیادہ ہی۔ وہ اپنے مذاق اور پسند کے مطابق روز ہر تھالے میں ایک تازہ پودا لگاتے ہیں اور ہر روش پر ایک نیا گُل کھلاتے ہیں۔ آرایش روز بہ روز ترقی کرتی جاتی ہی اور رونق دن بہ دن بڑھتی نظر آتی ہی۔

اس مضمون کو ہمارے مکرم مولوی سید محمود جہانگیر نگری نے اپنے قصیدۂ معراج الخیال کے آغاز کے چند شعروں میں کس خوبی سے ادا کیا ہی۔

دلم گلچینِ اسرار و خیال من گلستانش	فضائے ہر دو عالم گوشۂ از یک خیابانش
خوشا باغی کہ طبعش باغباں فکرش صبا آمد	قلم گلدستہ بند و صفحۂ قرطاس گلدانش
خوشا باغی کہ رشکِ خلد شد دامانِ آگاہی	ز رنگیں جلوہ ہای دل کش گلہای الوانش
تعالی اللہ چہ باغ ست ایں کہ ریزد گوہر مضموں	بہ جیب گوش عقل از زمزمۂ مرغانِ خوش الحانش

فدائے اسد چہ باغ است این کہ بحر از ران معنی را	ضمان مستی جاوید آمد بوے ریحانش
زہی باغی کہ ماند تا قیامت تازہ گلہائش	نہ آن باغی کہ در یک ہفتہ ریزد برگ ریحانش
زہی باغی کہ رہ بنود دور و باد خسرانی را	چہ در آردی چہ در بہمن ہمی تازہ یکسانش
زہی باغی کہ نازک نکتہ ہوش ز خسرو افزا	فزون از خضر منقوش ہست بر اوراق و اعضانش
زہی باغی کہ معنیہای رنگیں ست گلہائش	زہی باغی کہ چون من بلبلے باشد غزل خوانش

نظیر کا مذاق اس خیالی باغبانی میں امتیاز کی خصوصیت رکھتا ہی۔ اُس نے طبیعت کے ہرے بھرے باغ میں کوئی اچھا اور عمدہ پودا نہیں چھوڑا۔ جو پیڑ اُسکو پسند آیا ہی تیزی نظر کے قلم تراش سے اُس نے اُس کی قلم کاٹ کر ضرور اپنے جاوید بہار باغ میں لگائی ہی۔ اسی سے اس کا باغ خیالی نہایت گھنا نظر آتا ہی۔ اس نے اپنے اس باغ کی ایک سچی اور اچھی تصویر بھی ہم لوگوں کی تفریح کے منظر پر کھینچ کر لگائی ہی جس میں رنگ اس عمدگی سے بھرا ہی اور روشنی اور سایہ اس خوبی سے دکھایا ہی کہ کہیں تو ٹھنڈی چھاؤں دیکھ کر نظاری کو راحت کی نیند آتی ہی کہیں دھوپ کی جھلک دیکھ کر آنکھوں کو نور سرور حاصل ہوتا ہی۔

آؤ کچھ دیر کے لیے ان کے اس پُر بہار باغ میں گل چینی کریں اور تازہ پھولوں کا گلدستہ بنا کر انتخاب کے گل دان کو زینت دیں۔

دیکھو یہ پھولوں کا تختہ کس قدر مہک رہا ہی۔

بیان بہاریہ سکھی صفحہ ۵۵ جلد دوم

شب کو چمن میں واہ واہ کیا ہی بہار تھی مچی	پھول کھلے تھے پھول پھول غنچے کھلے کلی کلی
بیلا چمیلی رائے بیل موتیا جوہی سیوتی	بادِ صبا بھی چلتی تھی عطر و گلاب میں بسی
رات تو کیا ہی عیش کی ٹھہری تھی آکے انجمن	تارے کھلے تھے سہ رتن پھول کھلے چمن چمن

نرگس و بار و یاسمن سوسن و طرّہ نسترن	کبک تدرو خندہ زن بلبل و قمری نعرہ زن

اس تختے سے تو یہ پھول ہاتھ آئے۔ بیلا۔ چنبیلی۔ رای بیل۔ موتیا۔ جوہی سیوتی۔ نرگس بار سنگار۔ یاسمن سوسن۔ طُرّہ نسترن۔ اب آگے چلیے

جو صحن باغ کا ہے وہ ایسا ہی دل کشا	آتی ہے جس میں گلشن فردوس کی ہوا
ہر سو نسیم چلتی ہے اور ہر طرف ہوا	ہلتی ہیں ڈالیاں سبھی ہر گل ہے جھولتا

کیا کیا روش روش پہ ہجوم بہار ہے

سر و سہی کھڑے ہیں قرینے سے سبز تن	کو کو کریں ہیں قمریاں ہو کر شکر شکن
رابیل سیوتی سے بھرے ہیں چمن چمن	گلنار لالہ و گل و نسرین و نسترن

فوارے چھُٹ رہے ہیں رواں جوئبار ہے

یہ کئی نئے پھول اس تختے میں بھی ہیں۔

گلنار۔ لالہ۔ نسرین۔

پھل پات کہیں شاخ کہیں پھول کہیں بیل	نرگس کہیں سوسن کہیں بیلا کہیں رابیل

دید بازی صفحہ ۲۵۸

یہاں پھر پھولوں کا تختہ ملا۔

بیلا گلاب سیوتی نسرین و نسترن	داؤدی جوہی لالہ و رابیل و یاسمن
جتنے جہاں میں پھولی ہے پھولوں کی انجمن	یہ سب تجھی میں پھول رہے ہیں چمن چمن

موتیا ہے چنبیلی بیلا ہے	ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ

ای گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

(نول کشوری صفحہ ۹۳)

داؤدی اور گلاب دو نئے پھول ہیں۔

نسرین و موتیا و سمن بھی تجھی میں ہے۔ (نول کشوری صفحہ ۹۲)

کوئی نیا پھول نہیں۔ آگے چلیے۔

کیا قمری دل سوختہ کیا بلبل نالاں	کیا باغ چمن تختہ کا کیا زیر خیاباں
سب مل کے یہی بات پکاری ہیں کہ اک آں	گل بھی وہی سنبل وہی نرگس وہی ریحاں

اپنے ہی تماشے کو گلستان میں آیا

(خمسہ بر غزل اصغر صفحہ ۱۱۲ - نول کشوری)

اس میں سنبل اور ریحاں دو نئی چیزیں ہیں۔

وہ دیکھیے میاں نظیر آپ بیٹھے باغ میں میوے کھلا رہے ہیں۔

میوے ہیں جتنے خشک و تر اس باغ میں لگے	بادام پستے داکھ چھوہارے وکھو پڑے
خربوزے آم جامن و لیمو چکوترے	نارنگی و انار بہی کولے سنگترے

سب خوبیاں بنی ہیں یہ آدم کے واسطے
اور دم نباہ آہ فقط غم کے واسطے

بلدیوجی کے میلے میں میاں نظیر ایک ڈالی میوؤں کی لیے کولے نارنگی سنگترے کھٹے کر رہے ہیں۔

(صفحہ ۱۷۹ - نول کشوری)

پھر ایک کا چھن کے پاس بیٹھے یوں بیر چُن رہے ہیں۔

کوئی کا چھن کے چُن رہا ہی بیر

میلوں میں اکثر اپنے باغ کا میوہ بیچتے نظر آتے ہیں۔

میلوں میں آم جامن سیب و انار بیچے

یہ میوہ دار درخت تو ہندی شان سے لگے ہیں۔ اب باغ کی آرایش ولایتی مذاق سے مُلاحظہ ہو۔
اور دیکھیے کہ اس میں کس خُوبی سے پھل لگے ہیں۔
پہلے امرود اور انگور دیکھیے۔ محبوبے امرود طلب کرد۔ انگور آوردم۔ گفت دلت مے خواست۔ گفتم چہ کنم
نگاہم تشبیہ پیراست ؎ ازیں معنی بخندید او بہ طرزے ✣ کزو گردد خجل عقدِ ثریا ✣

(طرز تقریر ۱۹)

سیب۔ بہی۔ شفتالو۔ فالسہ۔ سنگترہ۔ ملاحظہ کیجیے
نزد نازنینے کہ ذقنش چناں دل آسیب کہ روئے بہی نہ بیند و لبش آں قدر خاطر فریب کہ ہوس بوسۂ
آن بہزار شفتالو نہ نشیند نشستہ بودم۔ پسند میوہ درمیاں آمد۔ گفت دلم را فالسہ و سنگترہ خوش مے آید۔
گفتم دلم نیز مے رباید۔ گفت چرا۔ گفتم بہ تشبیہ لب نزاکت گرا۔ چوں آں دل تر تبسم بر لب آورد۔ دلِ من
نیز فتح یاب گردید۔

(طرز تقریر ۲۰)

شریفے کو ذائقہ فرمائیے۔
شوخے لطیفہ پرداز شریفہ طلبید۔ چوں پیش رسید۔ گفتم شریف تر گردید۔ گفت دلت بکفایت ذدید۔

گفتم جائی کہ بہتر وزرد تر رسد مشرف باید گردید۔ وحصول دو فرحت باید گردانید۔ یکے شریفہ ودیگرہ لطیفہ۔ عنایت کرد وگفت دلت خوش گردید۔ گفتم وقتی کہ از دستِ ناز خواہد رسید ؎ چوں زدستِ نازنینم آمدبدست گفتم اکنوں خاطرِ من شاد شد ٭

(طرز تقریر ۲۳)

جامن نوش کیجیے۔

نزد نازنینی رفتم۔ وگفتم جامن خوب تر آمدہ است ؎ چہ گویم بے تکلف طرفہ جامن ٭ تواں کردن بیانش تا بکجا من ٭ گفت بہ دمن خوش دارم۔ رفتم وزود آوردم۔ قدری بمن داد وگفت دیگر۔ گفتم ہمیں ایں جامن۔ چوں خود تناول ساخت دوسہ تخمش برمن انداخت۔ خوش وقت شدم وگفتم ؎ ازیں جامن ہمینم آرزو بود ٭ زلطفِ نازنین خوباں برآمد ٭

(طرز تقریر ۲۴)

ہر چند آگرے کے آم بہت اچھے نہیں مگر میاں نظیر کے باغ کے ہیں۔

مضایقہ نباشد۔

در فصل انبہ کہ پسند خاطر خاص وعام ہست وشہد وشکر بے قدری الیتام پیش نازنینے رفتم۔ گفتم انبہ ذائقہ قریب دیدہ آمدہ ام۔ گفت چرا نیاوردی۔ گفتم اکنوں چہ درنگ۔ مگر رنج اتال نزاکت شامل نشود۔ تبسم کرد وگفت خوب۔ رفتم وزود آوردم۔ گفت چہ قسم است۔ گفتم ہمہ تبرشی درشت۔ گفت اگر ہر آید۔ گفتم یک مشت۔ سرخ۔ سرخ روئی پسند وسر سبزی نگاہ نیازمند۔ وزردیم ایں کہ بخورند وروی گرفتنم زرد نکنند۔ ہنگام تناول ہماں قسم۔ گفت ہرچہ ازیں خوش آید باید گرفت۔ شیرہ گرفتہ گرفتم۔ گفت چرا۔ گفتم با طاقت

حکم ہمیں خوش آمد- بخندید- زیادہ مسرور شدم و گفتم ؎ لذتِ انبہ خوردن ایں طور* پیش من بہ ازیں نمی باشد*

(طرزِ تقریر ۲۸)

اُس میوے کو ملاحظہ کیجیے جس کی شان میں ہے ؎ انجیر نام ست ہر میوۂ- جنت کے فواکہ سے ہے-
پیش محبوبے رفتم- دیدم کہ انجیر نہادہ است و زلف گرہ گیر کشادہ- بقدرِ تفاوت نشستم گفت اگر دل پذیر چندے ازیں بگیر- دانستم بعزم تسخیر- گفتم کجا ایں توقیر- اگر لطف است ہمیں جا عنایت تاثیر- گفت ایں چہ تقریر گفتم از دور انجیر و نزدیک زنجیر- ترک انجیر از بیم زنجیر- خوش تدبیر- گفت چناں- گفتم ؎ صیدرم دارد و صیاد فسوں مے خواند* ہر کسے مصلحتِ خویش نکو مے داند-

(طرزِ تقریر ۲۹)

بلدیو جی کے میلے میں کاچھن کے ٹوکرے کے بیر تو کھا چکے ہیں- ایک بیر اور کھائیے گو ترش ہے مگر ترشی مزے کی ہے-

از شوخی شکر لب اُلفت دست داد- چوں مجال بوسہ نداشتم- آرزوے دشنامے کردم- از شوخی نے داد- حصول آں بے حیلہ ندانستم- روزے کنار ترشے ہمکنار پیش او بردم و گفتم بسیار شیریں است- چوں آشنای دنداں کرد دشنام داد- مسرور شدم- گفت چرا- گفتم مرادِ من ہمیں بود- گفت ؎ قدر دشنام از لب خوباں* دل مشتاق باز مے داند* گفتم ہمیں طور- تبسّم کرد- (؎ ایں تبسم برائے آں کہ فریب* یاد دارد ز دل فریب بتاں* نسخۂ اولے)

(طرزِ تقریر ۳۰)

بلدیو جی کے میلے کے سنگترے بھی دیکھ چکے- اب نازنینوں کے بزم کے سنگترے سے لطف اُٹھاؤ-

پیش نازنینِ گلعذار سنگترہ نہادہ بود۔ گفتم در باغ چنیں خوبی و دل فریبی کجا۔ گفت آخر آلِ این۔ گفتم ہمیں کہ یک دو از ین دست نگارین جانب من بغلطانند۔ گفت نامش بہ بنگ شرکت داد۔ گفتم سنگے کہ بر لعل خجلت آرد۔ گفت چیاں گفتم بہ لطفِ دو چنداں۔ گفت آخر سنگ۔ گفتم آرزوی دیوانہ رنگ۔ تبسّم نمود و ہمچناں کرد۔
نمودم قدِ خود چو گاں بہ تسلیم ٭ چناں کز مثل خود ہا گوی بُردم ٭

(طرزِ تقریر ۳۲)

لیجیے سیب کھائیے۔

نزد نازنینِ سیمیں ذقن رفتم و گفتم سیب خوش رسیدہ است۔ گفت بیار۔ گفتم اگر دستم بہ سیب رسد۔ گفت بے آسیب نخواہد رسید۔ گفتم اگر باغباں نماند۔ گفت پاسبانِ زلف اسیر گرداند برائے آں کہ دیدن و چیدن تفاوت دارد۔ گفتم چساں۔ گفت در دیدن بہی و در چیدن الٰہی۔ آوردم۔ ہنگام تناول پسند ساخت و دہانم را نیز معزز فرمود۔ مسرور شدم و گفتم
خوردن سیب از چنیں خوبی ٭ غیر لطفِ تباں نہ می باشد ٭

(طرز تقریر ۳۳)

جی چاہے تو گنا بھی حاضر ہے۔

ای کرم فرمای من پیوستہ شیریں کاریت ٭ باد فرحت بخش یاراں چوں شکر گفتاریت ٭ لبتہ نیشکر عذوبت سرشت نقد حلاوت در گرہ کمر بہ دل کشائے لبتہ رسم شکر ریزی نہاد۔ ہزار فرحت و مسرت دست داد۔ لب و دندان بجواز گردانی استلذاذ اشتغال ورزید۔ و دہان از عرق دل جوے آں سبوے خود پُر گردانید۔ زبان بحصول تمنّا عذب البیان۔ و کام بکام خود رطب اللساں۔ و قدرش از قند بایہ برسید۔ و مقدارش از نبات باید دریافت۔ پارہ صفا پذیرفتہ سمن کار۔ و ریزہ عرق گرفتہ نسترن نژاد۔

ے بتوصیف ایں تحفۂ شکریں * نئے کلک من پُر از انگبیں۔

(قدر متیں ۶)

پیوندی بیر ایسے نہ کھائے ہوں گے۔

ے کنار دولت عشرت آباد باد * دلم خوش نمودی دلت شاد باد * پیوندی کنار خوش گوار رسید۔ ذائقہ بحلاوت سیب و انار ہمکنار گردانید۔ نزاکت بیر یا درپوست چناں کہ باتصال سبقت دست تصور در ہراس خراشیدن۔ و بیارے مغز چنداں کہ تخم در اندیشۂ بشمار نرسیدن۔ سرخی و زردی نحوی کہ بعُنّاب و امرود رشک فزاید۔ و شیرینی قسمے کہ لب و دنداں تجویز دوری خستہ نماید۔ ے بے تکلف خاطرم را زیں کنار خرّمی ہا رو نمود از ہر کنار۔

(قدر متین ۱۰)

ایک آم یہ بھی قابل ذائقہ ہی ہی۔

ے ز الطاف انبہ ز اشفاق عام * دلم شاد شد خاطرم شاد کام * از رسیدن انبہ طبع نیاز رس مسرور گردید۔ و رنگینی آن قطعۂ چمنے نبظر رسانید۔ دہن غنچہ آئینش ہنگام کشایش پیشیۂ پشیمینۂ خود شگفتین آموخت۔ و کام و زبان از شیریں بیانش شکر فشانی بمضامین شیر و شکر اندوخت۔ کثرت شیرۂ بے ریشہ آں قدر کہ بفشار نرسے از سر انگشتاں تا حد آستین رواں۔ و در حین ارتباط لب از گریبان تا کنار داماں رشک کاغذ زر فشاں۔ مدام شیریں کام باشید۔

(قدر متین۔ ۲۱)

سنگترہ بھی پھر لیجیے۔

ے دلم ز سنگترہ بایں دو لطف خرسند ست * کہ از بروں و دروں ہم گل ست و ہم قند ست *

تکمۂ سرخ آویختہ بازوے شاخ - و بہ مشت لعلگوں بہ پنجۂ مرجاں گستاخ - بالیدگی گولہ بفرحت ہم صورتی - وبزرگی نارنگی بہ نسبت خردی - میوۂ ابتہاج درکفِ مزاج باد -

(ق . رمتین ۲۸)

سبحان اللہ سنگترے کے ساتھ تو نارنگیاں اور گولے بھی لپٹے ہوئے ہیں -

یہ خربزہ بھی خاصا ہی - اور کیوں نہ ہو آگرے کا ہی -

ے لطفت، بہ جلوۂ ہوس انگیزِ خربزہ ❊ کاشانہ ام ممہد جو فالیزِ خربزہ ❊ رنگش نظر فریبی نیرنگ دارد و بویش از عطر چنیپہ فرقِ فرسنگ - کوزۂ نبات گرد تقلید شکلے تراشید - بایں نرسید - و قند ہوس مناسبت مکرر گردانید - انفعال کشید - قلم اگر دہ زباں آرد - تجریرِ خوبیِ ہر قاش رقم عجز نگارد - سرسبزی عاشقِ کشت تمنا باد -

(قدر متین ۴۲)

سب کھا چکے - تربزہ رہا جاتا ہی - ایک قاش اس کی بھی سہی -

مجھ سے کل یار نے منگوایا جو دیکھ بھیا
دیکھ تیوری کو چڑھا ہو کے غضب طیش میں آ
کیوں بے لایا ہی اٹھا کر یہ مراسر تربوز
اور کچا ہی تو میں پیٹ میں بیٹھا تو نہ تھا
لاٹھی پاٹھی جو نہ پائی تو پھر آخر جھنجھلا

اُس کے ٹانکے جو لگائے تو وہ کچّا نکلا
کچھ نہ بن آیا تو پھر گھور کے یہ کہنے لگا
جب کہا میں نے میاں یہ تو نہیں ہی کچا
اس کے سنتے ہی غضب ہو کے وہ لال انگارا
کھینچ مارا مرے سینے پہ اُٹھا کر تربوز

ے بخندہ شکرینِ تو بود گرمِ ہوس ❊ دلم زتربزِ شیریں بقدرِ تسکیں یافت ❊ حلاوت تربزہ زباں را

بشکر ریخی شکر رسانید۔ وعذوبت آں ذائقہ را مانند ہر قاش برانگبیں خندانید۔ درج زمرد پر از یاقوتِ رمانی۔ دآبگینہ سبزی لبریز شربت سرور رسانی ۔ مرغزارِ شادابی بفسحتِ طبیعت بساطِ طراوت گستر۔ وبمارِ خضرتِ آبی مانندِ سیر سبزۂ وآب مفرحِ خاطر ومقوی نظر ؎ بوے برف شیریں پیش ایں ہر لحظہ وہر دم ÷ بآئینِ دل فرہا دگوید گرد تو گردم ÷ سرسبزی بر آمد مشمول مقاصد باد۔ (قدرِ متین ۶۹)

انجیر کو پھر ذائقہ کیجیے۔

؎ ایں عطوفت کہ نمودی برمن ÷ از تو امید چنیں مے دارم ÷ انجیر عذوبت پذیر۔ انشراح متجاوز التحریر رسانید۔ پوست ومغز ش بہ نرمی ونزاکت اتحاد دارد۔ وخوبانی بادام اُلفتش اگر ہوسِ اسیری کند عجب نیارد۔ قند مصری انباز حلاوت نہ بلایت ۔ وانگور بصحبت گرو نازش ہے ندامت۔ کامِ ذائقہ چناں از لب حاصل کہ منت دنداں نبرد۔ وازاں قسم شیرینی کہ مذاق را بخاموشی ملذ ذگرداند۔

(قدرِ متین ۱۲۳)

انجیر کے لپیٹ میں خوبانی بادام انگور بھی آگئے۔

انار سلطان الثمار بھی ملاحظہ ہو۔

؎ از شیوۂ شیرینیت ای مجمع صدِ خوبی ÷ شاد است دلِ یاران چوں حسن بہ محبوبی ÷ انار چند از لطف آں طرزِ رعایت پسند بخوبی رسید۔ خاطر مسرور چوں خلاصۂ بعضے ازاں در پیرہن گنجید۔ بدعوی سرخی گلبرگ خود سندِ عیانے۔ وشاہد آں یاقوتِ رمانی۔ عذوبت بانبساط جا یابی در دروں مخیند۔ امرود وشفتالو بحلاوتِ خود خیال مے بندد۔ حرفِ مذاق بسیار شیریں۔ وسخنِ طبیعت نہایت شکریں۔ شجرِ مرادِ مثمر بر آمد باد۔ (قدرِ متین ۱۱۶)

اب گن تو جائیے کتنے پھل ہوئے۔

آم ایک۔ جامن دو۔ لیموں تین۔ چکوترے چار۔ نارنگی پانچ۔ انار چھ۔ سنگترے سات۔ کولے آٹھ۔ خربوزے نو۔ بیر دس۔ بادام گیارہ۔ پستہ بارہ۔ داکھ تیرہ۔ چھوہارے چودہ۔ کھوپرہ پندرہ۔ امرود سولہ۔ انگور سترہ۔ شفتالو اٹھارہ۔ فالسہ اُنیس۔ بہی بیس۔ شریفہ اکیس۔ سیب بائیس۔ انجیر تیئیس۔ آم چوبیس۔ گنا پچیس۔ خوبانی چھبیس۔ تربز ستائیس۔

اللہ غنی ستائیس بہت ہیں۔ اتنے پھل ایک باغ میں بہت غنیمت ہیں۔ لیچو نظر نہیں آئے شاید اُن دنوں اس قدر عام نہ ہوں۔

نظیر کا مٹھائی کا پل

گو نظیر برابر مٹھائی کے پل پر نہ رہا مگر جہاں رہا مٹھائی کا پل قائم تھا - اگر اس پل کے کچھ طاق دکھائے جائیں تو غالباً خیال کے تریاک سے لو لگانے والے بے مزہ نہ ہوں گے -

پہلا طاق - برفی موتی چور کا

ان روٹیوں کے نور سے سب دل ہیں نور نور
آٹا نہیں ہے چھلنی سے چھن چھن گرے ہے نور
پیڑا ہر ایک اس کا ہے برفی و موتی چور
ہر گز کسی طرح نہ بجھے پیٹ کا تنور

اس آگ کو مگر یہ بجھاتی ہیں روٹیاں

دوسرا طاق - برفی گلابی جلیبی تل شکری امرتی اور دندان مصری کا -

میٹھی ہے جس کو برفی کہیے گلابی کہیے
یا حلقہ دیکھ اس کے تازی جلیبی کہیے
تل شکریوں کی پھانکیں اب یا امرتی کہیے
سچ پوچھیے تو اس کو دندانِ مصری کہیے

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

تیسرا طاق تل کے لڈو کا -

عمدوں نے سو طرح کی یاقوتیاں بنائیں
لونگیں ہیں دار چینی شکر میں لے ملائیں
سردی میں دولتوں کی سو گرم چیزیں کھائیں
اوروں نے ڈال مصری گر پینڈیاں بنائیں

ہم نے بھی گڑ منگا کر بندھوا ئے تِل کے لڈّو

چوتھا طاق پیڑا جلیبی لڈّو کا

کہتا ہے کوئی پیاری جو کچھ کہو سو لا دیں
پیڑا جلیبی لڈّو جو کھاؤ سو منگا دیں

زر دوزی ٹاٹ بافی جوتا کہو پنہا دیں
چیرا دوپٹہ جامہ جیسا کہو رنگا دیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

پانچواں طاق مختلف مٹھائیوں کا۔

انبار لگائے پیڑوں کے اور ڈھیر گلابی اور برفی
بُرّاق کمُد اور خُرمی بھی خوش رنگ امرتی پر علی

پھر لڈّو بھی طیار کیے دی قند بہت بادام گری
وہ خوب جلیبی اور کھجلے وہ گھیور بالوساہی بھی

کچھ طاق ٹوٹے ہوئے بھی ہیں جن میں گُڑ ہی۔ قند ہی۔ اولے ہیں۔ گُڑ کی بھیلیاں[۱] ہیں گنّے ہیں۔ پیڑے ہیں۔ لڈّو ہیں۔ جلیبیاں ہیں۔

یوں خلق دوڑی کھیّاں جوں گُڑ پہ دوڑیاں

خالق نے کیا ہی چیز بنائی ہیں کوڑیاں

جو کوئی چیز دیوے نت ہاتھ اوٹتے ہیں
گُڑ بیر مولی گاجر لے مُنھ میں گھوٹتے ہیں

سر سے تا پا سڑے چپکیلے ہیں
لد گئی تار تار سب رگ و پے
دال روٹی پہ تھر آتا ہے

آدمی کیا کہ گُڑ کے بھیلے ہیں
اِس قدر دُھوم مکھّیوں کی ہے
اور جو میٹھی چیز کھاتا ہے

۱؎ بھیلی گڑ کی چکتی جو عموماً پانچ سیر ہوتی ہے۔ ۲؎ خوشبو۔

اُس نے اللہ جانے کھائیں کیا		اس قدر دھوم مکھیوں کی ہے

اُن کی بلا سے گھر میں ہو قند یا شکر نا
جس بات پر یہ مچلے پھر وہی کر گزرنا

ہیں ہزاروں ہی جنس کے ہٹّے		موتی مونگا دآرسی ٹبّے

پیڑے لڈّو جلیبی۔ اور گٹّے

لڈّو میں نہ پیڑوں میں نہ اولوں میں مزا ہے۔ الخ
کوئی اولا کوئی مصری کوئی شکّر تربوز

نظیر کی عورتیں

نظیر کے کلام میں عورتوں سے کافی طور پر بحث کی گئی ہی اور اُس پر اجمالی نظر ڈالنے سے ایک خاص مفہوم عورتوں کا جو نظیر کے ذہن میں تھا حاصل ہوتا ہی۔

(۱) سب سے پہلے نظیر کی معشوقیں ہیں۔ اُن کو اُس نے مختلف عنوان سے پیش کیا ہی۔ کہیں تو اُس نے سر سے پا تک زیورات سے جڑ دیا ہی۔ کہیں زیور کے علاوہ ناز و انداز و نزاکت اور تناسبِ اعضا اور رفتار و گفتار کا عالم بھی دکھایا ہی۔ حسن سے قطع نظر اُس کے معشوق میں ہمیشہ ایک اعلیٰ درجے کی ذہانت پائی جاتی ہی اور بلا کی بے چینی۔ اُس کا معشوق برق کی طرح ابھی یہاں ہی ابھی وہاں ابھی غائب۔ کسی قدر معشوق میں ایک خاص قسم کے ظالمانہ تیور بھی رکھتا ہی۔ اور معشوق اُس کا غالباً پردہ نشیں عورت نہیں معلوم ہوتی ہی بلکہ امیروں اور بڑے لوگوں کے پہلو میں بیٹھنے والی طوائف۔ بول چال میں اُن کی ایک مردانہ لہجہ رہتا ہی۔

کہا جو ایک لے بوسہ میں دو لگا لینے
تو ہنس کے کہنے لگے چل بے اب نہ ایک نہ دو

معشوق اس کا زیادہ تر سفاک وضع ہی۔ فوجی لوگوں کے مذاق کے لائق۔ اسی سے ہمیشہ نظیر ڈر کے پہلو کو چھپاتا ہی۔

نظیر یار سے کیوں دردِ دل نہیں کہتا — سُنا نہیں ہی وہ تو نے کہ سانچ کو کیا آنچ

پہ دل وہ تھپر کہ سر اُڑا دے جو نام لیجے کبھی وفا کا

(۲) معشوقوں کے بعد اُن عورتوں کا درجہ ہے جو گھرگرہست کہلاتی ہیں - اور حُسنِ خانہ داری سے عُمدہ بیویاں اور مائیں ہیں - اسی قسم کی عورتوں میں مجنوں کی ماں ہے جو اپنے بچّے کی پرورش میں پوری طرح شفقتِ مادری صرف کرتی ہے - اسی قسم کی عورتوں میں پاربتی کی ماں ہے جو اپنی لڑکی کے لیے ایک عمدہ بَر چاہتی ہے - مہادیو کے خاص اطوار سے بھیانک ہوتی ہے -

(۳) تیسری وہ عورتیں ہیں جو چکلوں میں رہتی ہیں - اُن کے مدارج ہیں بعض جوانیں ہیں بعض بوڑھیاں ہیں - بوڑھیوں کے ساتھ اس کو جوانوں سے زیادہ ہمدردی ہے -

(۴) چوتھی[۱] وہ عورتیں ہیں جو افلاس کے عالم میں باوجود شوق کے اپنا ارمان نہیں نکال سکتیں اور نہایت بے رونقی سے اُن کے گھر میں تقریبات ہوتی ہیں -

(۵) ہندوستان کی شریف عورتوں کو نظیر بہت کم پردے سے باہر نکالتا ہے -

(۶) ہندوؤں کی شریف عورتیں بھی ہولی کی تقریب سے آتی ہیں مگر زیادہ ترکنجنیاں ہیں - ہندوؤں کی شریف عورتیں نظیر کے کلام میں اُسی قدر زیادہ ہیں جس قدر کہ باعتبار حالتِ سوسائٹی اور قلّتِ پردہ کے وہ مسلمان عورتوں سے زیادہ باہر نکلتی ہیں -

---

[۱] پنہاری - بھٹیاری - لپنہاری -

نظیر کی کتاب الامثال

مثل تین حرفوں سے زیادہ نہیں مگر اسی میں دُنیا بھر کا فلسفہ بند ہے۔ لوگوں نے اس کی مختلف تعریفیں کی ہیں مگر میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی تعریف نہیں۔

فصاحت کا وہ خوش نما شرارہ جو مختلف تجربوں کی رگڑ سے پیدا ہوا ور جس سے مختلف واقعاتِ دنیا پر روشنی پڑے۔

مثل حقیقت میں تجربوں کی نوٹ بک ہے عقل نے فصاحت کی شرکت سے ایک خاص شارٹ ہینڈ ایجاد کیا ہے جس کے ذریعے سے ایک شخص کی عمر بھر کے تجربے چند لفظوں میں بند ہو جاتے ہیں۔ اس شارٹ ہینڈ میں نظیر کو بھی ید طولیٰ تھا۔ اور کیوں نہ ہو کہ تجربے ہر وقت ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے تھے اور اس فن کے دونوں موجد اس کے دن رات کے مُصاحب و جلیس تھے۔ ہزاروں مثلیں اس کو یاد تھیں اور دن میں سیکڑوں بار اُس کو اکثر موقع پر یاد آتی تھیں اور کبھی کبھی بے ساختہ اُس کی زبان سے نکل بھی جاتی تھیں۔ مثلیں یاد تھیں تو نظیر جیسے آدمی کا دماغ اُنھی پر قانع تو رہ سکتا نہ تھا۔ اُن کی خصوصیات پر غور کی اُن کی گہرائی کو ناپا۔ اُن کی فصاحت کے معیار قائم کیے اُن کے بننے بنانے کے اصول ٹھہرائے۔ پھر اخیر میں اپنی قوتِ اختراع سے اپنے خاص نقش و نگار کے ساتھ چند سانچے طیار کیے جن میں تجربے آسانی سے کھٹا کھٹ ڈھل سکیں۔ حافظے سے کُلّیات میں کتنی مثلیں آئی ہیں۔ پہلے ہم اُن کو گنوائیں گے پھر اس کے خاص کارخانے کی بنی ہوئی مثلوں کی بانگی دکھائیں گے۔

قدیم مثلوں کے نمونے۔

(۱) نیکی اور پوچھ پوچھ۔

کہا جب نظیر ہم نے یہی دل میں ہم تو رکھتے	تو کہا جو نیکی ہووے تو پھر اُس کا پوچھنا کیا

(۲) بھنگیاں در باغ بیر گٹھلی سب روا۔

اور نشی کی جھانجھ میں جو ہاتھ لگ جاوے سو کھا	بھنگیاں در باغ رفتہ بیر گٹھلی سب روا

(۳) چار دن کی چاندنی پھر اندھیرا پاکھ۔

اب تو مُنھ گُل ہی پیاری پھر دھتورا آکھ ہے	آج یہ گُلشن کِھلا ہے گل کو سو کھا ساکھ ہے
جو اُٹھا شعلہ بھبوکا آخرش کو راکھ ہے	چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیرا پاکھ ہے

مان لے کہنا مرا ای جان ہنس لے بول لے
حُسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

(۴) بھوکے بھجن نہ ہو۔

بُھوکے غریب دل کی خُدا سے لگن نہ ہو	سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو

(۵) حلوائی کی دکان دادا کی فاتحہ۔

اور مُفلسوں کی ہے یہ تمنا کی فاتحہ	دریا پہ جا کے دیتے ہیں بابا کی فاتحہ
بھٹیاری کے تنور پہ نانا کی فاتحہ	حلوائی کی دُکان پہ دادا کی فاتحہ

یاں تک تو اُن پہ لاتی ہے ناچاری شب برات

(۶) اجگر کے داتا رام۔

آگے تو گھر بگھر تھے اکثر تمام داتا
سیمرغ پالتے تھے کرنے کو نام داتا
اپنے تو کوئی ہرگز آیا نہ کام داتا
سچ ہی نظیر آخر اجگر کے رام داتا
سب بیچتے ہیں یارو چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو لوا اڑدے کا بچا

(۷) مکھی آن مدھ گری پنکھ رہے لپٹائے
ہاتھ ملے اور سر دُھنے کہ لالچ بری بلائے
یہ شہد برا ہی لالچ کا اس میٹھی کو مت کھا پیارے
یہ شہد نہیں ہے زہر نرا اس ہر اپر مت جا پیارے
جو مکھی اس میں آن پھنسی پھر پنکھ رہے لپٹا پیارے
سر ٹپکے روئے ہاتھ ملے ہے لالچ بری بلا پیارے
جب آسا نستا دور ہوئی اور آئی گت سنتو کھ بھری
سب چین ہوئے آنند ہوئے بم شنکر بولو ہری ہری

(۸) ای میری اُلٹی کے سننے والے مانگا نیچے دیا اوپر۔

رکھ بوجھ سر پہ نکلا اشتر ملا تو ایسا
گھیرا خراسیوں نے لشکر ملا تو ایسا
بڑھ گئے جو بال سر کے افسر ملا تو ایسا
مفلس کا زرد چہرا جو زر ملا تو ایسا
آنسو جو غم سے ٹپکا گوہر ملا تو ایسا

(۹) مُفلس کی جورو سب کی بھابھی —

چولھا تو انہ پانی کے مٹکے میں آبی ہے
پینے کو کچھ نہ کھانے کو اور نہ رکابی ہے
مُفلس کے ساتھ سب کے تئیں بے حجابی ہے
مُفلس کی جورو سچ ہے کہ ہاں سب کی بھابی ہے
عزت سب اس کے دل کی گنواتی ہے مُفلسی

(۱۰) آدھی اساڑھ دشمن کے گھر برسے

خورشید گرم ہو کر نکلا ہی اپنے گھر سے
آئی ہوا بھی لے کر بادل کو ہر نگر سے
لیتا ہی مول بادل کر کر تلاش زر سے
آدھے اساڑھ تو اب دشمن کے گھر بھی برسے

آیار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

(۱۱) موتوا قبل ان تموتوا

مرنے سے پہلے مر گئے جو عاشقانِ زار
کیا کاتبانِ اہل قلم خوش نویس کار
وہ زندۂ ابد ہوتے تا حشر برقرار
جتنی کتابیں دیکھتے ہو لاکھ یا ہزار

کوئی لکھ کے مر گیا کوئی لکھوا کے مر گیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مر گیا

(۱۲) چہ بر تخت مُردن چہ بر روی خاک

کوئی ٹھوٹی چاہتا تھا کوئی موڑھا اور مڑھ
کام آئی کچھ فقیری نہ کچھ تخت اور چھتر
جس دم قضا نے ہاتھ میں لی تیغ اور سپر
یہ خاک پہ موا وہ موا تخت کے اُپر

تھی جس کی جیسی قدر وہ بتلا کے مر گیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مر گیا

(۱۳) ای زر تو خدا نہ ولیکن بخدا
ستارِ عیوب و قاضی الحاجاتی

کتنے تو زر کو نقش طلسمات کہتے ہیں
اور کتنے زر کو کشف کرامات کہتے ہیں
کتنے خدا کی عین عنایات کہتے ہیں
کتنے اسی کو قاضی الحاجات کہتے ہیں

جو ہی سو ہو رہا ہی سدا مبتلا ئے زر
ہر اک یہی پکارتی ہی دن رات ہائے زر

(۱۴) زر بر سر فولاد نہی نرم شود۔

زر کے دیے سے پیر اور اُستاد نرم ہو
جو شوخ سنگ دل ہی پری زاد نرم ہو

زر کے سبب سے دشمن ناشاد نرم ہو
زر وہ ہی جس کو دیکھ کے فولاد نرم ہو

جو ہی سو ہو رہا ہی سدا مبتلائے زر
ہر اک یہی پکاری ہی دن رات ہائے زر

(۱۵) اللہ غنی وانتم الفقرا۔

عمدہ ہیں جتنے خلق ہیں کیا شاہ کیا وزیر
کیا گنج و ملک و مال مکاں تاج کیا سریر

اللہ ہی بس غنی ہی میاں اور ہیں سب فقیر
جو مانگنا ہی اُس سے ہی مانگو میاں نظیر

غیر از خدا کے کس میں ہی قدرت جو ہاتھ اُٹھائے
مقدور کیا کسی کا وہی دے وہی دلائے

(۱۶) جس کے ہاتھ ڈوئی اُس کا سب کوئی

دُنیا میں اب بدی نہ کہیں اور نکوئی ہی
کوئی کسی کا اور کسی کا نہ کوئی ہی

نا دشمنی و دوستی نا تند خوئی ہی
سب کوئی ہی اُسی کا کہ جس ہاتھ ڈوئی ہی

نوکر نفر غلام بناتی ہیں روٹیاں

(۱۷) جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

جو پار اُتارے اور دل کو اُس کی بھی بار اُترنی ہے شمشیر تبر بندوق سناں اور نشتر تیر ہرنی ہے	جو غرق کرے پھر اُس کو بھی یاں ڈبکوں ڈبکوں کرنی ہے یاں جیسی جیسی کرنی ہے پھر ویسی ویسی بھرنی ہے

(۱۸) پانڈے جی پچتائیں گے وہی چنے کی کھائیں گے

دل غریبوں کے جو بیارے تجھ سے اب دکھ پائیں گے بات کو ہنسنے کو دو دن جھڑکیاں ترسائیں گے	ایک دن تجھ کو بھی خوبان یوں ہی کلپائیں گے پانڈے جی پچتائیں گے وہی چنے کی کھائیں گے

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

(۱۹) رہے نام اللہ کا۔

اب نظیر آگے ترے رہتا ہے حاضر صبح و شام پھر کہاں یہ دلبری یہ عیش کی باتیں مدام	پیار سے ہنس بول پیارے پی مے الفت کا جام کچھ نہ رہوے گا رہیگا آخرش اللہ کا نام

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

(۲۰) خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے	جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

(۲۱) سخی کی ناؤ پہاڑ چڑھے۔

داتا کی مشکل کوئی اٹکی نہیں رہتی	چڑھتی ہے پہاڑوں کے اُپر ناؤ سخی کی

(۲۲) سانچ کو آنچ نہیں۔

نظیر یار سے کیوں درد دل نہیں کہتا	سُنا نہیں ہے وہ تو نے کہ سانچ کو کیا آنچ

(۲۳) دل کو دل سے راہ ہے

باتیں ہماری دل کی کہیں نظیر اس نے	ہے سچ تو یوں کہ دل کو ہوتی ہے راہ دل سے

(۲۴) باپ نے پدڑی نہ ماری بیٹا تیر انداز

آدم اک دمڑی کی حقیقا کو رہے عاجز سدا غور سے دیکھا تو اب یہ وہ مثل ہے اے نظیر	ہم کو کیا کیا پیچواں اور گڑگڑی پر ناز ہے باپ نے پدڑی نہ ماری بیٹا تیر انداز ہے

(۲۵) جوینده یابنده

ثمرباے رانہ مسرور دو استلذاذ گردانید و کثرت رائحہ لطف نہ چندان بخشید حلاوت وحوضت جویاے قربت بود بمعنے جوینده یابنده لذت دیگر فراہم نمود۔

(۲۶) خانہ احسان آباد

نظیر اکنوں نہ دارد غیر ازیں یاد	کہ باشد خانۂ الطاف آباد

(۲۷) وقت خزاں چو گل نبود خس غنیمت است

قائم ہے جسم کو کہ نہیں کس غنیمت است سو عیش ہم کو گر نہ ملے دنگ غنیمت است	جیتے تو ہیں اگر چہ نہیں بس غنیمت است وقتِ خزاں چو گل نبود خس غنیمت است

پیرے کہ دم زعشق زند بس غنیمت است
وز شاخ کہنہ میوۂ نورس غنیمت است

(۲۸) بیٹھے سے بیگار بھلی۔

آو پڑوسن ... کھیلیں بیٹھے سے بیگار بھلی۔

(۲۹)	گندم از گندم بروید جو ز جو جو اور کو پھل دیوے گا وہ بھی سدا پھل پاویگا	از مکافات عمل غافل مشو گیہوں سے گیہوں جو سے جو چانوں سے چانوں پاوے گا

(۳۰) ڈھاک کے تین پات

گر بخیلی نہ ہوے یا بخشش میں تیر پاک ہوے	یا نخل ہوے پرمیوں کے یا خالی پاتوں ڈھاک ہوے الخ

(۳۱) پانی پیجے چھان کر گرو کیجے جان کر

کھاتا جو کھاتو دیکھ کر پانی پیئے تو چھان کر	یاں پاؤں کو رکھ پھونک کر اور خوف سے گزران کر

آب یہاں سے خاص نظیر کی مثلیں لکھی جاتی ہیں۔ یہ بات تو بطور کلیے کے سمجھ لینی چاہیے کہ اُس کی ہر مقبول ناصحانہ نظم کی ٹیپ یقینی ضرب المثل ہے

(۱) سب ٹھاٹھ پڑا رہ جای گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۲)	کوڑی کے سب جہاں میں نقش و نگیں ہیں	کوڑی نہیں تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں
(۳)	سب چیز کو ہوتا ہی برا ہاے بڑھاپا	عاشق کو تو اللہ نہ دکھلاے بڑھاپا

(۴) پوری ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

(۵)	کل جگ نہیں کر جگ ہی یہ یاں دن کو دی اور رات لے
	کیا خوب سودا نقد ہی اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
(۶)	کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف اور عدل پرستی ہی
	اس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہی

(۷)	اپنا نہ مول کا نہ اجارے کا جھونپڑا		بابا یہ تن ہی دم کے گزاری کا جھونپڑا

(۸) عاشق ہی تو دل بہ کو ہر اک رنگ میں پہچان

(۹) ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا خوش وقت ہوئے اور چل نکلے

(۱۰) کام آتی ہی عاشق کے بہت رات اندھیری

(۱۱) اب بھی ہماری آگے یار رو جوان کیا ہی

(۱۲)	اک دم کو آ گئے ہیں مُنھ مت چھپا لے ہم سے		ٹک ہنس کے اوپری رو آنکھیں لڑا لے ہم سے
(۱۳)	جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہی سخن درست		اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست
(۱۴)	تن درستی کو پیٹ فضل الٰہی بوجھیے		آب وسی جگ میں رہنا بادشاہی بوجھیے

(۱۵) ہیں راگ اُنھی کے رنگ بھرے اور بھاو اُنھی کے سانچے ہیں

جو بے گت بے سُر تال ہوئے بن تال پکھاوج ناچے ہیں

(۱۶) کونڈی سونٹے کو بجا اور دیکھ ٹک قُدرت کے کھیل

چھوڑ سب کاموں کو غافل بھنگ پی اور ڈنڈ پیل

(۱۷)	پی عاشقوں میں آکر دو بھنگ کے پیالے		جو ایک دم میں تیرا گھر گھومے چھپر پالے

(۱۸) آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

(۱۹) عاشق کو دکھاتی ہی عجب ڈھنگ جوانی

(۲۰) گاہک ہی کچھ نہ لیوے تو دلاّل کیا کرے

(۲۱)	جھمکا نظر آتا ہی ہر اک عیش کی شی کا		دنیا میں عجب روپ جھلکتا ہی روپے کا

(۲۲) سب چھوڑو بات طوطی و پدڑی و لال کی — یارو کچھ اپنی فکر کرو آٹے دال کی

(۲۳) نقش یاں جس کے میاں ہاتھ لگا پیسے کا — اس نے طیار ہر اک ٹھاٹھ کیا پیسے کا

(۲۴) دیکھ لے دنیا کو غافل یہ تماشہ پھر کہاں

(۲۵) پڑھ پڑھ کے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے

جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

(۲۶) دنیا کے امیروں میں یاں کس کا رہا ڈنکا

(۲۷) پیسا ہی رنگ روپ ہے پیسا ہی مال ہے — پیسا نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

(۲۸) راضی ہیں ہم اُسی میں جس میں تری رضا ہے — یاں یوں بھی واہ واہ ہے اور ووں بھی واہ واہ ہے

(۲۹) جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

(۳۰) جب آئی اُس گڑھی میں نظیر اور ہزار من — اوپر سے آکے خاک پڑی تب خیر ہوئی

(۳۱) لے آئینے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ — صورت میں اپنی قدرتِ پروردگار دیکھ

(۳۲) گر ہے فقیر تو تو نہ رکھ یاں کسی سے میل — یاں تو نٹری نہ بیل پڑا اپنے سر سے کھیل نے

(۳۳) خدا کسی کو نہ دکھلائے غم جدائی کا

(۳۴) چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں — خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

(۳۵) دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو — گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

(۳۶) کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

(۳۷) جدھر کو دیکھو اُدھر اک نیا تماشا ہے — غرض میں کیا کہوں دُنیا بھی کیا تماشا ہے

نمبر	مصرعِ اول	مصرعِ ثانی
(۳۸)	حسن یہ دو دن کا ہی جہان ہنس لے بول لے	دن لے کہنا مرا ای جان ہنس لے بول لے
(۳۹)	نہ یہ چہلیں نہ یہ دھومیں نہ یہ چہچہے ہوں گے	میاں اک دن وہ آدی گا نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے
(۴۰)	تازگی جی کی اور تری تن کی	واہ کیا بات کورے برتن کی
(۴۱)	جب آئی اجل پھر کوئی ڈھونڈھا بھی نہ پایا	قصّوں میں رہی حرف و حکایات تو پھر کیا

(۴۲) دنیا میں بادشا ہی سو ہی وہ بھی آدمی

(۴۳) جتنے مزی ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

(۴۴) ایسے لڑی کہ خوب لڑے خوب ہی لڑے

(۴۵) رگ رگ میں جس سے چھٹ گئی عشرت کی پھلجھڑی

نمبر	مصرعِ اول	مصرعِ ثانی
(۴۶)	غیر از خدا کے کس میں ہی قدرت جو ہاتھ اُٹھای	مقدور کیا کسی کا وہی دی وہی دلای
(۴۷)	ہشیار یارِ جانی یہ دشت ہی ٹھگوں کا	یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا
(۴۸)	اس کی بغل میں گپتی تیغ اُس کے ہات میں ہی	وہ اس کی فکر میں ہی یہ اُس کی گھات میں ہی
(۴۹)	غُل شور ببولا آگ ہوا اور کیچڑ پانی مٹی ہی	ہم دیکھ چکے اس دنیا کو یہ دھوکے کی سی ٹٹی ہی
(۵۰)	جو خوشامد کری خلق اُس سے سدا راضی ہی	حق تو یہ ہی کہ خوشامد سے خدا راضی ہی
(۵۱)	سب جتنے جی کے جھگڑے ہیں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے	جب موت آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ہوئے

حدّ

(۵۲) دنیا کے بیچ یارو سب زیست کا مزا ہی

نمبر	مصرعِ اول	مصرعِ ثانی
(۵۳)	ڈرتی ہی روح یارو اور جی بھی کانپتا ہی	مرنے کا نام مت لو مرنا بُری بلا ہی
(۵۴)	سب خوبیاں بنی ہیں یہ آدم کے واسطے	اور دم بنا ہی آہ فقط غم کے واسطے

(۵۵) دنیا میں کون ہی جو نہیں مبتلاے زر

(۵۶) جو ہی سو ہو رہا ہی سدا مبتلاے زر — ہر اک یہی پکارِ ری ہی دن رات ہاے زر

(۵۷) اب آکے بڑھاپے نے کیے ایسے ادھورے — پر جھڑ گئے دُم اڑ گئی پھرتے ہیں لنڈورے

(۵۸) یہ رنڈی پرانی ہی نہ آاس کے توچھل میں — آج اس کے بغل میں ہی تو کل اس کے بغل میں

(۵۹) گیارہ تے ہین طلای علیہ السلام کے

نظیر کی نسبت لوگوں کی رائے

نظیر کی نسبت علی العموم لوگوں کی رائے خراب ہے یہاں تک کہ جس کسی سے میں نے ذکر کیا کہ میں نظیر کی
سوانح عمری لکھ رہا ہوں اس نے تبسم زیرلبی ضرور کیا۔ لیکن اس عام مخالفت رائے سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ
واقع میں نظیر اور اس کا کلام اسی کا مستحق بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض زمانے میں کسی خاص طرز کو خاص مقبولیت
حاصل ہو جاتی ہے کبھی یہ مقبولیت معقول اسباب پر مبنی ہوتی ہے اور کبھی فقط ملک اور قوم کا ایک خاص خیال اس
مقبولیت کا باعث ہوتا ہے جس کی کوئی بنیادِ معقول نہیں ہوتی۔ ہر چند اس قسم کی بے بنیاد مقبولیت چندے
جدت کی وجہ سے لوگوں کو فریفتہ رکھتی ہے لیکن بہت ہی جلد اس کا رنگ دلوں سے محو ہونے لگتا ہے اور آخر
مٹ مٹا کر فقط اسم کا نام رہ جاتا ہے۔ نظیر کے دورِ اخیر میں بدقسمتی سے ملک کے مذاق نے ناسخ کی غیر طبیعی
اور پر تصنع طرزِ شاعری کو پسند کرنا شروع کیا تھا۔ پبلک ان دنوں کوئی چیز نہ تھی۔ جو کچھ تھے اُمرا تھے
اُنھی کے ہاتھ میں مذاق کی باگ ہوتی تھی۔ وہ جس طرح چاہتے تھے اس کا رخ پھیر دیتے تھے۔ لکھنؤ میں شاعری
کی بُنیاد گویا سودا سے پڑی۔ وہ کوئی خودمختار شاعر نہ تھا کہ بالکل تقاضائے فطرت پر نظر کرتا۔ تعلق دربار سے
اُس کو اُمرا اور دولت مندوں کی مدحت کرنی پڑتی تھی۔ پھر اُمرا اور دولت مند کون جن کا نام یوں معمولی
طور پر بھی بے دس گز کے القاب کے لیا نہیں جاتا تھا۔ ایسی حالت میں سوا اس کے کیا چارہ تھا کہ بے انتہا الفاظی سے
کام لیا جاتا۔ سودا کے قصائد قصائد نہیں ہوتے بلکہ عمدہ لفظی رجمنٹیں ہیں جن میں چھنے اور چھنٹے ہوئے
سڈول گراں ڈیل جوان شوکت اور دبدبے کی وردیاں پہنے ہوئے موزونی کی پریٹ میں قواعد کر رہے ہیں

آگے تشبیب کا انگریزی باجا ہے اور پیچھے دعا کا نیشنل انتھم۔ ناسخ سودا کے بعد آیا۔ ہرچند اس نے
قصیدہ تو نہیں کہا مگر قصیدے کی لفاظی رائج ہو چکی تھی۔ اب وہ عاشقانہ ڈھنگ کے سیدھے سادے
پھیکے پھیکے اشعار دلوں کو کب مزہ دے سکتے تھے۔ ناچار اس کو غزل میں بھی قصیدے ہی کی طرز اختیار
کرنی پڑی۔ وہ بزم جس میں سچے عاشق دلی سوز و گداز کے ساتھ اصلی معشوقوں سے مصروف حرف
و حکایت تھے۔ وہاں رجمنٹ کے سپاہی گھس آئے۔ رنگ محل بارک ہو گیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں
ناسخ کی طرز نے ایسی مقبولیت حاصل کی کہ شرق سے غرب تک اس کا رواج ہو گیا۔ ہرچند دہلی کے
شعرا زیادہ تر میر کی طرز کے پسند کرنے والے تھے مگر رفتہ رفتہ ان کے مذاق میں بھی انقلاب آیا۔ شاہ
نصیر کے زمانے سے لفاظی کا وہاں بھی رواج ہوا۔ شیخ ابراہیم ذوق نے ناسخ کی طرز پر بیسیوں غزلیں لکھی
ہیں۔ اگر ایک خاص وجہ سے دہلی والوں کو اہلِ لکھنؤ سے قطعی نفرت نہ ہوتی تو میں جانتا ہوں لکھنؤ اور دہلی
کی شاعری میں کوئی تفرقہ باقی نہ رہتا۔ ذوق نے ابتدا میں گو ناسخ کا تتبع کیا مگر آخر اس کے مذاق سلیم نے
دکھایا کہ فقط لفاظیوں سے کام نہیں چل سکتا۔ اصلی دلی خیالات کسی قدر تصنع سے دور ہونے چاہئیں اور ان
الفاظ اور ترکیبوں میں ظاہر ہونے چاہییں جو بے تکلف ہوں۔ میرزا غالب اور مومن خاں نے گو اپنے
مذاق پر ناسخ کا خطِ نسخ تو نہ پھرنے دیا مگر پھر بھی ان دونوں حضرات پر متاخرین شعرائے فارسی کا مذاق
اس قدر غالب تھا کہ ان کو ہم بمشکل اردو کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ ایک کے اگر فقط خیالات فارسی ہیں تو دوسرے
کے الفاظ اور خیالات دونوں

موجودہ مذاق کسی نہ کسی نہج سے انھی شعرا کا پیدا کیا ہوا ہے۔ جنھوں نے باضابطہ قدیم روش پر تعلیم
شاعری پائی ہے وہ ضرور ان ہی ائمۂ فن میں سے کسی نہ کسی کے پیرو ہوں گے ان کا دماغ اس تعلیم کی وجہ سے

کسی طرح بے لاگ رائے قائم نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں نظیر کے اس گروہ میں مقبول ہونے کی کیا شکل۔ ایک صورت اُس کی مقبولیت کی تھی مگر اُس میں ایک خاص آفت پیش آگئی۔ یہ تو سب کو معلوم ہی کہ انقلاب سلطنت سے ہر قسم کے مذاق میں بھی بہت بڑا انقلاب آیا ہی۔ غدر سے اس انقلاب کی ابتدا ہی اور اب شاید انتہا کو پہنچ گیا ہی۔ مدرسے قدیم معلموں سے خالی ہو گئے۔ کالجوں میں پروفیسر آباد ہیں۔ مشاعروں کی شمع گل ہی۔ گل دستے مرجھا مرجھا کر رہ گئے۔ دیوان اولاً تو چھپتے نہیں۔ اور جو چھپتے ہیں داخل دفتر۔ قلم رو نظم نثر کے قبضے میں ہی۔ قافیوں کا قافیہ تنگ ہی۔ فوجِ ردیف بھاگی جاتی ہی۔ ناولوں کا دھاوا ہی۔ افسانے کُتب خانوں میں چھپتے پھرتے ہیں۔ شاعری اپنی حفاظت کے لیے فطری مورچے قائم کر رہی ہی۔ معانی کے رسالے الفاظ کے پیادوں کو کھندل رہے ہیں۔ انقلاب کا خاصہ ہی کہ عزیزوں کو قعرِ ذلت میں گرا دیتا ہی اور ذلیلوں کو بامِ عزت پر چڑھا لیتا ہی۔ اس قاعدے کے مطابق یہاں بھی بیسیوں عزیز ذلیل اور بیسیوں ذلیل عزیز ہوئے ہمیں اُمید تھی کہ جہاں اور ذلیل عزیز ہوئے ہیں وہاں ہمارا نظیر بھی ہو گا۔ حق یہ ہی کہ موجودہ مذاق کے مطابق اس سے بڑھ کر کسی شاعر کو مقبولِ عام ہونے کا استحقاق نہ تھا مگر بلا یہ آن کر پڑا کہ جن ناقدین کے ذریعے سے اُس کے اصلی جوہر روشن ہو سکتے تھے اُن کی آنکھوں پر اغراضِ ذاتی نے بلا کے پردے ڈال دیے۔ ہر چند پوری پوری کتابیں شاعری پر لکھیں مگر اس پر بھی اس کا کہیں ذکر نہ کیا اور جو کیا تو سرسری طور پر نہایت بے دلی کے ساتھ اصل میں ڈر اُن کو اس بات کا ہوا کہ اگر میں اس کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھوں گا تو جس مرتبے کا میں مدعی ہوں اُس کا وہ مستحق ثابت ہو جائے گا۔ میرا خیال یہ ہی کہ ہندوستان میں نیچرل شاعری جس کا اب بہت غل ہی اصل میں اُس کی بنیاد نظیر نے قائم کی ہی۔ باوجودے کہ اب لوگ خیالاتِ فرنگ سے مدد لے لے کر طبع آزمائی کر رہے ہیں پھر بھی بعض فطری نظمیں اُس کی ابھی تک لاجواب ہیں اور شاید اسو قت

تک لاجواب رہیں کہ کوئی اُسی رُتبے کا حقیقی شاعر مُلک میں پیدا ہو۔

جس عدم مقبولیت کا میں نے ابھی تک ذکر کیا ہی وہ خاص شُعرا اور اہل فن سے متعلق ہی ورنہ علی العموم باہمہ مخالفت بھی نظیر کی مقبولیت بدرجۂ غایت ہی۔ اِس کثرت سے شعراء ہند میں شاید کسی کا کلام نہیں پڑھا جاتا اور اِس کثرت سے کسی کا کلام مجالس و محافل میں بطورِ ضرب المثل مستعمل نہیں۔ یہی مقبولیت تھی جس نے اِس کا کُلیات چھپوایا اور یہی مقبولیت تھی جس نے اُس کو ہاتھوں ہاتھ بکوایا۔ کلیات کے چھپوانے کو کوئی ایشاگرد نہیں اُٹھا تھا نہ خاندان کے کسی صاحب نے اِس طرف توجہ کی تھی۔ باضابطہ دیوان اُس کا ابھی تک خاندان کے بعض تنگ خیال لوگوں کی خلوتِ خوش خیالی میں بند ہی۔ دیوان جو شاگردوں یا خاندان کے لوگوں کے اہتمام سے چھپتا ہی اُس میں دیباچہ ہوتا ہی۔ قطعاتِ تاریخی ہوتے ہیں۔ تقریظیں ہوتی ہیں۔ یہاں ان چیزوں کا تو ذکر کیا ترتیب بھی ٹھیک نہیں۔ عام مقبولیت سے عام طلب پیدا ہوئی اور تاجرانہ خیال نے طلب کا اندازہ کر کے جس طرح بنا چھاپ دیا۔

سلیقۂ جمع و تالیف چاہتا ہی کہ اِس پر بھی اُس کے لیے تقریظوں کا ایک مُعتد بہ مجموعہ فراہم کیا جائے جس سے ظاہر ہو کہ اصلی کمال اپنا صلہ بے لیے نہیں رہتا۔ اچھا لیجیے :۔

۱۔ محمد وزیر خاں مہتمم مطبع احمدی واقع چارسو دروازہ آگرہ کی رائے :۔

"کتاب لطف آب پسند ہر صغیر و کبیر کُلیّات نظیر"

۲۔ شیخ نورالدین بن جیوا خاں مہتمم مطبع صفدری واقع بمبئی کی رائے :۔

"(کتاب کی نسبت) کتاب لاجواب پسند خاطرِ ہر صغیر و کبیر یعنی منتخب نظیر (مصنّف کی نسبت) نتیجۂ طبع سر دفترِ شعرائے زمانِ خویش و مقتدائے رہ روانِ سلوک خیر اندیش جناب شیخ ولی محمد صاحب متخلص بہ نظیر۔

۳- سید تصدق حسین مصحح مطبع اودھ اخبار کی راے:-

"مصنف باکمال نے ہزاروں طرح کے پند و نصائح کو چٹکلوں اور مثالوں میں نظم فرمایا ہی خوابِ غفلت سے دُنیا کی میٹھی نیند سونے والوں کو کس کس حسنِ ادب سے جگایا ہی- حق تو یہ ہی کہ اگلے لوگوں کا کلام بھی عجب پُرتاثیر ہی کہ ہر زمانے اور ہر وقت میں اُس کا مدّاح ہر صغیر و کبیر ہی- یہی کلیات ہی کہ اگر چشمِ ظاہر سے اس کو دیکھو تو طرح طرح کی دل لگی کی باتوں اور مذاق کی حکایتوں سے مملو ہی اور اگر دیدۂ حق بیں سے بغور و تامّل ملاحظہ ہو تو سراسر دنیاے ناپائدار کی مذمتوں اور چرخ کج رفتار کی شکایتوں کا دریا گویا بہ سبو ہی"

۴- حکمت یار خاں ابن حافظ احمد خاں شاگرد جناب منشی نثار احمد بریلوی کی راے:-

"(کتاب کی نسبت) کتاب لاجواب سر دفتر شعراے زماں سرمشق قلوب عاشقان (مصنف کی نسبت) کہ جس کو سیاح دریاے فصاحت بیانی و غواص بحر فہم و معانی جناب شیخ ولی محمد اکبرآبادی متخلص بہ نظیر نے اپنی صاف طبع سے نکال کر رشتۂ بحور رنگا رنگ میں منسلک کر کے جوہریان و نقادان بازار معانی کو مستفیض کیا"

۵- حکیم میر قطب الدین باطن مولفِ گلستانِ بےخزاں کی راے:-

"(مصنف کی نسبت) پیر مغاں میکدۂ سخن- جرعہ کش راوقِ مضامین نو و کہن جناب سید ولی محمد نظیر- دُرۃ التاج شہنشاہ سخن دانی- گوہر یکتاے قلزمِ فیض رسانی- سر پیراے اقالیمِ سخن وری- اورنگ پیراے محافلِ شاعری- شمعِ شبستانِ مکرمت- چراغِ دودمانِ عزت- گلدستۂ گلستانِ عظمت- غنچۂ بہارِ ندرت- لعلِ معدنِ حلم و حیا- گوہرِ گنجِ اتقا- خورشیدِ آسمانِ وفا- ماہِ چرخِ صفا- بادہ نوشِ میخانۂ مضمونِ یک رنگی- رحیق پیماے مصطبۂ معنی دل نشینی- مخزنِ جود و احساں- معدنِ الطافِ بے پایاں حلیم الطبع- خلیق الوضع- مطلع انوار سواد

نظم۔ مقطع بیاضِ تجلیاتِ بزم۔ حریفِ محفلِ آشنائی۔ ظریفِ انجمن دانائی۔ خلاصۂ خاندانِ بسالت ۔ سلالۂ دودمانِ اصالت چرخِ ہمت۔ زمینِ حلم۔ دُور از جہل نزدیک بعلم۔ وحیدِ عصر یکتائے زماں۔ یکہ تازِ عرصۂ مضمونِ سخن سنجاں آشنائے غوامضِ نکتہ چینی۔ دانائے دقائقِ رنگینی۔ عالی فکر بلند ہمت رفیع مرتبت۔ بزرگ شوکت والا فطرت اوجِ فتوت۔ ہادی شعرالقب۔ صاحب قاعدۂ ادب۔ (شاعری کی نسبت) خیاطِ ازل نے قبائے مضامینِ نادران کی عقل کے جسم پر قطع کی۔ دبیرِ فلک نے بیاضِ سخن پردازی و مضمون طرازی ان کے نام بخشی۔ بلاغت میں سلمانِ ساوجی بسم اللہ خوانِ دبستاں۔ فصاحت میں سحبانِ وائل طفلِ مکتبِ ایشاں۔ اُن کے چمن فکر میں اس طرح کے گلہائے مضامین کھلے ہیں کہ اگر عین خزاں میں بلبلِ تصویر کو اُس باغ میں لے جائیے تو اُن پھولوں کی بو کا نفسِ عیسوی کرے۔ نغمہ سرائی عندلیب طبع کی اگر طوطیِ بے جاں سُنے تو ہزار جان سے نوا سنجِ توصیفِ و مدح ہو کر ان کا دم بھرے۔ جس شاخ پر ایک پھول گلستانِ سخن ان کے سے کھلا دیکھیں ہزارانِ شائق عنادل دار جان نثار کریں۔ گلشنِ جنت ایک برگِ خزاں رسیدہ چمنستانِ طبع۔ بہارِ خلد غنچۂ گلبنِ باغِ جنانِ طبع۔ شاعر اس کو کہتے ہیں کہ واقف ہو زمانے کے اُموراتِ نیک و بد سے۔ ہمہ داں شیریں بیاں ہو بڑھ کے حد سے۔ شعرگوئی کے دقائق سے خوب ماہر ہو۔ شاعری کے سب نکتوں کا فائدہ اُسے ظاہر ہو۔ شاعری کے علوں کا عالم ہو۔ ہر طرز میں مہارت کامل ہو۔ جیسے ہادیِ شُعرا۔ شاعرِ نامدار عالی مقدار جن کے کلماتِ شائستہ نے گوش فہم عالم کو عقل سماعت بخشی اور شہر شہر دیہہ دیہہ قصبہ قصبہ ہر کوچہ و برزن میں ہزاروں فرسخ بجز ذکر و اوصافِ نظم و نثر اُس جنت آرام گاہ کے کچھ بات نہ سُنی۔ ساقیِ خم خانۂ فیضِ طبع نے تشنۂ بادۂ شوقِ سخن کا لب تر کیا۔ پیرِ مغانِ طبع نے ہر ایک خشک کام گلو تر کردۂ راوقِ تمنائے سخن کا اپنے دور میں لبالب ساغر کیا۔ کلام نظیر شعرائے عصر کے لیے نظیر ہے۔ تقریر عاصی بے نظیر ہے۔"

۶۔ ابوالقاسم میر قدرۃ اللہ قادری صاحبِ تذکرہ کی رائے:۔

(مصنف کی نسبت) شیخ ولی محمد اکبرآبادی۔ شاعری ست دیرینہ مشق کہ بالفعل (۱۲۲۱ھ) دراں نواحِ علمِ اوستادی مے افرازد۔ ونردِ محبت واخلاص باہر کس مے بازد۔ بسیار سلیم الطّبع وخوش اختلاط ونہایت نیک طینت ومستحکم ارتباط شنیدہ مے شود۔ بہ معلّمی اوقات گزاری مے کند وبہ کشادہ پیشانی ایّامِ زندگی بسرمے برد۔"

۷۔ نواب مصطفٰے خانِ شیفتہ صاحبِ گلشنِ بے خار کی رائے:۔

"(شاعر کی نسبت) نظیر۔ خانہ درجوار روضۂ تاج گنج کہ بیرونِ شہر مذکور (اکبرآباد) ست دارد۔ گویند کہ نظیر در حلم وخلق وانکسار بے نظیر روزگار ست۔ کم مدّت ست کہ ازیں خاکداں بہ روضۂ رضواں رفت (شاعری کی نسبت) اشعار بسیار دارد کہ برزبانِ سوقیّیں جاری ست۔ ونظر بہ آں ابیات دراعدادِ شعرا نہ شاید شمرد۔ امّا بہ رعایتِ ابیاتِ منتخب قطعِ نظر کردہ شد۔"

۸۔ سعادت خانِ ناصر صاحبِ تذکرۂ خوشِ معرکہ کی رائے:۔

(مصنف کی نسبت) نظیر۔ وضع قلندرانہ۔ مرد آزاد۔ معاش اُس کی تعلیمِ صبیاں اور اُجرتِ صدائے فقیراں۔

۹۔ مولوی محمد حسین آزاد صاحبِ تذکرۂ آبِ حیات کی رائے:۔

"(اشعار کی نسبت) ہمارے تذکرہ نویسوں کا دستور ہی کہ جب شاعر کا حال لکھتے ہیں تو اُس کے اشعار انتخاب کر کے لکھتے ہیں اور یہ ظاہر ہی کہ فیضانِ سخن رایگاں نہیں جاتا۔ نظیر کے بعض شعر ایسے ہیں کہ میر سے پہلو مارتے ہیں پس اگر نظیر کا ذکر لکھ کر اُس کے چند شعر منتخب لکھ دیں تو ناواقف سوا اس کے کہ نظیر کو میر کا ہم پلہ شاعر

ھہ یہ تحریر ۱۲۴۸ھ اور ۱۲۵۰ھ کے درمیان کی ہی۔

سمجھے اور کیا تصور کر سکتا ہے۔"

۱۰۔ مولوی خواجہ الطاف حسین حالی کی رائے:۔

"آج کل یوروپ میں شاعر کے کمال کا اندازہ اس بات سے کیا جاتا ہے کہ اس نے اور شعرا سے کس قدر زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال کیے ہیں۔ اگر ہم بھی اسی کو معیارِ کمال قرار دیں تو بھی میر انیس کو اردو شعرا میں سب سے برتر ماننا پڑے گا۔ اگرچہ نظیر اکبر آبادی نے شاید میر انیس سے بھی زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مگر اس کی زبان کو اہلِ زبان کم مانتے ہیں۔ بخلاف میر انیس کے کہ اس کے ہر لفظ اور ہر محاورے کے آگے سب کو سر جھکانا پڑتا ہے۔"

۱۱ حکیم اصغر حسین فرخ آبادی کی رائے:۔

"جس زمانے میں وہ (نظیر) فرخ آباد آگئے تھے میرے والد سے اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں صغیر السن تھا۔ میں اُن کی زیارت سے بھی مشرف نہیں ہوا۔ مگر قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت موزوں اور چلبلی رکھتے تھے۔ مضامین اپنی فکر و استعداد کے موافق موزوں کیا کرتے تھے۔ جوانی کی ستایش۔ بڑھاپے کی مذمت خوب لکھی ہے۔ تلی نامہ۔ چوہے نامہ۔ گلہری نامہ۔ کوڑی نامہ وغیرہ وغیرہ انھی کے نتائج افکار سے ہے۔ بڑھاپے کے ترجیع بند میں مشہور شعر ہے ؎ سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا + عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا + ہر چند حضرت سلیم چشتی کے عُرس کی تعریف میں ترجیع بند لکھا ہے جس کا بند کا شعر ہے ؎ رشک ہے گلشنِ بہشتی کا + عُرس حضرت سلیم چشتی کا + مگر حضرت عباسؓ کے معجزے اور کربلا کے معجزے ایسے موزوں کیے ہیں

*آبِ حیات۔ ضمنِ حالاتِ ولی صفحہ ۹۵۔

*مقدمۂ دیوانِ حالی صفحہ ۱۸۲۔

جن سے مستفاد ہوتا ہے کہ استعدادِ علمی کامل نہ تھی اور اُمی طریقہ ہو تو تعجب نہیں۔ مگر انھوں نے ایک مسدس طویل جنم میں کنہیا کے لکھا ہے جس کا شعر یہ ہے ؎ یوں نیک پچھتر لیتے ہیں اس دنیا میں سب اوتار جنم ٭ پر آن کے اُودہی لچھن ہیں جب لیتے ہیں اوتار جنم ٭ ان کی تعریف میں ایک خمسہ لکھا ہے ؎ میں کیا کیا وصف کہوں یارو اُس شام برن اوتاری کے ٭ پیکشن کنہیا مُرلی دھر من موہن کنج بہاری کے ٭ اور سکیشن کی تعریف اور دُرگاجی کے درشن اور مہادیوجی کا بیاہ وغیرہ بہت کچھ نظم کیا ہے جو آزادیٔ قیدِ مذہب کی خبر دیتا ہے۔"٭٭

۱۲۔ منشی سید احمد دہلوی صاحبِ فرہنگِ آصفیہ کی رائے:۔

"بعض دہلی کے تذکرۂ شعرا جمع کرنے والوں نے صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ ایک مُلّا، مکتبی، صحتِ الفاظ سے مُعرّا، پُرگو۔ اور عوام الناس کی بلکہ جُہلا کی زبان لکھنے والا تھا۔ لیکن میری رائے میں وہ ہندوستان کا شیکسپیر اور فطرتی اور قُدرتی مضامین کے بیان میں یدطولیٰ رکھنے والا تھا۔ اُس نے ادنیٰ اور رکیک رکیک مضمونوں کو اس خوبی سے باندھا اور عمدہ نتیجہ نکالا ہے کہ دوسرا نہیں نکال سکتا۔"

۱۳۔ مولوی نذیر احمد کی رائے:۔

میں نے اپنے دوست مولوی بشیر الدین احمد سے پوچھا کہ آپ کے والد نظیر کے کلام کی نسبت کس قسم کی رائے رکھتے ہیں تو اُنھوں نے فرمایا کبھی ذکر آیا ہے تو والد نے نظیر کی نسبت عُمدہ خیالات ظاہر کیے ہیں۔ سب سے پہلی رائے اُن کی توبۃ النصوح میں درج ہے۔ اُس کتاب میں کلیم کے کتب خانے کے ذیل میں اُنھوں نے نظیر کے کُلیات کا ذکر کیا ہے اور مناسبِ مقام اپنی غرض کے لیے (چھوں کے اچار) کا بڑے موقع سے استعمال فرمایا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس بحث میں نظیر کو کوئی عمدہ جگہ نہیں ملی۔

٭٭ منتخب از مراسلہ مورخہ ۱۹ جولائی ۱۹۱۰ء۔

لیکن اس میں کچھ نظیر ہی منفرد نہیں- وہاں تو اِس سرے سے اُس سرے تک تمام شعرا کا صفایا بول دیا گیا ہے-
اور تو اور اِس قتلِ عام میں حضرت سعدی تک نہیں بچے- حال آں کہ ابھی سعدی کے باب میں کچھ برسوں بعد
حضرت نے اپنی موعظۂ حسنہ میں کس قدر بلند رائے ظاہر کی ہے- حقیقت یہ ہے کہ جو رائے توبۃ النصوح میں ظاہر
کی گئی ہے وہ اُن کی واقعی رائے نہیں ہے بلکہ ایک رائے ہے جو انھوں نے گویا کسی تعلیم کی کتابیں منتخب کرنے والی
کمیٹی کی خاطر سے لکھ دی ہے- اصلی رائے اُنکی یہی ہے کہ باعتبارِ شاعری نظیر کو وہ ایک عمدہ شاعر اور مُستند
اُستاد تسلیم کرتے ہیں- کلیم کے کتب خانے کا حال لکھا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس کے شوق کے پردے
میں خود اپنا مذاقِ شاعرانہ ظاہر کر رہے ہیں- کتاب فروش نظیر کا دیوان جس پہ ہُدہُد کے اشعار بھی چڑھے ہوئے
ہیں کلیم کے پاس نہیں لاتا بلکہ لاکر خود مولنا نذیر احمد صاحب کے شوق کی لائبریری میں داخل کرتا ہے- جہاں تک
میں جانتا ہوں نظیر کا کلیات ہُدہُد کے اشعار کے ساتھ نہیں چھپا- دہلی کے مشاعروں کی یادداشت نے
ہُدہُد کے اشعار یاد دلائے اور راز بس کہ نظیر بھی مذاقِ خوش طبعانہ و شوخ رکھتا ہے تلاحقِ افکار کے طلسم سے
دونوں شاعروں کا کلام ایک مجموعے میں چھپ کر جلوہ گر اور پیشِ نظر ہوا- شواہد اِس بات کے بکثرت ہیں کہ
نظیر کا کلام مدتوں مولنا کے پیشِ نظر رہا ہے اور بہت دور تک اُس نے پسندیدگی کا شرف بھی حاصل کیا ہے
کیوں کہ اکثر اشعار اُس کے اُن کی تصانیف میں پائے جاتے ہیں چنانچہ حال میں قرآن شریف کا جو ترجمہ
مولنا نے شائع کیا ہے اُس میں بھی اللہ یستہزئ بہم ویمدہم فی طغیانہم کے فائدے کے ضمن میں نظیر کے یہ ضرب
المثل اشعار موجود ہیں:-

نیکی کا بدلہ نیک ہے بد کر بدی کو سات لے	کانٹے لگا کانٹے پھلیں پھل پات بو پھل پات لے
کل جگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے	کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اُس ہات لے

اِس سے بڑھ کر ایک شاعر کے لیے اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہی کہ اُس کا شعر ترجمۂ قرآن جیسی مقدس چیز میں ایک اہم قاعدہ بلاغت کے اثبات میں نقل ہو۱۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے اجلاس میں جو تقریر مولٰنا نے کی اُس میں نظیر کے ایک شعر کو نہایت لطف سے پڑھا اور اُس کی طرف لوگوں کی توجہ کو کسی قدر غیر معمولی طور پر منعطف کیا۔ جس عبارت میں نظیر کا ذکر کیا ہی یہ ہی:—

"وہ تمھارے آگرے میں ایک صاحب من وجہ بندے کے ہم نام ہو گزرے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی۔ من وجہ میں نے اس لیے کہا کہ نظیر اُن کا تخلص تھا۔ اور میرا نام ہی۔ اُن کا تخلص ظ سے تھا۔ میرا نام ذ سے ہی۔ ایک صلاح وہ بھی بتا گئے ہیں۔ نہیں معلوم ہنسی ہی یا واقعی۔ دیکھو شاید وہی مفید ہو۔ اُن کی تو یہ صلاح ہی۔

کونڈی سُتکے کو بجا اور دیکھ ٹک قُدرت کے کھیل | چھوڑ سب کاموں کو غافل بھنگ پی اور ڈنڈ پیل"

چوں کہ مولٰنا کا مزاج بالطبع شوخ اور ظریفانہ واقع ہوا ہی یہ امر طبیعی ہی کہ اُن کو نظیر کے کلام سے خاص اُلفت اور اُس کے اشعار کی طرف خاص رغبت ہو۔ مولٰنا ناولسٹ ہیں۔ ناولسٹ ہر شخص کے اندرونی خیالات کا تماشائی اور خصوصیاتِ اخلاق کا نباض ہوتا ہی۔ نظیر گو ناولسٹ نہیں مگر اُس کی زبان اور اُس کی قوتِ مشاہدہ اور تجربے بہت سے معمولی درجے کے ناولسٹوں کے لیے موجبِ رشک ہو سکتے ہیں۔ پس اِس اعتبار سے بھی مولٰنا نذیر احمد اور نظیر باہم مُشارکت رکھتے ہیں۔ عجب نہیں کہ مُشارکتِ اسمی کے بیان کرتے وقت کسی قدر مولٰنا کا خیال اِس مُشارکت خیالی کی طرف بھی گیا ہو۔ لیکن کانفرنس میں اُس کے اظہار کا کیا موقع تھا۔

میری رائے نظیر کی نسبت یہ ہی کہ اُردو کا سعدی ہی لیکن وہ نظم میں اور مولٰنا نذیر احمد نثر میں۔ سعدی نظیر

۱؎ ترجمۂ قرآن صفحہ ۵۔

نذیر احمد حسن اتفاق یہ کہ دونوں جس طرح نصائح میں مشارک ہیں اسی طرح ظرافت میں بھی۔ میرے ایک عزیز نے کہا کہ شاید سعدی کا کوئی بنایا ہوا قلم کہیں پڑا تھا وہ مولوی نذیر احمد کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ پہلے نظیر اکبرآبادی کو ملا اور بعد ازاں مولنا کو۔ نظیر نے بوستاں کی خوش بو سے اردو کے دماغ کو معطر کیا۔ مولنا نے گلستاں کے عمدہ پھولوں کا عطر کھینچ کر نادلوں کے ولایتی شیشوں میں بھرا۔ جب یہاں تک ہم رنگی ہو تو پھر نظیر کی تعریف مولنا کی زبان سے ایک نتیجۂ طبیعی ہے۔

کوئی صاحب سر ولیم میور بہادر کے زمانے میں اردو کے شعرا کے کلام سے نصیحت خیز اشعار چھانٹنے لگے سودا۔ میر۔ آتش۔ ناسخ۔ ظفر۔ ذوق۔ درد۔ وغیرہ اساتذہ کے ہاں بھی اس قسم کے اشعار اُن کو بہت کم ہاتھ آئے۔ اخیر ہار کر نظیر ہی کے ذخیرے پہ جھکے۔ غور کر کے دیکھیے تو وہ انتخاب گویا نصف سے زیادہ کلام نظیر سے عبارت ہے۔ نام اس مجموعے کا اچھا رکھا ہے (بلبلوں کے نغمے)۔

مولوی علی حیدر نظم فرماتے تھے کہ مولوی سید حسین بلگرامی نے بھی اپنی کتاب مختار اشعار میں نظیر کی بہت سی نظمیں درج کی ہیں۔ مختار اشعار پہ کیا موقوف ہے کوئی تعلیمی مجموعہ میری نظر سے ایسا نہ گزرا جس میں نظیر کے اشعار بکثرت نہ ہوں۔

مولوی بشیر الدین احمد نے ایک دفعہ مجھ سے فرمایا تھا کہ جتنی کتابیں سر ولیم میور بہادر کے زمانے میں تصنیف ہوئیں کُل والد کے ہاں رائے کو آتی تھیں اور ہر ایک کتاب پہ والد نے ایک مختصر رائے لیکن برجستہ اور مناسبِ حال رائے ظاہر کی تھی۔ یقین ہے اُن کتابوں کے جنگل میں یہ (بلبلوں کے نغمے) بھی ہوں گے اور رہوں گے تو مولنا نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ اُردو کے نصائح آمیز کلام میں نظیر کے بے نظیر کلام کا کیا پایہ ہے۔

۱۴۔ مولوی سید محمود آزاد کی رائے :۔

"ایک بزرگ حکیم نبی بخش میر غلام پیر مرحوم کے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔ نظیر کا کلام ان کی زبان پہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ بات بات پر اُس کی تعریف کرتے اور کہتے مجھے تو اُس کے سوا کسی کے کلام میں مزہ ہی نہیں آتا میں تو جب دیکھتا ہوں اُسی کا کلام دیکھتا ہوں۔ میں ان کی باتیں سُنتا اور ہنستا کہ مردِ خدا کس قدر بدمذاق ہے۔ اُن دنوں ناسخ کے کلام کا مزہ دل میں سمایا ہوا تھا۔ نظیر نگاہ میں جچتا ہی نہ تھا۔ دل میں کہتا حکیم صاحب کو چونکہ استعداد نہیں ہے اس لیے ایک بد استعداد شاعر کی اس قدر تعریفیں کرتے ہیں۔ لیکن اب حکیم نبی بخش کی باتیں یاد آتی ہیں۔ واقع میں اُن کی رائے مذاقِ سلیم کا نتیجہ تھی نہ نتیجۂ بد استعدادی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو میرے خیال میں نظیر کسی طرح میر وغیرہ اساتذۂ قدیم سے کم نہیں۔ کلیاتِ نظیر میں نے حکیم صاحب ہی کے تقاضوں سے منگوایا تھا"

۱۵۔ مولوی شبلی نعمانی کی رائے :۔

جن دنوں شبلی نعمانی حیدرآباد میں وارد تھے عزیز میرزا اُن کی ملاقات کو گئے۔ عزیز میرزا ہی کی فرمائش سے میں نے نظیر کی سوانح عُمری کے مسوّدات وطن سے منگوائے تھے اور اُنھی کے تقاضوں سے درپئے تکمیل تھا۔ تازہ مضمون تھا۔ اُنھوں نے اثنائے گفتگو میں اسی کا ذکر چھیڑا۔ اس طرح کہ ہنس کر اُن سے فرمایش کی کہ مضایقہ نہ ہو تو نظیر کی سوانح عُمری بھی لکھیے۔ شاعر تو اچھا تھا۔ شبلی اس فرمایش سے سخت متحیّر ہوئے اور استعجاب کے ساتھ کہا نظیر کی اور سوانح عُمری۔ اس کے بعد جب مجھ سے ملاقات ہوئی تو میں نے عزیز میرزا کی فرمایش اور اُن کے استعجاب کی طرف ایک خفیف شکایت آمیز اشارہ کیا۔ تو شبلی نے کہا نہیں میرا استعجاب اور خیال سے تھا۔ جب معلوم ہوا کہ آپ اس کے حالات لکھ رہے ہیں سمجھ گیا کہ آپ کی نظر کن باتوں پر ہے۔ پھر اچھا

کہ سید احمد خاں کے ہم عمروں اور معاصرین میں ڈپٹی تراب علی ایک بزرگ آگرے کے ہیں۔ نظیر کے حالات اُن سے سُنتے تو بہت ہیں مگر چوں کہ ادھر خیال نہ تھا اس سے تفصیل کے ساتھ یاد نہیں۔ اگر آپ کچھ سوالات لکھ کر دیں تو ممکن ہے کہ اُن سے پوچھ کر جتنے حالات اُن کو معلوم ہیں لکھ بھیجوں۔ ہر چند شبلی نے خود تو حالات لکھ کر نہیں بھیجے مگر دیوانہ راہوے بس ست۔ میں ڈپٹی تراب علی کے سر ہو گیا۔ اور جس طرح بن پڑا اُن سے حالات منگوا کر رہا۔ اس معاملے میں میر اکبر حسین سب جج آگرہ اور میرزا محمّد علی بیگ وکیل خاص شکریے کے مستحق ہیں۔

۱۶۔ شمس العلما مولوی سیّد علی بلگرامی کی رائے:۔

ان سے سوانح عمری نظیر کا ذکر آیا تو یہ متعجب نہیں ہوے بلکہ بہ کُشادہ پیشانی تمام اُس کے شاعرانہ کمالات اور خوبی کلام کا اقرار کیا بلکہ اُس کو ریلسٹک پوئٹ کا خطاب دیا اور اِس امر کے ثبوت میں کہ وہ اُس کے کلام کو کسی زمانے میں دل سے پسند کرتے تھے فی الوقت نظیر کے یہ اشعار پڑھنے لگے:۔

تنِ مُردہ کو کیا تکلّف سے رکھنا	گیا وہ تو جس سے مُزیّن یہ تن تھا
کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جنکا	مشیّن بدن تھا مُعطّر کفن تھا
جو قبرِ کہن اُن کی اُکھڑی تو دیکھا	نہ عضوِ بدن تھا نہ تارِ کفن تھا
نظیر آگے ہم کو ہوس تھی کفن کی	جو دیکھا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

پھر بعض فرنچ تصنیفات کا حوالہ دیا اور کہا میں آپ کے لیے نظیر کے حالات ڈھونڈھ کر اُن میں سے نکالونگا ڈھونڈا تو اُنھوں نے سہی مگر بدقسمتی سے وہ جلدیں کتب خانے سے غائب تھیں جن میں نظیر کے حالات مندرج تھے۔ مولوی سید علی بلگرامی نے نظیر کے حالات سُننے کو ایک روز خاص کر مجھ کو بُلوایا پھر جو کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھے تو آدھی رات تک برابر سُنتے ہی رہے۔ اِس صحبت میں میرزا حیرت بھی شریک تھے۔ جنھوں نے نظیر کے

لیے ایک نیا خطاب مرہٹی گو کا تجویز کیا۔ افسوس اس خطاب پر وجد کرنے والا اُس وقت وہاں کوئی موجود نہ تھا مولوی سید علی نے اُسی صحبت میں وعدہ فرمایا تھا کہ سوانح عمری کو سلسلۂ آصفیہ میں لے لونگا مگر سلسلہ خدمت کے متزلزل ہو جانے سے چوں کہ پوری سلسلہ جنبانی نہ ہو سکی لہٰذا وہ وعدہ وعدہ ہی رہا۔ وفا نہ ہوا۔

۱۷۔ ڈاکٹر فیلن کی رائے:۔

"تحریری علم ادب میں سب سے زیادہ نظیر کے کلام سے انتخاب کیا گیا ہے صرف یہی ایک شاعر ہے جس کی شاعری اہلِ فرنگ کے نصاب کے مطابق سچّی شاعری ہے مگر ہندوستان کی لفظ پرستی اُس کو سرے سے شاعر ہی تسلیم نہیں کرتی۔ صرف نظیر ہی ایسا شاعر ہے جس کے اشعار نے عام لوگوں کے دلوں میں راہ کی ہے۔ اُس کے اشعار ہر سڑک اور گلی میں پڑھے اور گائے جاتے ہیں خصوصاً اُس کے خاص شہر آگرہ میں اور واعظین (یا پادری) جو کہ اُس کی نظموں سے بہت اچھی طرح آشنا ہیں اُس کے اور کبیر کے اقوال کا شارعِ عام پر وعظ کہتے وقت نہایت نمایاں تاثیر کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ نظیر میں تمام وہ صفتیں دل اور دماغ کی جمع تھیں جو فطری ذکاوت کو امتیاز بخشتی ہیں۔ اُس کی نظمیں آپ اُس کی سوانح عُمری ہیں کیوں کہ قالبِ نظم میں یہ شخص اپنی تمام ذاتی خصوصیتوں کے ساتھ جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ اَور سامان نہ سہی۔ فقط اُنھی نظموں سے اُس کی تصویر کے بعض خط و خال نُمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔۔ وہ حقیقت میں آزاد بینوا تھا اور یہی وہ اپنے تئیں بتاتا بھی تھا۔ وہ اصل میں دُنیا سے بے تعلق صوفی تھا جس کا اَوروں کو صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ وہ تقدیر کی نہ مُوافقت کی پروا کرتا تھا نہ مخالفت کی۔ وہ کچھ چاہتا ہی نہ تھا۔ وہ نہ کسی مرد کی پروا کرتا تھا نہ کسی عورت کی۔ عورتوں سے اگر مطلب تھا تو صرف اتنا کہ دور سے اُن کے حُسنِ صورت پر غش ہو لے۔ نہ اقبال سے وہ پھولتا تھا نہ ادبار سے ملول ہوتا تھا جیسا کہ اُس نے خود کہا ہے وہ اپنی کھال میں مست تھا۔ اُس نے کبھی اپنی کسی تحریر کے حفاظت سے رکھنے کا خیال نہ کیا۔ اُس کی نسبت

لوگ روایت کرتے ہیں کہ اُس کا معمول یہ تھا کہ نظم لکھی اور لکھ کر پھینک دی۔ شاگرد یا دوست جن کے لیے وہ نظم لکھی اُٹھا کر لے گئے۔ نہایت وسیع معنوں میں وہ اعلیٰ درجے کا آزاد، اعلیٰ درجے کا موجد، اعلیٰ درجے کا حکیم، اور اعلیٰ درجے کا حکمت دوست تھا۔ اس کی ذکاوت کی رنگا رنگی اُن مضامین رنگا رنگ سے ظاہر ہوتی ہے جن پر اُس نے طبع آزمائی کی ہے۔ جس قسم کے شاعرانہ خیالات اُس نے اُن معمولی چیزوں سے پیدا کیے ہیں جن پر اَور ہندوستانی شاعروں نے لکھنا یا تو کسرِ شان سمجھا یا اُن کو لکھنے کی قابلیت ہی نہ تھی اُنھی کو ہندوستانی محققین ناواقفیت سے اس بات کا نہایت یقینی ثبوت خیال کرتے ہیں کہ وہ کوئی شاعر نہ تھا۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ "اُس نے اس قسم کی مبتذل چیزوں پر لکھا ہے۔ آٹا۔ دال۔ مکھی۔ مچھر"۔ اُس کی طبیعت کی رنگا رنگی اور اُس کی تخیل کی قوت علاوہ بریں اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اُس نے ایک ہی چیز کی مختلف نظموں میں مختلف پہلو سے مختلف تصویریں دکھائی ہیں۔ اُس کا دیوان خاصا تصویروں کا ایوان ہے جس میں ہندوستان کے رہنے والوں کے کھیل تماشے عیش تفریح۔ رنج۔ غم۔ دل دماغ سب کی بولتی چالتی تصویریں نظر آسکتی ہیں۔

"نظیر طبیعت (فطرت) اور ہر قسم کی انسانیت کے ساتھ ایک گہری ہمدردی رکھتا تھا وہ ہر چیز میں خوبی پاتا تھا۔ وہ خوش ہے جب گروہ کا گروہ خوش ہے وہ اُن کے کھیل تماشوں سے مزہ لیتا ہے۔ وہ اُن کی مصیبتوں سے دُکھ پاتا ہے صرف یہی ایک شاعر ہے جس نے لڑکوں کے پیار اور محبت کو لکھا ہے اور صرف یہی ایک شاعر ہے جس کو غریبوں مفلسوں بےکسوں مصیبت زدوں اور سب کس مپرسِ خدا کی مخلوق کے ساتھ جوش ہمدردی ہے جیسا کہ اُس نے اس مضمون کو نہایت عمدہ طور سے اپنی اُس عمدہ نظم کے مقطع میں ظاہر کیا ہے جو اُس نے آدمی نامے کے نام سے انسان پر لکھی ہے:-

	اچھے بھی آدمی ہی کہاتے ہیں، اے نظیر		اور سب میں جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

پاک عشق کی تصویر جو اُس نے کھینچی ہے۔ وہ اُسی کا حصہ ہے اور اسی لیے اُس نے کھینچی بھی خاصی ہے۔
اُس کے کلام کا سب سے عمدہ حصہ کسی مطبوعہ مجموعے میں نہیں ہے جو اُس کے نام سے چھپا ہے۔ اُس کا اس قسم کا
کلام صرف رمتے ہوئے فقیروں (آزادوں) اور ناخواندہ اشخاص کی زبانی سُنا جاتا ہے جو کہ اپنے سینوں میں
اُس انسانی فطرت کا کچھ بہتر احساس رکھتے ہیں جس کے نقش و نگار نظیر نے اس خوبی سے دکھائے ہیں۔ یہ ناخواندہ
اشخاص اپنی پسند کی نظمیں زبانی رکھتے ہیں بخلاف اس کے پڑھے لکھے حضرات اپنی پسند کے شعرا کا کلام زبانی
نہیں رکھتے۔ اور ان کی ایک بہت بڑی جماعت ان مقبول نظموں کو رغبت سے سُنتی اور متلذذ ہوتی ہے اور اس لذت
اُٹھانے میں اپنا وقت کہیں زیادہ صرف کرتی ہے بہ نسبت اس کے کہ پڑھے لکھے اشخاص کہیں کہیں اپنے اُن
غیر اصلی اور الفاظ شعرا پر صرف کرتے ہوں جن کے مداح ہونے کا وہ دم بھرتے ہیں۔ اور پھر ناخواندہ اشخاص کی
خوشی زیادہ گہری بھی ہے اس لیے کہ اُن کا سلیقۂ فطری زیادہ سچا ہے اور اُن کی رغبت کی شے زیادہ قابل مدحت
"اُس کے دل و دماغ کی صفائی اور اُس کی تحریر کی لطافت اس درجے کی ہے کہ جب وہ کوئی فحش خیال
بھی پیدا کرتا ہے (جب کہ یہ بات اُس تصویر کی صحتِ خط و خال اور تکمیل کے لیے ضروری ہوتی ہے) تو فحش پر اس
لطافت کے ساتھ پردہ ڈال دیتا ہے کہ وہ ہمیشہ خود ہندوستانیوں کو بھی صاف نظر نہیں آتا جو اس کثرت کے
ساتھ ذو معنی الفاظ اور ضلع جگت کا استعمال کرتے ہیں۔ جب کہ وہ کسی پاک جذبۂ دل کی اعلیٰ خوبیاں تعرف الاشیاء
بالاضداد کے اُصول پہ بیان کرنے کو ہوتا ہے تو شہوانی خیال کو دماغ میں دیر تک رہنے اور اُس پاکیزہ
خیال کے محو کرنے کی اجازت نہیں ہوتی جس کو نظیر بابرام پڑھنے والے کے پیش نظر رکھتا ہے۔
"بعض مضامین شدت سے فحش ہیں مگر شوخی جو سچی اور جان دار نقاشی کے لیے ایک جزو ضروری ہے اس
طرح اُس کے کلام میں ملی ہوئی ہوتی ہے کہ فحش بالکل نظر نہیں آتا۔ سر سے پا تک ظرافت اور لطافت چھائی ہے

اور بڑی دل موہ رہی ہے۔

"نظیر نے مادری زبان کے خزانوں پر اپنا سکّہ بٹھا دیا ہے۔ اس نے اس خصوص میں وہ کام کیا ہے جو صرف سلاطین (اقلیم سخن) مثلاً چوسر و شیکسپیر کر سکے ہیں۔ اس نے ہندی الفاظ کو تمام اُن خوش نما ترکیبوں میں ظاہر کیا ہے جن میں وہ ظاہر ہو سکتے تھے اور اپنی ذات پر جو ان مردانہ اعتماد کر کے جو ذکاوت کا خاصّہ ہے اُس نے لفظوں کی نئی ترکیبوں اور نئے معنوں میں استعمال کرنے کی جرأت کی ہے اور یہ ترکیبیں اور معنی ہمیشہ خوش آیند ہیں۔

"جو کچھ نظیر نے لکھا ہے اُس میں مشکل سے کوئی معمولی مصرعہ ہوگا اور جو کچھ اُس نے لکھا ہے اس کا ایک بہت بڑا حصّہ بجائے خود ایک مشاہدہ ہے۔ اس کے خیال کی گہرائی اور اس کی اُن نادر ترکیبوں کی قوّت جن میں کہ ہر لفظ اظہارِ معنی میں دوسرے کا مُعاون ہے جس قدر غور کیجیے اُسی قدر ظاہر ہوتی ہے۔ علم والے ہندوستانی اُدَبا جن کی کوششِ صرف الفاظ کے پیچھے صرف ہے وہ رسائیِ خیالات میں اس قدر کوتاہ ہیں کہ اکثر نظیر کی وسعت و خوبیِ معنی کے سمجھنے سے بھی قاصر رہتے ہیں اور وہ اُس کی ترکیبوں کی خصوصیتِ مناسبت کو بھی نہیں سمجھتے جو وہ ترکیبیں اُن تمام معانی کے ساتھ رکھتی ہیں جو اُن سے نکلتے ہیں۔ اور یہی وہ شاعر ہے جس سے قریب قریب تمام یوروپین ناظرین بالکل ناواقف ہیں اس لیے کہ ہندوستانی اُدَبا و شعرا اُس کا نام لینا بھی کبھی پسند نہیں کرتے۔

"علم والا گروہ جو کہ نظیر کی قدر دانی کی صلاحیت نہیں رکھتا اُس کی پرستش کی چیز ناسخ ہے۔ ناسخ جس کی تشبیہیں نہایت صناعی کے ساتھ مختلف اور صداقت سے بہت زیادہ دور ہیں اور جس کی زبان عربی اور فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کا ایک خاصا میلا ہے جس میں کسی معمولی ہندی لفظ یا حرف کو صرف اُسی صورت میں شریک کیا گیا ہے جب کہ اُس کی شرکت سے گریز نہیں رہا۔"*

* ماخوذ از دیباچہ لغات ہندوستانی و انگریزی مصنفہ ڈاکٹر فیلن صفحہ ۸ تا ۱۰۔